جیسے دریا

(افسانے)



واجدہ تبسم

جیسے دریا

واجدہ تبسم

سلسلہ مطبوعات نمبر ۸   بار اوّل   نومبر سنہ ۱۹۸۰ء

قیمت [redacted] روپے

تعداد اشاعت .... ایک ہزار

ناشر :- .... ٹیپو سلطان

طابع .... سراج الدولہ

اوورسیز بک سنٹر

پلاٹ نمبر ۵۴ ا- نارتھ لنکن روڈ- جوہو

ولے پارلے اسکیم بمبئی نمبر ۵۶

مصنفہ کا پتہ

ریلوے بلاک ۱۳۱ - فلیٹ ۱۰ سنتا کروز (ویسٹ)

بمبئی نمبر ۵۴

اپنے

بیٹے

غازی

کے

نام

فہرست



صندوقچی

اُبٹن اور چکسہ مَل مَل کر سہیلیوں نے مجھے گا گا کر نہلایا۔ میرے لمبے لمبے بالوں میں عُود اور سچے اگربتی کی دھونی دے کر انھیں خوشبوؤں میں بسا دیا، آنکھوں کو کاجل سے قاتل بنایا، کومل ہتھیلیوں کو مہندی سے خون رنگ کیا اور پھر سُرخ چادر سے ڈھکے ہوئے بستر پر لاکر مجھے بٹھا دیا۔

آج میری شادی کا حسین دن ہے ۔ وہ حسین دن جس کے لئے ہر لڑکی بچپن سے ہی خواب دیکھتی آئی ہے۔ میرے دل میں اس وقت کیسے ارمان اور اندیشے ایک ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ اللہ! میری زندگی کا یہ سب سے حسین دن ہے! اے خدا ——

میری خوشیوں کو ہمیشگی عنایت کردے اے معبود —— ابھی ابھی اماں آجائیں گی۔ مجھے یقین ہے آج میری زندگی کی ایک اور تمنا

حقیقت کا روپ دھارنے والی ہے ۔ میرا زیوروں سے والہانہ عشق اور ہر بار اماں کا یہ کہنا "اری بیٹی! لڑکیاں کنوارے پن میں زیور پہنتی ہیں تو شادی کے دن ان کے چہروں پر نور نہیں اُترتا۔ ایسی تجھے کیا جلدی ہے میں تو اپنی رانی بیٹی کو زیوروں سے لاد دوں گی ۔ اک ذرا خدا تیری شادی کا دن تو لائے ۔

اماں کے پاس لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوقچی میں بچپن سے دیکھتی چلی آرہی ہوں ۔ میں اماں کی اکلوتی اولاد ہوں جب میں پیدا ہونے والی تھی تو بدنصیبی سے ابا ایک ٹرک کے نیچے آکر کچلے گئے اور پھر کبھی ہمارے گھر میں مردانہ قہقہہ نہ گونجا ۔

اور اسی کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار بھی جیسے ہمیشہ کے لئے کھو کر رہ گئی جب میں ذرا بڑی ہوئی تو میں نے اماں کو ہمیشہ سفید کپڑوں، سونی کلائیوں اور اجڑی مانگ کے ساتھ ایک حور کے روپ میں پایا ۔ میری یادداشت میں ایسی کوئی گھڑی نہیں جب میں نے اماں کے بال سنورے ہوئے دیکھے ہوں ۔ یا ان کے جسم پر کوئی خوبصورت سی ساڑی دیکھی ہو ۔

خاندان ہمارا بہت بڑا تھا ۔ ننھیال اور ددھیال دونوں طرف کے بہت سارے رشتہ دار تھے ۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ مچا رہتا ۔ کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے ۔ کسی کے یہاں شادی ہے کسی کی منگنی کسی کی سالگرہ، کی دھوم دھڑکا ہے ۔ اماں نے زندگی میں کسی کا احسان مول نہ لیا ۔ ہمیشہ مجھے اپنی خودی اور غیرت کو قائم رکھنے اور سر اٹھا کر چلنے کی تعلیم دی اور خود بھی میرے لئے مثال اور مشعل راہ بنی رہیں ۔ کتنے ہی رشتہ داروں نے مجھے آسرا دینا چاہا، لیکن اماں نے کبھی اسے گوارا نہ کیا ۔

لیکن ایک درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے یہی جواب دیا۔" ابھی خدا کے فضل سے میرے بازوؤں میں اتنی قوت ہے کہ میں اپنا اور اپنی بیٹی کا بوجھ اٹھا سکوں۔" ہر بار جب بھی کسی ہنگامے کی مجھے دعوت ملتی اماں مجھے ساتھ لے کر ضرور جاتیں۔ سیدھے سادے کپڑے، زیوروں سے میرا ہاتھ، کان، گلا، سب خالی۔ ایسے میں میرا جی مچلا کرتا کہ اماں کبھی تو وہ صندوقچی کھولیں جو ان کی الماری میں رہتی ہے۔ میری کتنی ساری سہیلیاں تھیں۔ سب یہی کہتی تھیں۔" چاند تو واقعی چاند ہے۔ خالہ نے ترا نام کس قدر مناسب اور موزوں چنا ہے۔ کبھی تو گہنے پاتے پہنتے تو اللہ قسم لوگ دل تھام کر رہ جائیں۔

ایک لڑکی ہونے کے ناطے میرا دل خود بھی زیورات کے لئے ترسا کرتا لیکن میں نے جب بھی اماں سے شادی بیاہ منگنی سالگرہ کے موقعوں پر پہننے کے لئے گھڑی دو گھڑی ہی کو زیور مانگے، اماں نے وہی ایک جواب دیا۔ ایک ذرا خدا تیری شادی کا دن تو لائے۔ ننھی سی گڑیا سے میں ایک بچی بنی، بچی سے لڑکی اور پھر میں ایک بھرپور جوانی میں بدل گئی۔ اسکول سے نکل کر میں ایک کالج میں آئی۔ خدا مجھ پر ضرورت سے زیادہ مہربان تھا۔ میں نے ہر سال نمایاں کامیابی حاصل کی اماں نے مجھ میں خود اعتمادی کا جذبہ یوں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا کہ میں نے کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھا۔ اور زمانے کے سب سے بڑے امتحان میں بھی میں نے کامیابی حاصل کر لی۔ میری محبت کا امتحان۔!

سلمیٰ باجی کی شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ سب لڑکیاں بھاری زرتار جوڑوں میں ملبوس، زیورات سے اجلی اجلی، ہنستی کھیلتی شادی کی رسمیں

رسموں میں حصہ لے رہی تھیں۔ اس دن زندگی میں مجھ پر شاید پہلی بار اداسی اور غم کا شدید جذبہ چھایا ہوا تھا۔ شادی کے ایسے بھرپور ہنگامے میں اماں نے مجھے ایک سادہ بادامی رنگ کے سلک کا جوڑا پہننے کو دیا تھا۔ اور وہ صندوقچی جس سے میری تمام آرزوئیں وابستہ ہوکر رہ گئی تھیں۔ وہی صندوقچی اماں نے آج بھی نہیں کھولی تھی میں اس قدر اداس تھی کہ جب گھر میں دولہا آ گیا، دولہا آگیا کا شور مچا اور سب لڑکیاں بالکنی پر بھاگیں تو میں اسی جگہ ستون سے لگی کھڑی رہی۔ صحن میں ہزاروں قمقمے جل رہے تھے۔ میرے آنسوؤں کی طرح، ان ستاروں کی طرح، جو میری آنکھوں میں چمک اٹھتے تھے اور جنھیں میں ہر بار جذب کرتی جاتی تھی۔ سب لڑکیاں عورتیں اوپر بھاگ چکی تھیں، میں تنہا ہی کھڑی کہ کسی کے قدموں کی چاپ پیچھے سے ابھری۔ میں نے یوں ہی سر اٹھا کر دیکھا۔ جمال نے مجھے بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ اس قدر بے باکی سے وہ میرے قریب چلا آیا کہ جس کی حد نہیں۔ بے پناہ اپنائیت اور پیار سے بولا۔ خدا کی قسم چاند تم سچ مچ چاند ہو۔ یہ تمہارے سیدھے سادے کپڑے، یہ زیوروں سے محروم حسن۔ تم اتنی پیاری ہو کہ دنیا میں کوئی اتنا پیارا نہیں۔ کیا میں خالہ جان سے تمہارا یہ پیارا سا، مہندی سے بے رنگ ہاتھ مانگ لوں۔ میں نے حیرت سے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ذرا فخر سے ہنس کر بولا۔" ارے بھئی یوں ہی تم جیسی شہزادی کو نہیں مانگ رہے ہیں۔ انجینئر بن گئے ہیں اور اب ساڑھے بارہ سو تنخواہ پا رہے ہیں۔

باہر زور زور سے باجے بجنے لگے شاید عقد خوانی ہو چکی تھی ایک دولہا نے ایک دولہن کو زندگی بھر کے لئے اپنا لیا تھا۔ میں نے اپنے گلے کو ٹٹولا۔ انگلیوں کو دیکھا۔ کلائیوں کو دیکھا، کانوں کی لوؤں کو ہاتھ سے محسوس کیا۔ کیا واقعی

جمال نے مجھے پسند کر لیا ہے۔ ؟ اگر میں زیوروں سے بھی سنوری ہوتی، گوٹے کناری، ٹکے کپڑوں میں ملبوس ہوتی تو ایک لمحے کو میں سوچ سکتی تھی کہ شاید میرے حسن نے زیور اور کپڑے کے دھوکے اور بھرم میں جمال کے سامنے اپنا غلط روپ پیش کیا لیکن اس نے تو مجھے یوں سادگی میں دیکھا ہے کہ مجھے اپنے روپ سے شرم آرہی تھی تو کیا میں یقین کر لوں کہ محبت کی یہ مانگ واقعی حقیقت پر مبنی ہے؟ کسی بناؤ سنگھار، کسی بناوٹ کو اس میں دخل نہیں۔ ؟

اور بی اے کا نتیجہ نکلتے ہی اماں نے میرا ہاتھ جمال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وہ مضبوط ہاتھ جو زندگی بھر ان پھیلے ہوئے ہاتھوں میں خوشیوں کی سوغاتیں بھرتے رہیں گے، اور میرے زیوروں سے کنگنوں سے چوڑیوں سے خالی ہاتھوں کو وہی ہاتھ سہاگ کے زیور بھی تو پہنائیں گے نا؟"

لیکن خوشیوں سے بھرپور دل میں میری خوشی کا ایک اور چاند بھی چمک رہا تھا۔ آج تو بالآخر اماں مجھے وہ صندوقچی دے ہی دیں گی نا۔ جس میں جھلمل کرتے کرن پھول، جھمکے، جڑاؤ۔ گلوبند، ہاتھوں کے کنگن، گلے کی سہاگ لڑی انگلیوں کی انگوٹھیاں، ناک کی ننھی سی جگ مگ کرتی لونگ۔ اور پتہ نہیں کیا کیا نہ ہوگا۔ میرا دل مارے خوشی کے دھک دھک کرنے لگا، سچ مچ میں اور کتنی حسین نظر آؤں گی۔ ابھی چند لمحے گزرتے ہیں کہ کمرے میں اماں کے مبارک قدموں کی مانوس اور مدھم چاپ ابھرے گی اور پھر اماں اپنے ناتواں اور کمزور لیکن عظیم ہاتھوں سے مجھے زیوروں سے لاد دیں گی۔

ارے اماں تو میرے سامنے ہی کھڑی ہیں، عزم و استقلال کا ایک عظیم ستون جس نے زندگی بھر مجھے سر اٹھا کر چلنے کی تعلیم دی، جس نے دکھوں میں بھی مسکراتے ہی رہنے کا سبق دیا۔ جس نے سدا آنسوؤں کے دشمنی کا درس دیا۔

ایسے آج ان آنکھوں میں آنسو! اماں خدا کے لئے مجھے آسرا دیجئے ورنہ میں گھٹ کر رہ جاؤں گی۔ میں اماں سے لپٹ گئی۔ تھرتھراتی ہوئی آنسوؤں بھری آواز سے وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ میری چاند میری بیٹی، میری چاندنی، مجھے پتہ ہے تو کتنی سمجھدار ہے۔ زندگی کی ناکامیوں سے کبھی ہار نہ ماننے والی۔ میری جان غم تو صرف اس بات کا ہے کہ تیرے میکے میں سب تجھے صرف آس ہی آس ملی، عورت ہونے کے ناطے میں خود بھی اس چاہت کا اندازہ کر سکتی ہوں جو کسی بھی لڑکی کو زیوروں سے ہوتی ہے۔ میری گڑیا میں نے چاندی سونے کے زیور کے بدلے تجھے علم کا زیور پہنایا، ظاہری حسن کے بجائے یہ چاہا کہ میری بیٹی زندگی کی راہوں پر ثابت قدمی سے چلنا سیکھے، تیری انگلیوں میں انگوٹھیوں کی بجائے قلم دیکھنا زیادہ پسند کیا۔ میں عورت تھی بیٹیا اور وہ بھی غموں کی ماری ہوئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تیرا حسن ان زیورات کا محتاج رہتا جو بہرحال پیلی اجلی دھات ہی تو ہے"۔ اماں کے گلے میں پھندا سا پڑنے لگا۔ وہ دم لے کر پھر بولنے لگیں۔

"وہ صندوقچی جو ہمیشہ خالی رہی تیری توجہ کا مرکز بنی رہی۔ مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ میں جڑاؤں گلوبند سے بھی قیمتی ہار تجھے دے رہی ہوں۔ وہ مضبوط باہیں جو سدا تیرے گلے کا ہار بنی رہیں گی، بیٹیا ظاہری دکھاوا کوئی چیز نہیں۔ بس دعا ہے کہ تم اپنے شوہر کا دل جیت کر زندہ رہو، تمہارا آنگن ننھی منی کلکاریوں سے گونجتا رہے کہ یہی زندگی کا سب سے حسین زیور ہے۔۔۔۔ اور خدا ہمیشہ تمہارا دامن محبت کے موتیوں سے بھرا رکھے۔ میری بیٹی۔۔۔۔" ایک سسکی نے سارے بندھ توڑ دئے۔

"اماں مجھے کوئی زیور نہیں چاہیئے۔ اماں، اماں آپ نے وہ سب کچھ مجھے دیا ہے جو کوئی ماں اپنی بیٹی کو نہیں دے سکتی۔ اماں یہ صندوقچی خالی نہیں ہے۔ یہ تو منہ تک موتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ میری اماں۔

ہم تم

سیدانی بی نے جب لال پیلے ہرے نیلے کپڑوں کے ڈھیر اور گوٹے کناری کی پٹاری اپنے آگے دھر کے کلثوم اور بوا کو پکارا، تو اس وقت اتفاق سے گلشن چوکی دالان میں آکر بیٹھی ہی تھی۔ بڑے گھرانوں کی بہو بیٹیوں سے کچھ پوچھنے گچھنے کی ہمت تو خیر اس میں کہاں سے آتی، لیکن دیدے پٹ پٹا کر دیکھا ضرور کہ سرسرانے ریشمی، سوتی، رنگ برنگے کپڑوں کی یہ ڈھیریاں آخر ہیں کس سلسلے میں؟ یہ سوچا جہاں جوان بیٹی ہو، وہاں ایک نہ ایک دن تو چمن کھلا نظر آتا ہی ہے ـــ اور خیر سے اب سائرہ اس عمر میں تو تھی ہی کہ ماں باپ کو ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کھائے جاتی۔ گلشن نے محض بات کرنے کی خاطر منہ کھولا،

"بڑی بیگم ـــ میں کہتا ہوں جوڑیاں نہ بھیجو گی؟" سیدانی بی نے آنگن بیٹھی گلشن کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا تھا اور سن کر بوکھلا سی گئیں۔ ایک دم ان کی نگاہ سے اطراف میں کھلے چمن در چمن پر پڑی اور کچھ بے اعتباری کے انداز سے انھوں نے

گلشن کو دیکھا اور جھنجلائی ہوئی آواز میں بولیں "

"بولن منہ اٹھائے چلی آئی ہے ۔۔۔ آواز دینا نہیں آتا تجھ کو" اور پھر منہ پھیر کر
انہوں نے لیا کو آواز دی "اے لیا ننھے میاں سے کہو آنے جانے والوں کو یوں پھوٹ
منہ نہ رکھیں ۔ اسے ہمیں نہیں پہننی ہیں چوڑیاں بنگڑیاں ۔۔۔!"

گلشن نے پانسہ اُلٹا پڑتا دیکھ، اپنی گٹھری سنبھالنے ہی میں عافیت جانی
یوں تو وہ برسہا برس سے اس گھر میں چوڑیاں پہنانے آتی تھی ۔ مگر ادھر جب سے
سائرہ بی بی جوان ہوئی تھیں، جیسے پورا ماحول سہما سہما ہی نظر آنے لگا تھا۔

جوان بیٹی کا ساتھ ہوتا ہی ایسا ہے کہ انسان ہر قدم پر سہم سہم کر چلے ۔۔۔
پھر یہ قسمت کی ماری تھی کہ سائرہ بی بی ہی کی ہم عمر کلثوم بھی گھر ہی میں سب کو نظر
آرہی تھی ۔۔۔ یہ کچھ ضروری تو نہیں کہ انسان بڑے گھر کا ہو تو صورت شکل بھی اچھی ہی
ہو۔ سائرہ نک سک سے درست تھی، چہرے پر مٹھاس بھی غضب کی تھی، مگر
جب کلثوم کا نام آجائے تو لوگوں کے حلق سے پانی نہ اترتے بنتا ۔ ہر ہر عضو اپنی
جگہ یوں تھا کہ اللہ نے فرصت میں خود اپنے ہاتھوں ڈھالا ہو ۔ رنگ روپ قد و قامت
اس پر مورنی سی چال اور بل کھا کھا کر چلتے میں جھر جھری پیٹھ پر جھکولا کھاتی، وہ جذبات
میں ابال پیدا کرنے کے لئے بہت کافی تھی ۔۔ کپڑے سدا سائرہ کی اترن پہنتی، مگر
میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی حسن جیسے پھوٹ نکلتا ۔ بظاہر اس بات میں
کوئی تک ہی نظر نہ آتی کہ بھئی آقا، آقا ہی ٹھہرے، نوکر، نوکر ہی ۔۔۔ پھر یہ کیا ضروری
تھا کہ کلثوم کی وجہ سے سائرہ کے پیام سلام میں بھی اڑچن آتی ۔ مگر جب بھی دیکھنے
والوں نے سائرہ کو دیکھا اور پھر کلثوم چائے کا طشت سنبھالے آئی، بس نیت
ڈانواں ڈول ہو گئی ۔۔ پھر نہ تو وہ پیام سائرہ ہی کا رہ جاتا، نہ کلثوم ہی کو کوئی اٹھا

سے جاتا۔ وکیل صاحب کے گھر والوں نے تو صاف کہلوا ہی دیا تھا۔

"نا بھئی ہم ایسی بیٹی نہیں اٹھاتے۔۔۔

جہاں کے نوکر، تقاؤں کے سامنے نوکر نہ سمجھیں۔ ان کے خون کا کیا ٹھکانا۔۔۔؟

کون جانے۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔"

اصل بات یہ تھی کہ بے چارے سید فیاض محمد گورے خوبصورت تھے۔ سائرہ خدا کی دین۔ سانولی رنگت لائی۔ کلثوم پکّا پان۔ دیکھنے والے فیاض میاں کی نیت پر شبہ کرنے لگتے۔ کون جانے فیاض میاں نے ذاتی فیاضی دکھائی ہو اور لُگا کو یہ تحفہ بخش دیا ہو!! مگر فیاض میاں ایسے نہ تھے۔ اب سوچنے والے کچھ بھی سوچ لیں، کسی کی سوچ پر کوئی پابندی تھوڑی ہی لگائی جا سکتی ہے، مگر وہ ان باتوں سے بہت دور تھے۔ شریف باپ کی شریف ہی اولاد تھے کبھی بیوی کے سوا دوسری عورت کا منہ تک نہ دیکھا۔ بلکہ وہ تو بڑی بیگم سے ہزار بار کہہ چکے تھے کہ کمین عورتوں کو منہ لگائے رکھتی ہو۔۔۔"

بُوا کو سیدانی بی نے ہی آج سے برسوں پہلے سائرہ کی انا گیری کو رکھا تھا سنتے تھے بوا کسی میراثی کی لڑکی تھیں۔ شادی کے بعد کچھ دن تو اصل چین سے گذرے پھر ایسی کھوٹ خرابی میاں بیوی کے بیچ آئی کہ میاں نے بیوی کو بیلے کی طرح ذہن کوٹ پیٹ کر گھر سے نکالی باہر کیا۔ یہ روزی پٹی نوکری کی تلاش میں نکلی تھیں تو اس وقت کلثوم ان کے پیٹ میں ہی تھی۔ سائرہ کوئی سال بھر کی ہو چکی تھی۔ سیدانی بی کو رحم آیا، پوچھ تاچھ کی پتہ چلا کہ میراثن ہے۔ سوچا، "ہوا کرے تو ہونے دو، اپنا کیا بگاڑے گی۔ کام سے کام رکھے، بس"۔ دو تین مہینے کے بعد ہی کلثوم پیدا ہو گئی۔۔۔ میاں بیوی کی بڑی ہتک ہوئی۔ میاں کہتے تھے کہ میں ہرگز اس میراثن

بچی کا دودھ اپنی بیٹا کو نہ پلانے دونگا، اور بیگم کہتی تھیں کہ دودھ تو وقت سے پیا لینا ہے، بس شرافت ہونی چاہیے شرافت ۔"

مگر فیاض میاں دنیا میں کسی کو مانتے تھے تو بس خون اور عزت کو۔ ہاں ۔ دونوں کی بحث سے اتنا تو ضرور ہوا کہ سائرہ نے پھر لوا کا دودھ نہ پیا۔ مگر سارا کام کاج وہی سنبھالتیں ۔ ان کے دل میں سائرہ کے لئے وہ پیار تھا، جیسے ایک بچی نہیں دو بچیوں کی ماں ہوں ۔ بیگم تو ان کے بغیر بالکل بے بس سی ہو جاتیں ۔ پورا ہی پورے گھر پہ حاوی تھیں، مگر فیاض میاں کو وہ دونوں میراثن بچیاں ایک آنکھ نہ بھاتیں ۔

دن گذرے تو کلثوم نے ایسا حسن اور ایسے ہاتھ پاؤں نکالے کہ جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا ۔ اور اب وہ ہوا آگئی تھی کہ وہ سائرہ کے حق میں مصیبت بن گئی تھی ۔ لوگ پتہ نہیں کیا کیا سوچ لیتے اور دیکھتے دیکھتے آیا ہوا پیام ختم ہو کر رہ جاتا ۔ خود بیگم پریشان ہو کر رہ گئی تھیں اور دو چار بار چاہا بھی کہ اب اس زہر کی پڑیا کو چلتا کر دیں، مگر میاں سے کہتے ڈرتی تھیں کہ خود ہی کہا تھا، اب کیوں آنکھ بدلتی ہو؟ پھر خود ہی خیال آتا کہ اچھے برے کتنے وقتوں میں، کتنے سالوں سے بوا نے ساتھ دیا ہے ابھی ہار کر بیٹھ جاتیں ۔ مگر ان کے دل سے یہ خیال کبھی نہ جاتا کہ اپنے ہی ہاتھوں انھوں نے سانپ پال لیا ہے ۔

سائرہ اسکول جایا کرتی تھی ۔ پڑھنے پڑھانے کی آزادی تو اتنی نہ تھی کہ من مانا راج کرتی، لیکن جب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس نے ماں باپ سے کہا میں اسکول جاؤں گی ۔ بستہ لٹکا کر اسکول جاؤں گی ۔ تو فیاض میاں تو چپ رہ گئے کہ ان کے گھرانوں میں لڑکیوں کے پڑھنے کا رواج نہ تھا، مگر بیگم نے اپنی بیٹی کی بات

جانے نہ دی۔ اکلوتی ایک اولاد کا دل توڑتیں بھی کیسے۔؟ سائرہ اسکول جانے لگی۔ اسکول سے آتی تو اِترا اِترا کر کلثوم کو بتاتی، "دیکھو میں نے تو یہ پڑھا ہے۔ میں نے تو یہ سیکھا ہے۔" ذہن اور فراست تو خدا کی دین ہے۔ دیکھتے دکھاتے میں کلثوم کو اتنا کچھ آگیا کہ خط پڑھ لیتی۔ ایک خوبی جو صرف سائرہ ہی کا حصہ ہونے جارہی تھی کہ "لڑکی پڑھی لکھی ہے" اس سے بھی بیگم ہار گئیں۔ دونوں لڑکیاں بس پڑھتی ہی چلی گئیں اور پھر وہ حد آئی کہ سنجیدگی سے ان کے بارے میں سوچنا پڑا۔

خاندان میں جتنے لڑکے تھے، آدم کی اولاد تھے۔ بڑے گھر میں آنا جانا تھا ہی۔ سائرہ سے پہلے کلثوم پر نظر پڑتی اور نگاہوں سے شوق چھپتا نظر نہ آتا۔ بھلا کون ماں باپ جان بوجھ کر کھنگوں اور نظر بازوں کو بیٹی دینا چاہیں گے۔؟ اکرم میاں نے تو، سنا گیا تھا کہ محض اسی مارے سائرہ کو پیام دلوایا کہ شادی ہوگی اور سسرال کے پھیرے ہوں گے تو کبھی نہ کبھی تو پکا پھل جھولی میں آکر گرے گا ہی۔ مگر بات پھوٹ گئی۔ اتنا تو کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ کلثوم کو اپنے گلے کی مالا بنا ڈالتا۔ بھلا میراثیوں کا بھی کوئی خون ہوا۔ ہاں دل بہلانے کی بات اور ہے۔

دو ایک غیر خاندانوں سے بات آئی بھی تو کسی نے تو ہزاروں کا مطالبہ کیا، اور بات ختم ہوگئی۔ اور کسی نے بہت ہی ترقی پسندی کو ئی تو لڑکی کے دیکھنے کا مطالبہ پیش کیا کس نے نشہ کیا تھا، جو ایسی انہونی باتیں کرتا۔ سیدانی بیگم تو اللہ رسول کی دہائی دینے لگی تھیں کہ جلد سے جلد یہ بلا ٹلے۔ اور کیا، جوان بیٹی ماں باپ کے حق میں بلا ہی تو ہوتی ہے!!

لو اب یہ چلی الگ نادم۔ جانتی تھیں کہ سارے لڑکے کیوں ایسے اڑیچو ہو گئے۔ بس چلتا تو کلثوم کو آج کسی کے حوالے کر دیتیں مگر کس کے۔؟ ایک

بار ڈمتے ڈرتے فیاض میاں سے بولیں بھی، "میاں جی، کلثوم کے لئے آپ کی نگاہ میں کوئی لڑکا ہو تو...."

فیاض میاں کا خون تپ گیا، طیش میں آکر بولے، ہم ہم ہیں۔ تم تم ہو! سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ اپنے کسی جان پہچان والے سے ذکر کریں بھی تو کیسے! یہی کہہ کر ناکہ ہماری بوا کی لڑکی، جو میراثن ہے، اس کے لئے لڑکا چاہیئے ۔۔؟! ایک۔ لمحے رک کر انھوں نے بوا کے رنگ بدلتے ہوئے چہرے کو دیکھا، پھر بیان جاری رکھا،" ہم اپنے منہ سے ایسے الفاظ نکال سکتے ہیں! اور وہ بھی تمہارے لئے؛ ہم ہم ہیں، تم تم ہو!"

اس ہم اور تم کی گرداں سے بوا کے کان آج کل سے نہیں، سولہ سترہ سال سے پھد کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے اس مصیبت کا تصور آج سے نہیں، کئی سالوں پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ اسی لئے کئی مرتبہ انھوں نے بڑے ہی خلوصِ دل سے کلثوم کے مرنے کی دعا مانگی تھی۔ مگر موت بھی شاید کلثوم کے بے پناہ حسن سے قریب آتے گھبراتی تھی۔

بیگم نے لگے لگوا کر دو چار پیام کلثوم کے لئے جوڑنے کی کوشش بھی کی، کہ سائرہ کا نہیں ہوتا، تو کلثوم ہی پہلے راہ سے ہٹ جائے۔ مگر بُوا کی بھی آخر ایک ہی اولاد تھی وہ کسی معقول لڑکے کو داماد بنانا چاہتی تھیں۔ انھوں نے جب بھی بیگم کے منہ سے یہ بات سنی، سر جھکا لیا۔ بیگم اولاد والی تھیں، ماں کے درد کو جانتی سمجھتی تھیں۔ زبردستی کیسے کر دیتیں؟ وہ بھی مجبور ہی تھیں۔

یوں بیگم اپنے طور پر یہ کوشش کرتی رہتی تھیں کہ پیام موجود نہیں، نہ سہی، لیکن ہر چیز کا جوڑ جماڑ تو رہے۔ وقت بے کسی چیز کی فکر نہ کرنی پڑے، اسی مارے وہ دن رات رنگین ریشمی ڈھیر اور گوٹا کناری کی جھلملاہٹ میں ڈوبی رہتیں۔ وہی آج کل وہ اتنی ہو گئی تھیں کہ اپنے ہی سائے تک سے کانپنے لگتی تھیں۔ باہر سے آنے

جانے والیوں پر سخت پابندی لگوادی تھی کہ مبادا کسی کی نظر لگ جائے، ٹوک ہو جائے۔

گلشن سارے محلے میں پھیر گئی کہ سیدانی بیگم تو گوٹے پٹے کا بازار سجائے بیٹھی ہیں۔ ادھر سے یعقوب صاحب، آدھر سے ڈاکٹر صاحب، اِدھر سے شریف میاں، سبھی کے گھر تو آس پاس تھے۔ شام تک سب کی ہی بیبیاں بن بلائے ہی ٹپک پڑیں۔ بیٹی ایک کی نہیں، سب کی ہی ہوتی ہے۔ سبھی کو خوشی ہوتی ہے۔ سب سیدانی بیگم کی جان کو آنے لگیں۔ یہاں کوئی بات ہوتی تو بتاتیں بھی۔ یقین کس کو آنے چلا تھا؟ یعقوب صاحب کی بی بی نے تو منہ پھوڑ کر پوچھ بھی لیا۔

"بہن، کوئی بات ہی نہیں ہے تو ڈھیر لگائے بیٹھی کیوں تھیں، اور باہر پہرا کیوں بٹھال دیا ہے؟"

"اوئی بی — ہمارے ہاں بچی پالنے میں رہے، تبھی سے جہیز کی فکر لگ جاتی ہے اور نظر آئے جانے اور ٹوکے جانے کی بات تو ایسی ہے کہ سدا سے بڑوں کے منہ سے سنتے آئے ہیں کہ ہری بھری بھلی چنگی چیز ٹوکی جاتی ہے۔ سو چا بچی کے کپڑے سینے بیٹھی ہوں تو چار غیروں کی نظر کیوں پڑے۔ اسی لیے ننھے خاں سے کہلوایا تھا۔ یہ موئی گلشن نے بات لگائی ہوگی!"

جانے اللہ کو سرخ روہی رکھنا تھا نہیں — یا کوئی مبارک ساعت میں سلائی کرنے بیٹھی تھیں کہ سچ مچ سائرہ کی ایک جگہ بات چلنے لگی۔ لڑکا غیر خاندان سے تھا عجیب منطق تھی اُس کی بھی — لڑکی زیادہ حسین نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا، "بیوی حسین ہو تو خواہ مخواہ لوگوں کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔"

سیدانی بیگم کو تو خدا نے موقعہ دیا۔ کلثوم چاہئے کے طشت ایک ایک

بی بی کے سامنے لئے پھری، مگر کسی نے الٹ کر نہ پوچھا کہ "اے بی، یہ جنت کی حور کہاں سے آئی ہے؟"

جانے کتنے برسوں بعد سیدانی بیگم نے اطمینان کی سانس لی — !

لڑکا پروفیسر تھا، خاندانی تھا، سیّد تھا، کماؤ پوت تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حسن پرست نہ تھا۔ جھِل مِل کرتے، رس رس کرتے کپڑے، زیورات، برتن جانے کیا کیا اَمکّ ڈھمکّ سامان آنگن اور دالانوں میں بکھرا نظر آنے لگا

شادی کی تیاریاں اپنے شباب پر تھیں!

مگر یہ کسے پتہ تھا کہ سب طرف سے مایوس ہو کر سائرہ کی جوانی ساتھی ڈھونڈ بیٹھی ہے! جب اُس دن کلثوم شام کی چائے لے کر سائرہ کے کمرے میں پہونچی تو کلثوم دھک سے رہ گئی!! — سائرہ کے کمرے کی کھڑکی جو سامنے والی بلڈنگ میں کھلتی تھی، کھلی تھی۔ کھڑکی کا پٹ ہوا سے جھول رہا تھا اور سائرہ اِدھر اپنی کھڑکی میں کھڑی مسکرائے جا رہی تھی۔

کلثوم نے ٹرے دھیرے سے رکھدی۔ کھٹ کی آواز پر سائرہ نے وحشت کے ساتھ پلٹ کر دیکھا اور بوکھلا کر بولی،

"تم —"!

"ہاں،" کلثوم ہنس کر بولی — "میں دیکھنا چاہ رہی تھی کہ جب لڑکیوں کی شادیاں اتنی قریب رہ جاتی ہیں تو وہ تنہائیوں میں کیا کچھ کرتی ہیں۔"

سائرہ بری طرح بوکھلا گئی —— ایسی کہ اُس کے چہرے کی رنگت ہی بدل گئی — وہ کلثوم کو کسی طرح ایک بہن سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ وہ یکایک گرم ہو کر بولی،

"تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے، کلثوم، سمجھیں نا! میں جو چاہوں کروں۔"

کلثوم اُس کے بے پناہ غصہ کا اندازہ بھی نہ لگا سکی تھی کہ میٹھی دھن میں ایک سیٹی بجی اور سائرہ اور کلثوم دونوں نے بیک وقت نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا سائرہ تو بوکھلا کر رہ گئی اور کلثوم نے سائرہ کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا، جیسے،

"ہوں ــ تو یہ بات تھی"! اور وہ الٹے پیروں کمرے سے باہر نکل گئی ــ

شادی کی تیاریاں جوں جوں تیز ہو رہی تھیں توں توں سائرہ کے چہرے کی رونق کم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ گھنٹوں اپنے کمرے کے دروازے بند کئے پڑی رہتی۔ کلثوم کھانا چائے اس کے کمرے میں لے جاتی تو دیکھتی کہ کھڑکی کے پٹ ادھ کھلے ہیں۔ پردہ ہوا سے جھول رہا ہے اور سائرہ غم کی مورت بنی بیٹھی ہے۔

اُس دن جبکہ شادی میں صرف دس دن رہ گئے تھے، کلثوم نے بالکل بڑی بہنوں والے انداز میں سائرہ کو سمجھانا چاہا، "سائرہ بی بی، آپ کی شادی میں صرف پندرہ دن رہ گئے ہیں ــ مہمان آنے آج سے شروع ہو جائیں گے۔"

"جانتی ہوں۔" وہ سوکھے لہجے میں بولی۔

اور یہ بھی آپ جانتی ہی ہوں گی کہ آپ کے ابو میاں کا نام سیّد عیاض محمد ہے جو دنیا میں اپنی عزت کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔"

سائرہ نے سر اٹھا کر دیکھا، لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ کلثوم بالکل بڑے

سکھوں کے انداز میں بولی، "ایک انسان بیک وقت دو سڑکوں پر نہیں چل سکتا، سائرہ بی بی" خلاف توقع سائرہ نے اس کی بات سن کر، سسک کر سر جھکا لیا۔ کلثوم میں۔ میں کس قدر دکھی ہوں! جی چاہتا ہے۔۔۔" اور وہ سسکتی ہی رہ گئی۔

جب ڈھولک پر پہلی تھاپ پڑی تو فیاض میاں نے ادھر مردانے میں جھلا کر کہا، "جواب نہیں بیگم کا۔ سیدوں کی شادی میں اب ان میراثیوں اور بھانڈوں کی کیا تک ہے؟ ہونہہ۔ خرافات ہیں ساری!"

اُدھر ڈھولک کی پہلی تھاپ پر سائرہ کا دل آنکھوں سے پانی بن بن کر بہنے لگا۔ کلثوم جو اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "بی بی۔ یہ دن تو زندگی میں آنا ہی تھا۔ اب رو کر بھی کیا فائدہ ہے۔"؟ سائرہ نے کلثوم کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ میرا دل پھٹ جلئے گا کلثوم۔" کلثوم کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

فیاض میاں بڑے گھر کے تھے، اور دنیا میں اگر کسی چیز کی سب سے زیادہ (جان سے بھی زیادہ) پرواہ کرتے تھے تو وہ تھی عزت۔ غیروں میں بیٹی دی تھی، بھلا اپنی ناک اور عزت کا خیال کیسے نہ کرتے؟ اپنی بساط سے بڑھ کر خرچ کر رہے تھے۔ یہاں وہاں چراغاں، روشنی ہی روشنی، پیروں کے نیچے مسلنے کو قالین، کھانے کو بریانی اور قورمے سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں۔ سمدھیانے ہی میں نام نہ نکلے تو اور کہاں نکلے! ایک ہی بیٹی تھی، ایک ہی وقت بس زندگی میں آنے والا تھا بھلا اپنی ناک اور عزت رکھنے کا اس سے زریں موقع کب آسکتا تھا؟

باہر نکاح خوانی کے لئے شامیانے باندھے گئے تھے۔ بیگم کی خوشی تھی بینڈ باجہ آیا ہوا تھا، چراغ ہی چراغ۔ اجالوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اندر اس سے سوا دھوم دھڑکا تھا۔ اندر آرسی مصحف کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دلہن کا سنگھار ہونا باقی تھا، جو دروازے بند کر کے کپڑے بدل رہی تھی۔ سمدھیانے والیاں اس انتظار میں بیٹھی تھیں کہ کب دلہن کے کمرہ کا دروازہ کھلے اور وہ سنگھار کرنے کمرے میں جائیں ۔۔ باہر سے بینڈ کی آواز بھی آنے لگی، "اے لو، نکاح خوانی ہو بھی گئی اور یہاں تیاری نہیں ہو پائی کہ آرسی مصحف کے لئے چھپر کھٹ لگایا جائے"

باہر سے کلثوم نے دروازہ دھپ دھپایا زنجیر ڈھیلی تھی یا اُس کا ئی غلط طریقے سے گئی کہ جھٹ سے دروازہ کھل گیا۔ کلثوم اندر گئی اور کلثوم کے پیچھے دولہے والیاں دولہے کی بھاوج جب پلنگ پر چڑھنے لگیں تو ۔۔ وہ بیٹھنے لگی ہی تھیں کہ سامنے سے کوئی بی بی بولیں ۔۔

اوئی، یہ مردوا کون کود کر بھاگا ہی ۔۔؟"

ایک کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ ساروں کے منہ پر ہو گئی ۔۔ سنگھار تو رہا جگہ پر ۔۔ سارے گھر والے میں تو توبہ مچ گئی کہ دلہن کی کھڑکی سے کوئی مردوا بھاگا ہے! سیدانی بیگم تو غیر خاندان میں بیٹی دے کر یوں ہی ہتھیلی میں عزت لئے پھر رہی تھیں کہ مردوے کا نام سن کر آن کی کمر ہی بیٹھ گئی۔ اتنی بڑی بات تھی کہ باہر کے مرد لوگ بھی اندر گھس آئے! فیاض میاں کا رنگ فق تھا۔ اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر اِدھر بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ ایسی کھلبلی مچی کہ کسی کو دلہن کی سدھ باقی نہ رہی۔ بس ایک کلثوم تھی، جو سائرہ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اکدم کلثوم کی نظر پلنگ پر مڑے

تڑے کاغذ پر پڑی ۔۔۔ اس نے بے سُدھ سائرہ کو تکیئے کا سہارا دے کر لٹایا اور چٹھی کھولی۔

میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اتنے ہنگاموں میں بھی تمہارے ساتھ بھاگ چلنے کے لئے تیار ہوں۔ کھڑکی کی راہ سے تم ہی نہیں، ساری خوشیاں میری زندگی میں داخل ہو جائیں گی۔ کاش، اتنے دنوں سے غائب رہ کر اِس نامراد موقع پر ہی نہ آتے، مگر پھر بھی ....."

نہ القاب نہ سلام ۔۔ نہ نیچے نام ۔۔۔!! تو یہ سائرہ تھی، جس نے دعوت نامہ بھجوایا۔ اور وحشت میں اُس کی جیب سے جاتے جاتے گر بھی پڑا ۔۔۔ باہر سے تیز آواز آئی، " نہ بابا، ایسی لڑکی سے ہم نہ کریں گے ۔۔ نکاح خوانی ہو بھی گئی تو کیا ہوا ۔۔۔ ہم نے خود دیکھا، کھڑکی سے بھاگا ہے ۔۔ جانے کون بھگوڑا تھا!"
ہاں، اسی لئے غیروں میں شادی نہیں کرنی چاہیئے ۔۔ دولہے سے کہو مسند سے اٹھ جائے ۔۔ لڑکی آوارہ ..."

کلثوم نے شادی کے اہتمام میں نفیس کپڑے پہن رکھے تھے، جو بھاری تو نہ تھے، مگر اس کے حُسن کو قابلِ توجہ بنا رہے تھے۔ وہ جب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دلہن کے کمرے سے آرہی تھی تو آنگن میں تھو تھو کرنے والی عورتیں بھی ایک لمحے کے لئے اُدھر متوجہ ہو گئیں۔ بے حال سیدانی بیگم اور بوکھلائے ہوئے فیاض میاں کی طرف دھیان دیئے بغیر اس نے چٹھی بڑھا کر ایک خاتون کے ہاتھ میں رکھ دی، "وہ ۔۔ وہ میرے لئے آیا تھا ۔۔ اور ... یہ ۔۔ یہ پرچہ میں نے ہی تو لکھا تھا ۔۔"

فیاض میاں جھپٹ کر اس کی طرف بڑھے۔ وہ تیزی سے سر جھکا کر آنگن سے

ہوتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

جب دُلہن رخصت ہو گئی اور سب کے کھانے دانے کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد فرصت سے سانس لینی نصیب ہوئی تو فیاض میاں اپنی بی بی سے طعن کے ساتھ بولے:

دیکھ لی میراثن بچی کی شرافت! کھڑکیوں کی راہ سے عاشقوں کو بلایا جاتا ہے اور تم تو دم دیتی تھیں بوا اور ان کی لڑکی پر۔ اچھی پکڑ میں نہ آجاتی تو آج سائرہ کے ساتھ ساتھ ہماری عزت بھی ختم ہو گئی تھی۔" پھر ایک لمحے لرز کر وہ بولے، "بس، بہت دن تمہاری سن لی۔ اب تو رات بہت جا چکی ہے، کل صبح ہوتے ہی بوا اور کلثوم کی چھٹی کر دو۔"

سیدانی بیگم نے سر جھکا لیا۔

میاں کی بات مان لینے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔؟

من کا موتی

بارش کہتی تھی آج برس کر کبھی رہ رسوں گی ۔ سارے میں پانی ہی پانی تھا یہاں وہاں اِدھر اُدھر، جدھر نگاہ جاتی تھی پانی ہی پانی ۔ اور شاداں کو تو آج ہی مسجد میں چراغ جلانا تھا ۔ آج تیسرا جمعہ تھا ۔ بڑی ماں نے تو کہا تھا کہ پابندی سے ہر جمعہ کو چراغ جلایا جائے تو من کا موتی ہاتھ آتا ہے ورنہ ۔۔۔ اور اس کے آگے شاداں کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی ۔۔ نہیں نہیں، وہ ضرور چراغ جلانے جائے گی، چاہے اس کوشش میں اس کی اپنی زندگی کا چراغ کیوں نہ گُل ہو جائے ۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر طاقچے پر رکھی ماچس کی ڈبیا اتاری اور کوری کوری سرخ مٹی کا چھوٹا سا دیا آنچل کی اوٹ میں لیے وہ آنگن میں اتر آئی ۔ ذرا سا سر نیہوڑا کر اس نے کمرے میں جھانکا ۔ اماں گہری نیند سو رہی تھیں ۔ رہے بے چارے ابا تو وہ تو صبح سویرے کے جاگے ہوئے ہوتے تھے ۔ انہیں تو سرِ شام ہی بچوں کی طرح

پیٹ سے نیند آجاتی تھی۔ ایسا کوئی اندیشہ اسے نہ تھا کہ اماں اسے کھوجتی پھریں گی یا ابّا اس کا نام لے لے کے پکارتے نکلیں گے۔ پھر مسجد بھی کون سی بڑی دور تھی۔ بس چار چھ قدم گھر سے نکل کر چلو، پھر بائیں طرف کو مڑ جاؤ، سامنے ہی تو اپنے پرشکوہ جھلملاتے میناروں کے ساتھ وہ مسجد کھڑی تھی۔ آخر کو زندگی کی تمام امیدوں کا سودا تھا! کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو وہ ٹال بھی جاتی۔ اس کی نگاہوں میں ایک گھر گھوم گیا، جس میں بڑی سی میز کے سرے پر ایک وجیہہ شخص بیٹھا انڈے پر سیاہ مرچ اور نمک چھڑک کر کھا رہا تھا اور بہت پیارے پیارے دو لڑکے اور ایک لڑکی دودھ میں کارن فلیک ملا کر کھا رہے تھے، اور وہ خود اس مرد کے مقابل والی کرسی پر بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی ۔۔۔ یہ آئندہ زندگی کا ایک معصوم اور بھرپور نقش تھا، جو اس نے تصوّر میں بارہا دیکھا تھا۔ جیتے جی اس تصوّر کے حقیقت بننے کا دُور دُور شائبہ تک نہ تھا۔

شاداں کی بے حد پیاری سہیلی صنوبر جب سے ایک نائب تحصیل دار سے بیاہ کر شہر چلی گئی تھی، اس کی اپنی زندگی کی ساری خوشیاں ایک دم جیسے ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ بات نہیں کہ صنوبر سے اس کی ایسی ہی زندگی کی ڈور بندھی ہوئی تھی کہ اس کے جدا ہوتے ہی اس کے اپنے زندہ رہنے کے لالے پڑ گئے ہوں۔ بات تو صرف اتنی تھی کہ گاؤں کی بیاہی صنوبر جب شہر پہنچی تو اس کی زندگی اور ماحول ہی یکسر بدل گیا۔ تین برس میں وہ تین بچّوں کی ماں بن گئی تھی اور اب وہ میکے آتی تو دسترخوان کے کنارے آلتی پالتی مار کر کھانے کا اسے سلیقہ ہی نہ رہا۔ کبھی ساڑی پر سالن کے سُرخ سُرخ چھینٹے پڑ جاتے تو کبھی نوالہ ہی گود میں گر جاتا۔ وہ بڑی معصومیت سے، جس میں رعونت کا عنصر چھپائے نہ چھپتا، کہتی "ہائے، اب ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے

کی عادت ہوگئی ہے نا۔ مجھ سے تو اب زمین پر بیٹھا ہی نہیں جاتا" ایسے میں اس کی ماں بڑے فخر سے پاس بیٹھی تمام بیبیوں کو دیکھتیں مگر لہجے میں گڑ بھر کر بولتیں "لے بی، اب ہم نے تو اپنے بس بھر مشرقی طور طریقے سکھادئے تھے بیاہ ہے جانے پر بیٹی پر کس ماں کا بس چلا ہے۔ اب دیکھو اکیس برس کی عادت سے ان بی بی نے دنوں میں پینڈ چھڑالیا۔"

ان کے طعنے کی توڑ صاف سیدھی شاداں کی ماں پر جاکر پڑتی تھی۔ جن کی بیٹی کا اب اکیسواں بھر رہا تھا اور جو صنوبر ہی کی ہم عمر تھی، مگر ابھی تک جس کے پیروں میں بچھوؤں کی چھنک نہیں چھنکی تھی۔

ماؤں کی آپس میں کتنی تکرار چلتی، مگر صنوبر اور شاداں اب بھی ایک جان ہی تھیں تین بچوں کی ماں ہونے کے بعد بھی صنوبر میں وہ تناؤ نہیں پیدا ہوا تھا جو اپنی ساتھ کھیلی سہیلی سے خواہ مخواہ ہی ایک اکڑ سی پیدا کردیتا ہے۔ صنوبر کی رعونت تو لے دے کر ساری اس بات پر تھی کہ میاں انگریزی فیشن کے متوالے ہیں۔ چار پیسے سے خوش ہیں، ورنہ الگ کمرے میں ابھی تک دونوں وہی شاداں اور وہی صنوبر تھیں میاں کے پہلے دن سے لے کر آج تک کے قصے وہ شاداں کو آکر سنادیتی، مگر کبھی اس بات کی تہہ کو نہ پہنچ پائی کہ اکیس برس کے کنوارپن کی آگ میں جلنے والی اس برہن کو یہ ملن کی روداد کیسے بھسم کر ڈالتی ہوگی۔ صنوبر کا شوہر یوں بھی فوٹوگرافی کا ایک ہی شوقین تھا۔ بات بات پر قدم قدم پر تصویریں کھینچتا ایک تصویر صنوبر نے شاداں کو دکھائی تھی جس میں ایک ٹیبل کے گرد ان کی پوری فیملی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ شاداں نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا: "تیرے میاں خود تو اس تصویر میں موجود ہیں پھر بھلا تصویر کس نے اتاری ہوگی" صنوبر بڑے پیار سے ہنس کر کہنے لگی "اب

تو تو نری پڑھو رہ گئی، اری ایسے بھی کیمرے ملتے ہیں کہ اس کا ایک بٹن دبا کر اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ جاؤ، تھوڑی دیر میں کھٹ سے بٹن بند اور تصویر حاضر۔ پھر وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولی "یہ پتہ نہیں خالہ بی اور خالو میاں تیرے نصیب سے ایسے بے پروا ہو کر کیوں بیٹھے ہیں، کیا ساری دنیا کے لڑکوں میں ایسے ہی کیڑے پڑ گئے ہیں۔ صنوبر کی اس بات پر شاداں اس وقت کھسیانی ہو کر رہ گئی تھی مگر اس نے طے کر لیا تھا کہ اماں اور ابا تو اچھے لڑکے کی آس میں دانتوں کی طرح اس کے بال بھی سفید کر دیں گے، وہ خود ہی اپنے لئے کوشش کیوں نہ کرے؟ دعا کیوں نہ کرے؟ منت کیوں نہ مانگے؟ اور اس کی نگاہوں میں جتن اماں گھوم گئیں۔

جتن اماں گاؤں بھر کی دکھی لڑکیوں کا آسرا تھیں بے اولاد والیاں ان کے پاس جاتیں، وہ اپنی بے نور آنکھیں لئے رات بھر وظیفہ اور دعائیں کرتیں اور یوں دوسروں کی زندگی کو روشن کر دیتیں۔ ایسی بے غرض اور بے لوث خدمت تھی جتن اماں کی کہ کبھی کسی سے نذرانے کے طور پر ایک پائی تک نہ وصول کی۔ ان ہی جتن اماں نے شاداں کے دل کی بات سن کر اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا تھا "بد دل نہ ہو بیٹی ـــ اللہ بہت بڑا ہے میں گناہ گار تو بس دعا کر سکتی ہوں مگر اتنا تمہیں بھی کرنا ہوگا کہ پانچ جمعوں تک ہر ہفتے مسجد میں ایک چراغ جلانا ہوگا ـــ خدا سے پوری امید ہے کہ پانچویں چراغ کے جلاتے ہی تمہیں تمہارے من کا موتی ضرور مل جائے گا۔ اس قدر پر یقین تسلی پا کر شاداں کے آنسو اُبل پڑے تھے۔ سسکی کی آواز سن کر جتن اماں نے کہا تھا "رو نہیں بیٹی، خدا بہت بڑا ہے، یہ حقیقت ہے کہ بیوی بننے، ماں بننے کی تڑپ ہر عورت کے دل میں رہتی ہے اور یہ ایسی کوئی غلط خواہش نہیں جس پر تم شرماؤ یا خود کو شرمندہ محسوس کرو، جاؤ

خدا تمہاری مراد بر لائے گا۔"

اور آج تیسرا ہی جمعہ تھا۔ اور پانی اس قدر دھاروں دھار برس رہا تھا، اب اگر وہ ہمت ہار تی تو بے چاری جمّن اماں کو کیا تکلیف تھی کہ خواہ مخواہ ہی اس کے لیے دعائیں کرتی، پھرتیں؟ اس نے بڑی ہمت کر کے آنگن کے شپ شپ کرتے پانی میں اپنے پاؤں ڈبو ہی دیئے چپلوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی گھستے ہی اس کے تمام بدن میں ایک سرد آگ سی بھر گئی اور دوسرے ہی لمحے وہ اس ٹھنڈک کی عادی ہو کر پانی میں چلتی گئی۔

گھر سے باہر اندھیرے کے بھوت نے اسے جکڑ لیا۔ لڑکیاں اپنے سامنے کسی غیر مرد کو پا کر شاید اتنا نہیں ڈرتیں جتنا اندھیرے سے۔ دو تین قدم چلنے پر اُس کے پاؤں ٹھٹھک گئے اور کان کھڑے ہو گئے۔ فتو کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلنے لگی۔ وہ اونچے اونچے سروں میں گائے جا رہا تھا۔ "آج تو میں بازار جانے والا ہوں"

اس فتو کا بھی جواب نہیں تھا۔ گانے کا حد درجہ شوقین تھا، لیکن یہ بھی اس میں ایک خاص بات تھی کہ زندگی میں کبھی کوئی گیت یا شعر نہیں گایا، ہمیشہ سیدھے سادے جملوں کو شعر کے انداز میں لَے سے پڑھتا۔ بیل گاڑی پر فصل کے میوے، یا اناج، یا گنّے لدوا کر جب وہ شہر کی منڈی میں لے جانے لگتا تو چلا چلا کر گاتا۔ "آج تو گنّے بازار چلے ہیں۔" پھر وہ اسی کو بار بار دہرائے جاتا اور جملہ الٹ پلٹ ہو جاتا۔ "اجی آج تو بازار چلے ہیں گنّے ۔۔۔ ہو گنّے ۔۔۔ اجی گنّے ہائے گنّے ۔۔۔" پھر وہ تالیاں بجا کر یا انگلیاں چٹخا کر جو تال دیتا تو پھر سچ مچ پتہ نہ چلتا کہ یہ ایک نثریہ جملہ تھا یا واقعی شعر تھا۔

اس وقت بھی برستے پانی اور اندھیرے میں پتہ نہیں وہ کون سے بازار چلا تھا کہ چلّائے جارہا تھا، "ارے آج تو میں بزار چلا ہوں۔ بی بازار چلا ہوں۔ جی بزار چلا ہوں۔

شاداں کے پاؤں وہیں جم سے گئے ــــ آواز کا رُخ اسی کی طرف تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اس طرف آ ہی نکلا تو پھر چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آئے گا ــ فتو جب تک کسی لڑکی کو چھیڑ نہ لے، کسی کو ستا نہ لے، کسی سے گالی نہ کھالے تو وہ فتو ہی کیا ہوا ــــ ؟ گاؤں کی ایک لڑکی کے ساتھ تو اس نے غضب ہی کر دیا ــ بھگا کرلے گیا اور تین دن بعد اسے پھوک کی طرح پھر ماں باپ کے گلے ڈال گیا۔ چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد، یہ موٹا تگڑا، رستم کا رستم لگتا ــــ سب ہی اس سے ڈرتے تھے۔ گاؤں کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کا گروہ ہمیشہ اس کے ہاتھ پہ رہتا۔ جو چاہتا کرتا۔ کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اس سے لڑنے کی سوچتا۔ مندر کے نام پہ کھلے سانڈ کی طرح اسے چھوٹ تھی کہ جس دکان پر جائے، جو بھی مال پسند آجائے مونہہ لے۔ پورا نام تو اس کا فتح خاں تھا اور واقعی یہ حقیقت تھی کہ جس چیز کو بھی چاہتا فتح کر لیتا، مگر پیار سے یار لوگوں نے نام کو بگاڑ کر فتو کر دیا تھا۔ کوئی فتے کہتا، کوئی فتا، مگر یہ سب پیار محبت کی حد تک۔ اگر کوئی ٹیڑھی آنکھ کر کے فتّا کہہ دیتا تو اس کی بس شامت ہی آجاتی

گانے کی آواز اور قریب، اور قریب ہوتی جاتی تھی اور شاداں کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ وہیں سہم کر ایک بوسیدہ سے مکان کی دیوار سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی ایسے جھما جھم پانی میں یہ دیوار گر بھی سکتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ فتو کے چنگل میں پھنسنے سے یہ کیا برا ہے کہ دیوار تلے ہی دم نکل جائے۔

گانے کی آواز اب بند ہو گئی تھی۔ شاداں نے سکون کی لمبی سانس بھری اور قدم اٹھایا ہی تھا کہ سانپ کی سی پھنکار کے ساتھ، اس کا ڈوپٹہ سرسراتا ہوا کسی اور کے ہاتھ میں چلا گیا۔

اب بتا اتنی رات کو کہاں چلی تھی؟" تیز آواز کا کوندا لپکا۔

شاداں کا اوپر کا دم اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، لیکن اتنے میں بھی۔ شاداں نے لپک کر اپنا دوپٹہ کھینچ ہی لیا اور تیزی سے بولی "حرامی شرم نہیں آتی اکیلی لڑکی کے ساتھ چھیڑ کرتے۔"

"ارے تم اکیلی ہو پیاری، ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہیں۔"

شاید حد سے زیادہ بڑھے ہوئے خوف ہی کا دوسرا نام بہادری ہے۔ شاداں اسی انداز میں بولی "قبر میں کیڑے پڑیں گے جو مجھے ہاتھ لگایا یا چھوا۔"

فتو بھی کمینے پن پر اتر آیا، جھلا کر بولا "تجھ ایسی سڑی ماری کو چھوئے بھی کون جو قبر میں کیڑے پڑنے کی نوبت آئے۔"

"تو پھر میرا دوپٹہ کیوں کھینچا؟"

فتو سر کھجا کر کہنے لگا "یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ ٹھہر ذرا سوچ کر بتاتا ہوں۔" اور ایک دم اس نے لپک کر دونوں ہاتھوں میں شاداں کو دبوچ لیا شاداں پانی میں بھیگ کر مچھلی کی طرح سل سل ہو رہی تھی، ذرا سی کشمکش سے وہ اس کے ہاتھوں سے پھسل گئی، اور تیزی سے اندھیرے میں دوڑ پڑی۔ فتو بھی اس کے پیچھے ہی لپکا، مگر جانے شاداں کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا تھوڑی دیر کی اِدھر اُدھر کی تاک جھانک کے بعد وہ ایک جملہ گاتا ہوا اپنی راہ چلا گیا " آج تو بچ گئی لونڈیا، پھر سمجھ لیں گے۔ ارے پھر سمجھ لیں گے ہو، پھر سمجھ

ملیں گے۔ اجی آج تو بچ گئی ..... "

آج سے نہیں، پانچ برس سے فتو شاداں پر مر رہا تھا، مگر شاداں کے باپ نے نہ صرف یہ کہ انکار ہی کیا بلکہ فتو کے باپ کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ انہیں بھی دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے، شاداں تھی بھی ایسی ہی بھرپور جوانی کہ جو دیکھے مچل جائے۔ کیا دنیا میں کسی لڑکی کا رنگ گورا نہیں ہوتا؟ کیا کسی لڑکی کی کٹیلی ۔ آنکھیں نہیں ہوتیں؟ کیا کسی کا ستار کی طرح کسا ہوا بدن نہیں ہوتا؟ کیا کسی کے بال ایسے لمبے نہیں رہتے کہ وقت پڑنے پر دوپٹے کی بجائے اوڑھ پیٹ لیے جائیں؟ یہ سب ہوتا ضرور ہے مگر ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ یہ سارے حادثے ایک ہی لڑکی پر ٹوٹ پڑے ہوں اور یہی بدنصیبی شاداں کو بھی لے ڈوبی تھی، اُس کے بے پناہ حسن کو سجدے کرنے کے لئے کتنوں نے اپنی جبینیں جھکائیں، مگر اس کے ابّا اور امّاں ایک کبھی نہ ٹوٹنے والے غرور میں چُور تھے کہ جس کی ایسی بیٹی ہو اس کو بر بھی ایسا ہی ملنا چاہیئے۔ پندرھویں، سولہویں برس میں تو شاداں کے لیے اتنے پیغام آئے کہ سال کے آخر میں جب دونوں میاں بیوی نے بیٹھ کر حساب جوڑا کہ چائے پلانے میں مہمانوں پر کتنا خرچ آیا تو پورے ساڑھے چار سو روپے بیٹھے تھے۔ ارے اتنے میں تو مزے سے خود لڑکی ہی کو بیاہ دیا جا سکتا تھا! مگر بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ کوئی گھر چل کر آئے اور اسے چائے کا پیالہ تک نہ پلایا جائے۔

عورت اور پھل، دونوں کا حشر ایک ہی ہوتا ہے، اگر وقت پر ڈال سے اتارا نہ جائے تو سڑ کر خود ہی نیچے گر جاتا ہے۔ شاداں کا بھی یہی حشر ماں باپ کے غرور کے آگے ہونا تھا اور ہوا۔ چار چھ برس تک تو پیغام ٹوٹ ٹوٹ کر آتے

آتے ہی گئے، مگر کب تک؟ پھر تو لوگوں نے سوچنا بھی چھوڑ دیا کہ مرزا صاحب کے ہاں کوئی لڑکی بھی ہے۔ البتہ فتح خاں ابھی تک شاداں کے بارے میں ہی سوچتا رہتا تھا، اور یہ بڑی عجیب بات تھی کہ وہ شاداں کو دھوم دھڑ کے کے ساتھ بیاہ کے لے جا کر دلہن بنانے کے خواب دیکھتا تھا، ورنہ کیا یہ ناممکن تھا کہ وہ شاداں پر ہاتھ صاف نہ کر دیتا؟ اسی لیے اس نے باقاعدہ پیام بھجوایا تھا اور بیچ میں اپنے بوڑھے باپ کو بھی ڈالا تھا، اور بوڑھے باپ کی جو بے عزتی ہوئی تھی وہ اسے یاد تھی۔ اور اسی وقت سے وہ ایسے موقعے کی تاک میں تھا کہ گن گن کر بدلے لے سکے۔

شاداں کے لیے فتح خاں نے پیغام کوئی دو برس ہوئے ہی بھجوایا تھا: کیوں کہ اس کا اپنا ایک خاص مزاج تھا۔ وہ یہ کہا کرتا کہ کھلے ہوئے پھول میں جو بات ہے وہ مونہہ بند کلی میں نہیں ہے، اسی لیے پندرھویں سولہویں برس میں جب پیام شاداں پر بیروں کی طرح پٹاپٹ گر رہے تھے تو اس نے سوچا بھی نہیں لیکن شاداں جب انیس سال کی بھرپور تمنا بن گئی تب اس نے پیام بھجوایا باپ کی تو خیر الگ بات تھی، خود شاداں کو بھی جب پتہ چلا کہ اس کے بیٹے فتح خاں کا پیام آیا ہے تو وہ آگ اگلنے لگی" اس نے ہمت ہی کیسے کی؟" بس یہی سوچ سوچ کر اس کا جی جلا کرتا۔ مانا کہ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین اس کی تھی ہر بخشش بھی جاتا کہ نوکر دن چاکروں کے ہوتے بھی سارا کام تو بیٹیا اپنا مال تک بنڈیوں گاڑیوں میں لدوا کر شہر لے جاتا۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا بھی ایسا شوقین تھا کہ شہر میں جو بھی نئی چیز فیشن میں آتی، سب پہلے فتو ہی کے پاس نظر آتی ٹیری لین کی شرٹ سب سے پہلے اسی نے پہنی۔ کیا کپڑا تھا! واہ

واپس دھو ڈالو اور پہن لو ۔ سب چھاتا ہوا، نہ استری کرنے کی ضرورت نہ رات بھر تہہ کر کے تکیے کی طرح سرہانے دبانے کی حاجت اور پھر چھوٹے سے ڈبے میں رنگا رنگ پروگرام، نت نئے گانے ۔ یہ اور بات ہے کہ خود اس کو گانے دل سے جوڑنے کا خبط تھا، مگر ٹرانزسسٹر تو پہلے اسی نے خریدا تھا۔ لیکن یہ بھی کہیں ہوا ہے کہ پیسے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے۔ شرافت بھی تو آخر کوئی چیز ہے؟ اور شرافت نام کی چیز تو... دور تک ننو کے آس پاس نہ تھی ۔ پینے پلانے سے لے کر رنڈی بازی، جوئے، ڈاکے ڈکیتی، سب میں اس کا نام پیش پیش تھا۔ ایسے بدمزاج کو بیٹی دینے سے انکار کیا تو کیا برا کیا۔ بلکہ شاداں کنوارپن کی آگ میں جھلستی رہنے کے باوجود بے حد خوش تھی کہ ایسے لوفر کے پلے نہ پڑی ۔ کنواری رہنے میں تو پھر بھی آس تو تھی کہ کبھی تو بھاگ کھلیں گے، اور جو ایسے کے پلے پڑ جاتی تو زندگی دوزخ بن جاتی اور اس سے فرار کی کوئی راہ بھی نہ ہوتی ۔

جمن اماں کے کہنے پر شاداں ہر جمعہ کو پابندی سے چراغ جلا کر مسجد میں رکھتی رہی، نہ تو اندھیری رات نے اس کے قدم روکے، نہ چھاجوں برستے پانی نے اس کی راہوں میں بندھ باندھے ۔ اس رات بھی جب پانی کے سوا اور دوسری کوئی شے دکھائی دیتی ہی نہ تھی، اور ستے نے بھی اس کی راہ روکی تھی، وہ چراغ جلانے میں کامیاب ہو گئی تھی ۔ جانے کیوں جمن اماں کی عبادت اور دعاؤں پر اسے پورا بھروسہ تھا ۔ کوئی کہتا تو وہ ایک حد تک خود اپنے وجود سے انکار کر دیتی، مگر جمن اماں کی دعائیں ۔۔۔؟ وہ یہ گناہ کیسے مول لے سکتی تھی کہ ان کے خلوص پر ذرا بھی شک کرے ۔

یہ آخری جمعہ کی بات تھی کہ گاؤں میں ایسی واردات ہو گئی کہ کسی کے

کانوں میں ایسی بھنک بھی کبھی نہ پڑی ہوگی۔ بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے کہ جوئے کے داؤ پر کسی شریف باپ نے اپنی کنواری بیٹی کو لگا دیا ہو؟ مگر ایسا ہوا اور سب نے دیکھا کہ ہوا ـــــ بات صرف اتنی سی ہوئی کہ اس دن مرزا جی کے پڑوسی کریم الدین کی بیٹھک میں ایسے ہی گپ شپ کی محفل جمی۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی گپ بازی چلتی رہی۔ پھر کریم میاں جو جوئے کے ایسے رسیا تھے کہ گویا کوئی شرابی شراب کا بھی ہوگا، بول اٹھے "ارے یار ذرا دو دو ہاتھ ہو ہی جائیں"۔ ان کا مطلب پتوں سے تھا۔ ایک زمانے میں مرزا جی خود بھی ایسے کھیلوں کے بڑے رسیا تھے اور اس وقت تک نہ اٹھتے جب تک جیب سے پائی پائی نہ جھڑک جاتی ـــــ مگر اب عمر کے ساتھ وہ ذرا بجھ بھی گئے تھے۔ ان کے کھیل کا جوانی میں عجیب ہی طور تھا، یا تو ایسے ہارتے کہ خالی پھٹک رہ جاتے یا اس طرح اٹھتے کہ سب کی جیبوں کی کھنکھناہٹ ان کا مقدر بن جاتی۔ آج بھی انہوں نے بہت نانا کی، مگر جب کریم میاں اور دو چار ساتھیوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا ہی لیا تو ناچار بیٹھ گئے۔ وہ بہت زمانے کے بعد کھیل رہے تھے مگر ہر بازی ان ہی کے ہاتھ پڑ رہی تھی، یار لوگ تسہ پر تسہ دیے جا رہے تھے، اور یہ پرانے دنوں کی یادیں تازہ کیے جا رہے تھے اسی دم بھاری بھاری قدموں کی آواز نے سب کو سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کیا۔ دروازے میں پردے کی طرح چھا کر رہ جانے والا اور کوئی نہیں فتو تھا۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ نمبری غنڈہ ہونے کے باوجود فتو کی سب سے یاری تھی، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈر کے مارے کسی کی ہمت ہی نہ تھی کہ اس کی طرف سے مونہہ پھیر کر گزر سکتا۔ لوگ اس سے نہیں ڈرتے تھے، اپنی عزت کو ڈرتے تھے۔ اور تو کسی نے نہیں، لیکن مرزا جی نے اسے دیکھ کر ناگواری

سے پتے زمین پر پٹخ دیئے اور بولے "اچھا تو کریم میاں میں چلا۔"
"بیٹھو بھی، ایسی بھی کیا گڑبڑ ہے؟" کریم میاں نے کہا۔
مرزا جی پھر بھی بڑھے ہی گئے تو فتو بڑی بے تکلفی سے بولا "کھیل ادھورا چھوڑ کر جانا تو بچوں کی سی بات ہے مرزا جی، آئیے اب ہوتی جائے کچھ ۔۔۔"
مگر پھر بھی مرزا جی بڑھتے ہی گئے، تو ایک ساتھی نے ایک فقرہ کھینچ مارا "اصل میں بھاگنے کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔ مقابلے پر اب فتو آ گیا ہے نا!"
اب مرزا جی رہ نہ سکے۔ الجھ کر بولے، ہونہہ میں اور اس کل کے لونڈے سے بھاگوں؟"
فتو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا "تو آ ہی جاؤ شاہ جی، ابھی دیکھے لیتے ہیں کہ کل کا کون ہے اور آج کا کون؟"
مرزا جی اس تہیے سے بیٹھے کہ اس کو ہرا کر چھوڑوں گا، اور فتو ادھار کھائے بیٹھا تھا کہ اسی نے تو آنتوں میں میری بے عزتی کی ہے۔ بدلہ نہ لوں تو فتح خاں نام نہیں۔
اب پانسہ پلٹ گیا تھا اور مرزا جی پٹا پٹ ہارے چلے جا رہے تھے پہلے جیب کی ساری نقدی نکلی ۔۔۔ پھر گریبان میں بندھے ہوئے سونے کے بٹن پھر کلائی پر بندھی گھڑی، انگلی میں جگ مگ کرتی انگوٹھی ۔۔۔ پھر آخری بازی جس میں فتو نے انہیں للکارا "ارے شاہ جی یہ سب کیا ہے؟ ہاتھ کا میل ہی نا؟ کوئی ایسی قیمتی چیز داؤ پر لگاؤ نا کہ کھیل کا کچھ مزہ بھی آئے؟"
فتو اور مرزا جی کے مقابل آ جانے پر باقی سب نے اپنے پتے پھینک دیئے تھے اور اب پرانی شاہی لڑائیوں کی طرح بس دو جنگ جو آمنے سامنے

ایک دوسرے سے لوہا لیے جا رہے تھے۔

غصے سے پھنکارتے ہوئے مرزا جی نے اس یقین کے ساتھ چیخ کر کہ جیسے بازی ان ہی کے ہاتھ ہوگی، کہا "اب میں اپنی بیٹی کو داؤ پر لگاتا ہوں۔ لے دیکھ لے!"

اور جیسے ہی پتے زمین پر گرے، سب آگے اس طرح جھکے کہ سب کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔

ایک دم پوری محفل میں، قبرستان کی سی خاموشی چھا کر رہ گئی۔

دوسرے ہی لمحے فتو خوشی سے چیختا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ "میں جیت گیا — میں بازی جیت گیا۔"

کریم الدین اس کے پیچھے لپکے۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اسے روکو — ارے خدا کے لیے اسے روکو — مرزا جی، یہ کھیل کی بات تھی، کوئی حقیقت تھوڑی تھی کہ بیٹی اس کے حوالے کر دی جائے" کریم الدین کہے جا رہے تھے۔

سب نے بڑے اچنبھے سے دیکھا کہ مرزا جی ٹس سے مس نہ ہوئے اور سب نے دوسرے اچنبھے کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ فتا مرزا جی کے گھر میں گھسا، کبوتر کی طرح سہمی ہوئی شاداں کو گھسیٹتا ہوا باہر تک لایا اور اپنے اونچے گھوڑے پر بٹھا کر یہ جا وہ جا۔

موج میں آکر فتے نے گھوڑے کو دلکی چال پر ڈال دیا، اور خود مزے میں گانے لگا۔ "آج تو میں دولہا بن گیا — ارے میں دولہا بن گیا۔ اجی دولہا جی — ارے دولہا جی۔"

شاداں سہمی ہوئی فاختہ کی طرح گھوڑے کی پیٹھ سے چپک کر رہ گئی تھی۔
چلتے چلتے فتے کا گھر آگیا۔ اس نے للکار کر شاداں سے کہا "میں ابھی آتا ہوں، بھاگنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا۔ ہاں ۔۔۔" اندر جا کر اس نے اپنا بڑا سا پگڑ نکالا۔ سرمئی سلک کی قمیض، چوخانے کی بوسکی کی تہبند نکالی، اور بڑے ٹھاٹھ سے مونہہ ہاتھ دھو کر نیا جوڑا زیب تن کیا اور پھر شاداں کے پاس آکر بولا "آج یاروں کے مزے ہیں ۔۔۔ دولہا بنے ہیں ہم ۔۔۔ اور تم، تم دلہن بنوگی، بیوی جی! اور اپنے بھونڈے مذاق پر وہ خود ہی مونہہ پھاڑ کر ہنس دیا۔ شاداں کا دل دہل کر رہ گیا۔ عطر کا ایک زوردار بھبکا آیا اور فتا اُچھل کر پھر گھوڑے پر آبیٹھا۔
رات کی آمد آمد تھی، چار دن سے بارش بوند بھر بھی نہ برسی تھی، تو شام بھی نکھری ستھری اور دھلی دھلائی سی تھی ۔۔۔ اور رات تو بہت ہی سہانی تھی۔ دوسری بار گھوڑا ایک ندی کنارے رکا اور فتے نے بڑے پیار سے شاداں کو بھی اتار لیا۔ شاداں کا دل پھر زور سے اُچھلا "اب وہ گھڑی آگئی، اس نے لرز کر سوچا ۔۔۔ مگر وہ گھڑی ٹل گئی، کیوں کہ فتے نے خود بھی پانی پیا اور شاداں کو بھی موتی سا جگمگاتا پانی پلا کر، پھر سے سفر جاری رکھا ۔۔۔
بھرے گاؤں میں میلا لگا تھا۔ گھوڑے کو اپنے ایک پہچان والے کے پاس کھڑا کر کے فتّے نے جیب میں اڑسی ہوئی سرخ ترڑی دستی نکالی جو نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھر شاداں سے بولا "ایک اچھا سا جوڑا پسند تو کر لو دلہن بی بی۔" شاداں پھر لرزی۔ مونہہ سے کچھ بھی نہ بولی۔ فتے نے خود ہی سب سے بھاری اوڑھنی اور گھاگھر خریدلی۔ دوسری دوکان سے مانگ میں بھرنے کی چمکی، چوڑیاں، ایک دوکان سے نقلی موتیوں کا پورا زیور پھر ایک اور

دوکان سے پان کا پورا سامان اور ہونٹوں کے لیئے مسّی، سب ہی کچھ خرید ڈالا، اور پھر گانے لگا "آج تو یاروں کے مزے ہیں، دُلہن کے ہاتھ کا پان کھائیں گے۔"

گھوڑا پھر دلکی چال چل رہا تھا۔ اندھیرا کسی جگہ گہرا ہو جاتا تو شاداں لرز لرز جاتی "آخر وہ گھڑی آ ہی گئی۔" جانے اندھیرے کیوں وسوسوں کو جنم دیتے ہیں۔ مگر ایسے بہت سے موڑ آئے اور گئے، اور شاداں لرزتی رہی کب وہ گھڑی آتی ہے۔ کب ـــ کب ـــ کب ـــ اب اس کا جی اس قدر گھبرا اٹھا تھا کہ نہ چاہ رہی تھی کہ جلد سے جلد وہ گھڑی آکر ٹل بھی جائے کہ اس کے دھڑ دھڑ دھڑکتے دل کو قرار آجائے، مگر فتّے کی تیاریاں پوری ہونے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔ ایک سنار کے ہاں گھوڑا روک کر اس نے شاداں کے لیئے چھم چھم کرتی پائلیں خریدیں، سونے کے کنگن اور چاندی کے بالے لیے۔ جگہ جگہ رک رک کر نہ جانے کتنا سامان اس نے خریدا کہ ایک پوٹلی سی بن گئی۔ شاداں ایک لاش کی طرح گھوڑے سے جڑی بیٹھی تھی۔ اب اس کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ اگر اسے موقع ملتا تو بھی شاید ہی بھاگ سکتی۔

اب زندگی میں رہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ بھاگنے کی سوچتی۔

پھر ایک جگہ اور گھوڑا رکا فتّے نے ایک دوکان سے کھانے پینے کے لیے ڈھیر سا سامان خریدا۔ پھر ایک جگہ اور گھوڑا رکا اور ـــ شاداں کا دل نئے سرے سے دھڑک اٹھا۔ مگر وہ تو پوٹلی نیچے گری تھی جسے اٹھانے کے لیے فتّو نے گھوڑا روکا تھا۔

رات بھیگ رہی تھی اور گاؤں کی تمام تر روایتی خوب صورتیوں کے ساتھ

اپنا نشہ تیز کر رہی تھی ـــ بھوک، نیند، خوف و ہراس، اب ہر ہر جذبہ شاداں کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ پہلے تو ہر بار گھوڑے کے رکنے پر شاداں خوف سے کانپ کانپ جاتی تھی کہ "لو وہ گھڑی آ ہی گئی" مگر اب وہ بے حد مطمئن انداز سے گھوڑے پر بیٹھی ہوئی تھی، یوں جیسے زندہ ہی نہ ہو۔ پھر گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے ملگجے اندھیرے کے باوجود شاداں کو یہ احساس ہوا کہ یہ راستے اس کے جانے پہچانے ہیں۔ یہ گلیاں، یہ کھیت، یہ گھر ـــ اور ایک آخری موڑ پر آتے ہی وہ چیخ پڑی ـــ" ارے، یہ تو میرا ہی گاؤں ہے، یہ تو میری ہی مسجد ہے۔"

فتّے نے گھوڑا روک لیا۔ اپنی گلی کی مانوس خوشبو سونگھتے ہی شاداں کے گئے حواس لوٹ آئے تھے۔ اور بے خوفی اور خوشی نے گویا اُسے بھلا ہی دیا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ وہ بچوں کی سی خوشی اور بے خوفی سے بولی۔" ارے فتّو تو نے مجھے میرے گھر پہنچا دیا ـــ تو نے تو......"

"ہاں ـــ" فتّو بڑی بے پروائی سے بولا" یاروں کا اصول ہے کہ کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتے۔"

اور وہ اسی ترنگ میں گھوڑے پر کود کر ایک چلے کو گاتا ہوا جانے لگا۔" آج تو اپن دولہا بن گئے ـــ آج تو......"

شاداں کا دل ایک عجیب سے غم اور ہمدردی سے بوجھل ہو اٹھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے لپکی اور کہنے لگی "مگر فتّو یہ تو سنو، پھر تم نے یہ ڈھیر سا سامان کس کے لیے خریدا تھا؟"

فتّو نے گھوڑا روکی ذرا رو۔ ۔ اور بولا ـــ میرے دل سے دولہا بن جانے کی اور تجھے دلہن بنا لینے کی آ... تم تو نہیں ہو گئی نا۔ ڈھکوسلوں سے بھی کبھی

کبھی جی کو بہلایا جاتا ہے۔"

اس نے گھوڑا بڑھایا ہی تھا کہ شاداں لپک کر گھوڑے کے سامنے آ گئی۔ فتو بھی کچھ نہیں بولا۔ شاداں بھی کچھ نہیں بولی۔ بس فتو نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جہاں اپنا پاؤں زمین پر رکھا تھا، وہاں کی تھوڑی سی مٹی اٹھا کر شاداں نے اپنی مانگ میں بھر لی۔

آج پانچواں اور آخری جمعہ تھا۔

ماتم

ریشماں گھٹا کی طرح لہراتی ہوئی آئی اور بہار کی طرح ہنسنے لگی۔
اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔
مراد جھنجھلا گیا "یہ گھنگھرو بجانا تم بھی کرے گی یا نہیں؟"
ریشماں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی "گھنگھرو! سہاں گھنگھرو لیے پھر رہی ہوں؟"
اس نے حیرت سے اپنے خالی ہاتھ مراد کے آگے کر دیئے۔
"بڑی بھولی بنتی ہے ریشماں" مراد نے اس کا مہراجی کی طرح ٹھنڈا ٹھنڈا گلا پکڑ لیا "یہ — یہ تیری ہنسی ہے نا؛ اس میں گھنگھرو بھرے پڑے ہیں۔"
"چل ہٹ" وہ ذرا شرما کر پرے ہٹ گئی "تجھے شرم نہیں آتی؛ مجھے ہاتھ لگاتا ہے۔"
اچھا؛ میری شرم لگانی ہے؛ جیسے خود بڑی شرم والی ہے۔ وہ اس دن

متھارتے متھارتے میں میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اب کدھر گئی تھی تیری شرم؟"

ریشماں نے پھر گھنگھرو بجائے "وہ ہاتھ تو سدا ہاتھ میں رکھوں گی۔ تو نے خود ہی تو ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے کہ ساتھ نبھاؤں گا اس میں کاہے کی شرم؟"

مراد بپکا "تو پھر اس میں کاہے کی شرم؟ اس نے اس کے گلے میں پڑی ہوئی ہیکل کو زور سے جھلا دیا۔

ریشماں پھر ہنستی ہنستی دوھری ہونے لگی — مراد کھسیانا ہو گیا۔

"اری تو ہنستی کاہے کو ہے ری؟"

"تیرے آس پاس آئینہ تو ہے نہیں — دیکھ ذرا اپنی پگڑی کھل کھلا کر کیسے پیچھے دم کی طرح لٹک رہی ہے۔ بے چارے کو کام میں اتنی بھی تو سدھ نہیں" وہ پھر بجنے لگی۔

"ارے واہ رے مولا۔ ان لڑکیوں کی ہنسی کا بھی کوئی جواب نہیں۔ میں کہوں اگر میرا پگڑ کھل بھی گیا تو اس میں ہنسی کی کون بات ہوئی —؟"

ریشماں نے منہ چڑایا "ہنسی کی کون بات ہو گئی؟" — بتاؤں؟ ارے پیچھے پلٹ کر تو دیکھ۔ دم لگ گئی ہے تیرے دم — سچ مچ کا بندر معلوم ہو رہا ہے۔"

وہ آگے ہی بھاگ کھڑی ہوئی کہ یقینی مراد مارنے کو لپکے گا۔ مراد لپکا، دو قلانچوں میں ہی اسے جا لیا اور دبوچ کر بولا۔

"معلوم ہے کام میں اپنی سدھ بدھ کیوں گنوا بیٹھا ہوں؟ اس واسطے کہ دام آئیں گے تو لگن ہوگا۔ لگن ہوگا تو دلہن ملے گی۔ اور دلہن بھی کیسی؟ یہ مصری جیسی۔

اب بول، پھنسے گی؟ اے ری ریشو بول نا پھنسے گی؟"

ریشماں نے زور لگا کر خود کو چھڑا لیا۔ "دادا رے تو تو سچ مچ کا پہلوان ہے۔ ارے چھوڑ میری بانہہ ـــ"

مراد نے اسے دونوں ہاتھوں پر سر سے اونچا اٹھا لیا اور بھاگتے بھاگتے لاکر چھکڑے میں پٹخ دیا۔ سر سراتی گھاس کے بستر میں وہ اندر ہی اندر دھنس گئی۔ اک دم وہ چلایا۔

"مر گیا، بابا آرہا ہے" اور وہ سرپٹ دوڑتا ہی چلا گیا۔

ریشم نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ کندھے پر پڑی چادر سنبھالتا ہوا بابا سچ مچ اسی کی طرف تو چلا آرہا تھا۔

ریشماں اندر ہی اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی ـــ بابا سیدھے سیدھے چھکڑے کے پاس آکر رکا اور گرج کر بولا۔

"اب بولوں تیری ماں سے جا کر؟"

ریشماں نے ڈر کر سر اٹھایا، "تجھ سے کئی مرتبہ کہا کہ باہر مت پھرتی رہا کر۔ اری چار دن کو تو خود ہی شادی ہو جائیگی کیوں مری مرتی پھرتی ہے؟ اب سے دیکھوں تجھے مراد کے ساتھ ـــ ٹانگیں توڑ دونگا۔ ہاں ـــ"

ریشم پھرتی سے کودی اور پیچھے پلٹ کر دیکھے بنا بھاگتی ہی چلی گئی۔ بوڑھے نے نگاہوں میں ایک باپ کا سا پیار بھر کر اسے دور تک جاتے دیکھا اور پھر گھر میں داخل ہوگیا۔

گھر میں تو مراد نے یہاں وہاں سارے بکھیڑے پھیلا رکھے تھے۔ بابا غصے میں آکر سدا یہی کہتا۔ "ناحق کو میں نے تیرا نام مراد رکھا۔ تو تو بالکل نامراد ہے" اس نے سامنے

پڑی ٹوکری کو زوردار لات ماری، "پاگل کہیں کا۔ یہ اتنی اتنی کپچیوں سے اپنا بھیا بنانے بیٹھا تھا؟ میلوں ٹھیلوں میں لے جا کر بیچے گا اور پھر شادی رچائے گا۔ جیسے شادی اتنی آسانی ہی سے ہو جاتی ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس انداز میں کہنا شروع کیا جیسے سارا گاؤں اس کی داستان سننے جمع تھا۔" ارے شادی کتی مانڈ کے دیکھو، گھر کہتا کھول کے دیکھو۔ جاڑے پانیوں ہیں، برساتوں میں ٹپکنے کے مارے ذرا گھر، چھت، کھپریل کھول کر دیکھو اور پھر دیکھو نیئیں نیئں کر کے بھی کتنا پیسہ اٹھ جاتا ہے اور ایسے ہی شادی کا حال ہے۔ ذرا شادی مانڈ کر تو دیکھو ـــ زیور، جوڑی بنگڑی کھانہ دانہ، نہاری پانی، کپڑا لتا، اجیر پہناوں اڑھاؤں اور یہ الو کا ڈربہ کھلونے بنا بنا کر بیچ رہا ہے کہ شادی کرے گا ہونہہ ـــ یہ لکڑی کے ٹکڑے ـــ اس نے مزید خوش میں آکر زور دار لات جھاڑی ـــ ایکدم چیں چیں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے لپک کر بڑے اچنبھے سے لکڑی کی چڑیا اٹھالی جانے مراد نے اس میں کیا کل بھر دی تھی کہ وہ ہاتھ کا دھکا لگنے سے چیں چیں بول پڑتی تھی ـــ وہ دل ہی دل میں خوشی سے پھول گیا ـــ

"ارے میرا مرادو تو بڑا کاریگر نکلا۔ یہ بجنے والی چوں چوں کرتی چڑیا تو مزے میں چار چار آنے میں بک سکتی ہے۔ ارے جوڑ جماؤ کرنے سے ہی پیسہ بنتا ہے۔ باوا مر گئے، یہی تو ان کی نصیحت تھی کہ بیٹا قطرہ قطرہ کر کے ہی تالاب بنتا ہے۔ سچ تو ہے۔ ۴۔ ۵۔ ایکڑ زمین کی آمدنی اور اس میں نامراد کب تک شادی کے لئے بیٹھا رہے؟ کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں تو ہلاتے ہی پڑیں گے۔ ریشم جیسی لڑکی یوں مفت تھوڑی ہی مل جاتی ہے۔ اور پھر اس کی بیوہ ماں کے دل میں بھی تو ارمان ہوں گے ہی کہ بیٹی کی شادی ایسی کروں گی، ویسی کروں گی ـــ دو ہزار کا مطالبہ ایسا کوئی بڑا تو

نہیں۔ دودھ پور والے زمیندار تو اپنے بیٹے کے لیے ریشماں کی ماں کو چار ہزار تک دینے پر راضی ہیں مگر وہ جانتی ہے ماکہ دنیا میں پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں۔ خون کی اصلیت نسلوں کی شرافت اور خاندان کی بھی تو اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے ۔۔ بھلا بابا نوردین کا سا شریعت خون خاندان گاؤں بھرے میں کہیں تو مل جائے۔ نسل کا سچا، قول کا پکا ۔۔ جان جائے مگر اپنی بات سے نہ جائے ۔۔" وہ خوشی خوشی اپنے ہی گن گانے لگا۔" روپیوں کے ڈھیر کوئی آگے لگا دے مگر کیا مجال جو سچائی سے پھر جائے۔ ارے ایسی بانی، ایسی عزت یوں ہی بیٹھے بٹھائے تو ہاتھ نہیں آجاتی کہ بابا نوردین بھرے مجمع میں جسے اٹھ بول دے وہ اٹھ جائے، جس کو بیٹھ بولے بیٹھ جائے۔ ارے بابا نوردین کو لوگ یوں مانتے ہیں کہ وہ چم چم چمکتے دن کو رات بول دے تو سب بولیں.... ہماری نظر کا پھیر ہو گا، واقعی یہ تو رات ہے بابا

بابا کوئی جھوٹ تھوڑے ہی بول سکتا ہے!"

مراد ہاتھ میں رندہ لیے بڑی دیر سے بابا کی باتیں سنتا مسکراتا کھڑا تھا، وہ ہنس ذرا کھنکار کر آگے بڑھا۔ بوڑھے نے پلٹ کر دیکھا، اپنے چہرے پر مصنوعی غصے کی چھاپ لگا کر بولا۔

"کیوں بے کتنی بار تجھے سمجھایا کہ شریعت کے باہر مت جا۔ وہ ریشم ابھی تیری کون ہوتی ہے؟ ۔ کیوں چھیڑخانیاں کرتا ہے اس سے؟ تیرے باپ کی سب عزت کرتے ہیں۔ اس کی بات مانتے ہیں ۔۔ تو تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کہ من مانی مستی کرتا پھرتا ہے ۔۔؟"

مراد گھبرا گیا۔" وہ بابا میں نے ۔۔ میں نے تھوڑی کچھ بولا ہے بتایا۔ میں

لکڑی گھستا بیٹھا تھا کہ وہ خود ہی آئی اور مجھے دیکھ کر ہنسنے لگی۔ بھلا لکڑی گھسنے میں پکڑ کھل گیا تو میں بندر بن گیا۔؟"

" بندر بولنے کی سزا تو نے یہ دی کہ غیر چھوکری کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر چھکڑے میں لا بٹھا۔ وہ تیری لگتی ہی کون ہے ابھی؟ "

مراد نے حیرت سے سوچا " وہ میری کون لگتی ہے؟ ارے جس کے دم سے مجھے زندگی زندگی لگتی ہے، جس کی ہنسی میرے جیون میں پھول بکھیر دیتی ہے، جو آتی ہے تو لگتا ہے سچ مچ بہار آگئی، جو پل بھر میں چلی جاتی ہے تو لگتا ہے کہ یہی تو پت جھڑ اور اداسی کی رت ہے جسے ایک دن نہ دیکھوں تو موت کی سی ویرانی من میں بس جاتی ہے اور جو ایک جھپک بھی نظر آجائے تو مانو دھنک سی دل میں چھوٹ جاتی ہے جس کی اداسی میری مردانگی کو للکارتی ہے اور جس کی ایک مسکراہٹ مجھے خدا سے قریب کر دیتی ہے خداوندا تو نے اپنے اس حقیر بندے کو کس نیکی کے صلے میں ایسی نعمت سے نواز دیا؟ اسی کے بارے میں بابا پوچھتا ہے کہ وہ میری کون لگتی ہے بابا وہ میری کوئی ہو یا نہ ہو زندگی ضرور ہے۔" اس نے کہنا چاہا مگر بابا کے بگڑے تیور دیکھ کر سر جھکائے کھڑے رہنے میں ہی خیریت سمجھی۔

بابا۔ بادل۔ بارش "

بوڑھا ہنسا " ارے خدا کا ہی تو سب سے بڑا احسان اس گناہ گار پر ہے کہ گھر ایسی کھائی میں واقع ہے کہ لاکھ بادل برس برس کر دھرتی کو جل تھل کر دیں میرے گھر میں بوند بھی نہیں چھکتی ان ساٹھ سالوں میں گاؤں میں کتنے سیلاب نہ آئے؟ کتنے پالے نہ پڑے؟ کتنی دھوپیں نہ تپیں؟ مگر بس خدا تھا کہ جس نے ہر لمحے اس گھر پہ اپنے سایے پھیلائے رکھے۔"

مراد جھلا کر بولا۔ "تو بابا مجھے کیا سنا رہے ہو؟"

میں کیا بنیا ہوں اس گھر؟ میں تو باہر سے کھلونے اٹھانے جا رہا ہوں جن پر میں نے رنگ روغن کیا ہے پانی سے کچا رنگ بہہ نہ جائے۔"

مراد واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کھلونوں کا ٹوکرا تھا۔ بابا پھر بولا۔ کبھی اس بڈھے سے بھی مشورہ لے لیا کر میری جان! وہ مسکرانے لگا۔ سائے میں سکھائے ہوئے رنگ زیادہ پکے ہوتے ہیں۔ باہر لے جا کر رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اپنا گھر تو خود خدا نے ایسا بنایا ہے......

مراد زور سے ہنسا اور بات کاٹ کر بولا۔ "بابا تمہارا گھر تو سچ مچ ایسا ہے کہ تم چاہو تو ڈاکوؤں کو پناہ دے دو اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ نہیں؟"

بوڑھے کے چہرے کا رنگ یک لخت بدل گیا۔ اس نے غور سے مراد کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں شک و شبہے کی کوئی پرچھائیں نہ تھی۔

اس دن پھر صبح سویرے سے ہی گاؤں بھر میں ہائے وائے مچی ہوئی تھی پچھلی رات پھر ڈاکہ پڑا تھا اور اب کی بار تو ڈاکوؤں نے زمیندار کی بہو کے سارے زیورات پر ہاتھ تو پھیرا ہی پھیرا، تجوری سے ساری نقدی بھی نکال لے گئے۔ یہ اپنی قسم کا چوتھا ڈاکہ تھا۔ ڈاکوؤں نے ہر بار اس صفائی سے ہاتھ چلایا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ اور تو اور ہر لمحے جاگنے اور چوکنے رہنے والوں کتوں کی بھی کوئی آواز کسی نے نہ سنی سارا گاؤں محو حیرت تھا کہ آخر ڈاکو کس قسم کے ہیں؟ اور آج تک ان کا کوئی ساتھی پکڑا بھی نہیں جا سکا تھا۔ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ مگر نتیجہ وہی صفر۔ گاؤں میں ہر طرف یہی ذکر تھا۔

"ارے بھئی سنا رات پھر ڈاکہ پڑا۔"

"ارے بھائی کچھ مالوم پڑا رات پھر ڈکیتی آئی تھی۔"

"ارے چاچا رات چوری ہو گئی۔ زمیندار کا تو سارا گھر صاف ہو گیا۔"

کوئی دبی زبان سے بولا۔ "مگر یار ڈاکو ہیں بڑے بھلے مانس۔ غریبوں کو تو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ چار ڈاکے پڑے اور چاروں پیسے والوں کے ہاں۔ بھگوان ان کا بھلا ہی بھلا کرے۔"

"ہاں ہاں بھگوان بھلا کرے۔" کوئی جھک کر بولا۔

"آج کو امیروں کے ہاں ڈاکے ڈالتے ہیں، کل کلاں کو نقدی زیور ختم ہو جائے گا تو ہم غریبوں کے گھر پیچھے پڑیں گے نہیں ان کا تو پتہ لگنا ہی چاہیے۔"

بڑی پھن پھنا ہرٹ گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔

ایک ڈاکوؤں کی حمایت میں تھی کہ اچھا ہی ہے غریبوں کا برا تو نہیں چاہتے۔ دوسری خلاف تھی کہ ڈاکو ڈاکو ہی ٹھہرے، کیا بھروسا؟ چلتے چلتے پتا چلا کہ یہ ڈاکوؤں کی ٹولی شہروں شہر تباہ کرتی۔ اب گاؤں گاؤں گھوم رہی ہے۔ اور ڈاکوؤں کا سردار جو ایک سکھ ٹیا ہے اسے پکڑنے کے لئے حکومت نے پانچ ہزار روپے کا انعام بھی مقرر کیا ہے۔ کئیوں کے منہ میں یہ سنتے ہی پانی بھر آیا۔

"ارے کیا اچھا ہو کہ اپنے ہاتھ سردار جی چڑھ جائیں مزے آجائیں بس۔"

مرادر مدہ گھستے گھستے مستقبل کے خواب دیکھنے لگا۔ پانچ ہزار میں سے دو ہزار گئے شادی میں، باقی بچے تین ہزار، اس میں کیا مزے ہو سکتے ہیں کہ بس ۔۔۔ کیوں بابا؟" بابا نے غصے سے اسے دیکھا" یہ انعام ونام سب حرام ہوتا ہے معلوم؟ اپنی قوت بازو سے کمایا ہوا پیسہ ہی حلال اور اسی میں برکت بھی اور مزہ بھی۔۔۔

بابا تم پرانے زمانے کے آدمی ہو اور پرانے طریقے پر سوچتے ہو ـــــ
مجھے ذرا سن گن مل جائے تو سب کو پکڑا دوں اور شوٹ میں ،، اس نے منہ سے سیٹی کی سی آواز نکالی ـ اور اس مزے میں منہ سے شوٹ میں کیا کہ بوڑھا ہنس دیا ـ لیکن اس کی ہنسی قطعی بناوٹی تھی ـ

مراد باہر گیا تو بابا دھیرے سے اٹھا اور لادنیوں کی طرف چلنے لگا ـ بابا پر اب برے دن آ گئے تھے تو کیا ہوا؟ تھا وہ پرکھوں کا رئیس ـ باپ دادا بڑے رنگیلے تھے ـ گھروں کو اجاڑنے میں لوگ باگ کسی کو بھی بدنام کر دیں مگر سچ تو یہ ہے کہ عورت ذات ہی گھر بگاڑتی اجاڑتی ہے ـ ناچنے گانے والیوں کے پیچھے سارا دولت گئی ـ تھے پٹھان، فقیری آ گئی تو بھی اسی آن اور شان سے جیئے کہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا ـــ سب مٹ مٹا کر اب یہ پہاڑ سا گھر اور چار پانچ ایکڑ زمین ہی باقی رہ گئی تھی ـ مگر گھر بھی کیا گھر تھا کہ بس واہ واہ چلتے چلے جاؤ تو اور چھور کا پتہ ہی نہ ملے کہ کہاں سے شروع ہوا اور ختم کہاں ـ کھیتی سے پیسہ اتنا آتا تھا کہ رکھنے کو تجوریاں کافی نہ ہوتیں تو نیچے ہی نیچے زمین کھود کر لادنیاں بنائی گئیں ـ سال بھر اناج اور غلہ اور پیسہ اسی میں سینت کر رکھا جاتا تھا ـــ نیچے اترنے کو سیڑھیاں تھیں اوپر نکل کر تختے کو ڈھک دو تو کسی کے باپ کو بھی پتہ نہ چلے کہ نیچے بھی ایک دنیا آباد ہے ـ

بابا نے دھیرے سے لادنی کا تختہ ہٹایا ـ بھاری قفل ہٹانے سے زنجیروں کا چھناکا ہوا اور دوسرے ہی لمحے دبی دبی سی آوازیں ابھریں جیسے کوئی بندوق کھڑکھڑائے ـ

"میں ہوں دارے" بابا نرم آواز میں بولا اور کھڑکھڑاہٹ دب گئی ـ چراغ جلا

کر بابا نے سیڑھیوں پر روشنی کی اور اندر ہی اندر اترتا چلا گیا۔ آگے چل کر گھر جیسا گھر تھا ایک طرف بڑے بڑے دیگچے کھڑک رہے تھے۔ تنور جل رہا تھا۔ گوشت بھوننے کی مہک چاروں اور بھوکوں کو پریشانی بھر رہی تھی۔ بابا نے چادر کو کندھے پر برابر کیا اور پتھر پر ٹک کر بولا۔

"دارے پولیس نے پانچ ہزار کا انعام نکالا ہے۔"

"سو تو میں جانوں ہوں چاچا۔ پر تیرے ڈرنے کی کوئی بات نہیں اتنا بھروسہ تو واہ گرو پر ہے کہ تیرے اس گھر پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

بابا جھلا گیا "میں کون سے گھر کی بات کرنے چلا ہوں؟ اور گھر میں ہے ہی کیا جو آنچ آئے تو سچ مچ بے وقوف سکوٹیا ہے دارے۔"

رام ناتھ برہمن، جو ٹولی کا نائب سردار تھا۔ نرمی سے مسکرا کر بولا۔

"تو چاچے کھول کر بتانا معاملہ کیا ہے؟۔ بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔"

شریف میاں، جو اس پارٹی کا سب سے کمین آدمی تھا مگر دل کا بڑا صاف۔ دبی آواز میں بولا۔ "کسی بات کا خیال نہ کرنا بابا۔ سب اپنے ہی آدمی ہیں۔"

"بات کوئی خاص نہیں ہے جی۔ بس وہ پانچ ہزار کی رقم نے سبھوں کے منہ میں پانی بھر دیا ہے۔ اور سویرے کچھ ایسی اڑتی بھرتی میں نے سنی ہے کہ لوگوں کو یہ شک ہے کہ ڈاکو ہیں اسی گاؤں میں ورنہ اتنی جلدی جلدی ڈاکے نہ پڑتے۔"

دارا ہنس کر بولا "سو تو ٹھیک ہے جی، ہیں تو اسی گاؤں میں تب؟"

"مجھے یہ ڈر ہے" بابا رک رک کر بولا "کہ مراد کو پتا نہ لگ جائے۔ وہ تو ویسی ہی شادی کے لئے پیسوں پر باؤلا ہو رہا ہے۔" بابا پیر سے زمین کھیکرنے لگا۔

دارا اٹھ کر اندر گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد بعد کر کے پانچ توڑے لا کر بابا۔

کے پیروں کے پاس پھینک دیے بابا نے چونک کر سر اٹھایا:۔

"یہ کیا؟"

"پانچ ہزار کی تھیلیاں ۔" دارا سادگی سے بولا ۔

بابا چیخ اٹھا،، رشوت ؟ میرے احسان کا یہ بدلہ، کمینے!"

اور اس نے لپک کر دارے کا گلا پکڑ لیا۔ دارا مسکراتا رہا بابا نے اسے گھور کر دیکھا اور ہاتھ چھڑا لیا ۔

"دارے، قسم ہے پیدا کرنے والے کی اگر میں تجھے پناہ کا وچن نہ دیتا تو اس وقت میرے سامنے تیری لاش تڑپتی نظر آتی ۔ ذرا بارش کی وہ اندھیری رات سوچ جب میں تنہا جنگل سے گھر آ رہا تھا تیرے بیٹے کو زہریلے ناگ نے کاٹ لیا تھا تیرے ساتھی بھوک اور تھکن سے بوکھلائے ہوئے تھے، تو ماںتا کی آگ سے جھلس رہا تھا قسم ہے مولا کی میرا تجھ سے کوئی ناطہ نہ تھا۔ اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ تو ڈاکوؤں کی ٹولی کا سردار ہے جس نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا رکھا ہے مگر تو نے مجھے راستہ روک کر "چاچا" کہہ کر پکارا، مجھ سے التجا کی کہ ہمیں پناہ دے ۔ میں نے اپنی منزل کھوٹی کی، تیرا ساتھ دیا، تجھے اور تیرے ساتھیوں کو گھر لایا۔ اور تیرے بیٹے کا خدا کا نام لیکر زہر اتارا اور اب تجھے مسلسل حرام کے پیٹ کی طرح چھپائے جا رہا ہوں تو کیا اس لئے کہ تو مجھے رشوت دے ؟ اس کی آواز بھرا گئی ۔

" قسم ہے مولا کی، تو بے حد ذلیل ہے! اور وہ منہ ڈھانپ کر بچوں کی طرح رو دیا۔ آج تو نے میرا ایمان ڈگمگانے کی کوشش کی ہے دارے ۔ اور وہ بھی پانچ ہزار کی حقیر رقم کے لیے ۔

قسم ہے مولا کی دارے، پانچ ہزار تو کیا پانچ لاکھ بھی ان قدموں کو نہیں

ڈگمگا سکتے۔ میرا دادا پانچ ہزار منی بائی کے صرف ایک بھاؤ پر نچھاور کر دیا کرتا تھا۔ ہائے دارے تو نے کیا کیا؟ تو نے اپنے چاچے کا جی دکھایا۔ وہ سر پیٹنے لگا۔ اور پھر بیٹے کے اچھا ہو جانے کے باوجود بھی تو یہیں پڑا رہا تو نے اپنی پول کھول دی اور ہر راز مجھ سے کہہ دیا۔ اور یہ بھی مجھے یاد ہے کہ میں سب کچھ شربت کا گھونٹ بنا کر پی گیا۔ صرف اس لیے کہ میں پٹھان تھا۔ قول کا پکا۔ ایک بار میں نے تجھ سے کہہ دیا تھا۔ چل چل، گھر چل میں حفاظت کروں گا۔ میرا خدا تیری حفاظت کرے گا۔ تو میں اس قول کو نبھاتا رہا اور تیری اصلیت جاننے کے باوجود تجھ سے سچا پیار کرتا رہا کہ یہی پٹھانوں کا شیوہ ہے کہ مہمان کو اولاد کی طرح سمجھیں۔ مگر آج تو نے مجھے ذلیل کیا۔۔ مجھے ۔۔۔۔۔۔

دارا بابا سے لپٹ گیا "چاچا، مجھے معاف کر دو چاچا مجھے معاف کر دو بڑے چاچا، اچھے چاچا۔ واہگورو جانتے ہیں کہ میرے من میں کھوٹ نہ تھی۔ میں نے تو یہ سوچ کر روپئے دیئے تھے کیا میرا بیٹا۔ کیا تمہارا بیٹا، سب ایک ہیں اس کی شادی کے لیے یہ تو میں نے حقیر رقم دی تھی۔ چاچا۔ اچھے چاچا۔ میں بھلا یہ ہمت کر سکتا تھا کہ تمہیں رشوت دیتا؟ اور بھلا چاچا احسان کا بھی مول ہو سکتا ہے؟ چاچا مت رد ایک بار۔ بس ایک دفعہ مجھے سچے دل سے معافی دے دے۔ بول دو چاچا کہ، جا میں نے تجھے معاف کیا"

بابا سرخ آنکھوں سے گھور کر بولا۔ "میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔ مگر تو آج ہی رات کی تاریکی میں یہاں سے چلا جا۔ اب میں تیرا ساتھ نہیں نباہ سکتا"

دارے نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے "چاچا اتنی بھی بے مروتی مت دکھا۔ دیکھ لے میرا بیٹا ابھی تک کتنا کمزور ہے کہ ڈاکے میں میرا ساتھ تک نہیں دے رہا ہے ورنہ

میرا شہوا یہ نہیں ہے کہ ایک ایک جگہ اتنی دیر تک پڑا رہوں۔ دارا اس کے ہاتھوں کو پکڑے پکڑے گھگھیانے لگا، اور میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا چاچے، میں بزدل نہیں۔ میں تو بادل کی طرح اڑتا پھرتا ہوں۔ جانے کیا بات ہے چاچا۔ تجھ سے میرا دل ایسے مل گیا ہے کہ سوگند کھا کر کہوں ہوں کہ جانے جی ہی نہیں چاہتا۔ ورنہ ڈاکو کا بسیرا ہی کیا!،،

بابا رکھائی سے بولا و تو نے میری ایسی ذلت کی ہے کہ میں اپنے وچن سے باہر ہو رہا ہوں۔ اتفاق سے تجھے جس رات میں گھر لایا تھا اس رات بھی میرا بیٹا گاؤں سے باہر منڈی گیا تھا آج بھی باہر ہے۔

دارا جیسے پتھر کا بن گیا۔ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بس آنکھوں ہی آنکھوں میں بابا سے التجائیں کئے گیا۔ بابا پھر بھی کچھ نہ بولا تو وہ بڑے رسان اور بڑی سچائی سے بولا۔

"تیرے احسانوں کا بدلہ بس یوں اتر سکتا ہے کہ میں خود کو اپنے آپ تیرے بیٹے کے ہاتھوں میں دے دوں کہ لے جا کر دے مجھے پولیس کے حوالے اور بن جا پانچ ہزار کا مالک۔" یہ وار سب سے کاری تھا۔ بابا نے چمک کر دارے کو دیکھا ــــ بڑی دیر بعد بولا۔

"تو تو دھوپ کے سمان ہے جو وقت پر ہی ٹلتی ہے تجھے کون ٹلائے؟ میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں۔ جان جائے بھلے سے تجھ پر آنچ نہ آئے گی۔"

دارے کی ٹولی کو سن گن مل چکی تھی کہ شیخ اعظم جو گاؤں کے دوسرے نمبر کے رئیس تھے کے ہاں کی پرانی کپاس بکنے والی ہے جو ہزاروں کی رقم تک جاتی ہے بس اس کے بعد ٹولی کوچ کرنے والی تھی۔ لیکن یہ طے نہ تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ دارے کو بابا پر اپنی جان سے زیادہ بھروسہ تھا۔ بابا کے چلے جانے کے بعد

وہ بڑی دیر تک گم بیٹھا رہا۔ پھر جا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ گذشتہ زندگی کا ایک ایک دن سامنے آ گیا۔ قسمت کے کھیل نیارے ہیں ایک دن وہ بھی باعزت آدمی تھا۔ چار میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ہاں پیسے روپے سے اتنا بڑا نہ تھا اور اسی وجہ سے آج مکن کا روپ تھا۔ اس کی اکلوتی لڑکی روپ کور جو دمکتا چاند تھی، محض غربت کے مارے بیاہی نہ جا سکی۔ نسبت اچھے گھرانے میں طے پائی تھی۔ مگر پیسے کی کمی کی وجہ سے شادی میں ڈھیل پڑی رہی تھی۔ گاؤں کے بڑے جاگیردار کا روپ کور کی عزت سے کھیل جانا پھر دارا سنگھ کے ہاتھوں، جاگیردار اور بیٹی، دونوں کا قتل اس کو سب کچھ یاد آیا اور اس نے ایک کراہ کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں اور پھر ڈاکو بن جانا لیکن صرف امیروں کے گھر ہی ڈاکے ڈالنا ـــــ اور اب کتنے برسوں سے وہ نامی ڈاکو بن چکا تھا کہ حکومت کی کتنی کوششوں پر بھی وہ ہاتھ نہ آ سکا ہاتھ تو کیا آتا، سراغ تک نہ مل پاتا۔ اتنے برسوں میں وہ نیکی نام کی چیز سے بالکل اجنبی بن چکا تھا مگر آج بابا کے سلوک نے اسے پھر پرانی دنیا میں پہنچا دیا۔ اس نے عجیب احمقانہ بات سوچی ـــ

کاش روپ کور زندہ ہوتی ـ بھلے سے بابا مسلمان ہے تو کیا ہوا؟
وہ اپنی بیٹی کو اس کے بیٹے سے بیاہ دیتا۔ اتنا بھلا سمدھی کیسے ملتا ہے؟
سمدھی؟ وہ غم کے ساتھ مسکرا دیا ـ روپ کور اس کی ایک ہی بیٹی تھی ـ اب اس کے بعد وہ بے برگ و بار تھا ـ اب اس کی زندگی میں یہ خوشی کبھی نہ آ سکے گی ـــ کہ وہ کسی کو "سمدھی" کہہ کر گلے لپٹ جاتا ـ

وہ اٹھ بیٹھا ـ اس کا دم باہر نکلنے کو ہو رہا تھا سائبان سے نکل کر اس نے پھولی اور جھانکا ـ بابا نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا ـ

"مولا میری نیک نامیوں کی لاج رکھیو۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

مراد گاؤں باہر منڈی سے ابھی ابھی لوٹا تھا اور اب وہ ریشماں جھکڑے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مراد کے لہجے میں خوشی بھری پڑی تھی۔

"اب اپنی شادی بہت جلد ہی ہونے والی ہے ریشم۔"

کیوں، کہیں سے رقم ہاتھ لگ گئی کیا؟" ریشماں طعن سے بولی۔

"یہی سمجھ لے بس۔ پھر تو، جو سچ مچ ریشم کی بنی ہوئی ہے، ....

گٹھری بن کر میرے گھر آجائے گی۔ پچی ریشماں تیرا نام جس نے بھی رکھا ہے۔ بڑا اچھا رکھا ہے۔ قسم مولا کی تو بالکل ریشم ہے۔ سر سے کر تا ریشم۔" وہ مذاق سے دیدے پھیلا کر بولا۔

شادی کی رات تجھے کچ کچ چبا کر کھا جاؤں گا۔"

"ہٹ بے شرم!"

بڑا آیا کھانے والا ـــــ ابھی جا کر بولوں بابا سے؟"

"اتنی ہمت ہے تجھ میں" وہ ہنسا۔ پھر بد چانے کو بولا،

اچھا ریشم پری یہ تو بتا تیرے لیے چڑھاوا کیا کیا لاؤں؟"

"تیرا سر۔" وہ دانت نکوس کر بولی۔

"سو تو تیرا ہے ہی ـــــ کہو تو ابھی قدموں میں رکھ دوں؟"

وہ پکی عاشقی کے موڈ میں بولا۔

لیکن ریشم بچوں کی طرح اس کے پیچھے پڑ گئی "بول نا پیسہ کہاں سے لایا ہے؟"

مراد سنجیدہ ہو گیا۔ "تو نے ڈھونڈی سنی نہیں، پولیس کی طرف سے؟ جو بھی

داراسنگھ کو پکڑے گا، پتا نشان بتادے گا اس کو پانچ ہزار روپیہ نقد انعام،،
ریشماں تضحیک سے ہنسنے لگی۔ ،،بڑا بے چارہ دارا کا پتا لگانے والا۔
وہ تو چھلاوہ ہے چھلاوہ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ ہوگا ابھی ابھی اسی گاؤں میں مگر
کیا مجال کہ پتا تو مل جائے کم بخت کا۔،،
وہ بھی سنہری سپنے ہی میں کھوگئی، سچ مچ پانچ ہزار کتنی بڑی رقم ہوتی ہے۔!
اتنا سارا سونا کپڑا۔ باپ رے، سب تو پہن بھی نہ سکوں۔،،
،، تو نماز تو پڑھتی ہے نا؟ وہ مولوی صاحب بن کر پوچھنے لگا۔
،، ہاں، پھر؟ ،،
تو تو نماز میں دعا کر کہ یا اللہ پاک آپ میرے مراد کو دارا کا پتہ بتادیجئے،،
ریشماں کھی کھی کر کے ہنسنے لگی،، ۔ تو خود ہی کیوں نہیں مانگ لیتا؟،،
وہ جھلا کر سر کھجانے لگا،، اری میں نے سنا ہے کہ جس چھوکری کی شادی
ہونے والی ہوتی ہے اس کی دعا مولا جلد سن لیتا ہے۔،،
وہ پھر ہنسنے لگی،، پھر تو میں دعا مانگوں گی مولا کرے مراد کو چور لے جائیں۔ مجھے
بے حد ستاتا ہے۔ اور وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔
مراد نے پائی پائی جوڑ کر اب تک کل ساڑھے چار سو ہی جمع کئے تھے۔ اگر اسی
رفتار سے رقم بنتی رہی تو میں اور ریشماں دونوں بڈھے ہو جائیں گے۔ اس کو بے
تحاشا ہونے والی ساس پر غصہ آنے لگا کہ دو ہزار کی پخ لگا رکھی ہے اور اس سے
زیادہ اپنے باپ پر کہ وہ اس کی بات مان بھی گیا۔ نہہ!۔ اس نے غصہ سے
تھوک دیا۔
اس دن اچانک ایسی واردات ہوگئی کہ مراد سناٹے میں آگیا۔ وہ کبھی کبھار

ہی گھر کی پیری ادھر جاتا تھا۔ اس دن کلہاڑی تیز کرنے وہ لارنیوں کی طرف جا نکلا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ لارنی کے سنبر پر بڑا سا قفل لگا ہے۔ حالانکہ گھر میں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں جسے چھپا کے رکھا جا سکتا۔ اس نے لارنی کو کھولنا چاہا تو اندر کی طرف سے دبی دبی باتوں کی، دیگچیوں کی، پکوان کی آوازیں آنے لگیں۔ مراد بچہ نہ تھا اور ادھر چند روز سے وہ جو بابا کو ہراساں دیکھ رہا تھا۔ وہ الگ اُلجھا دے میں ڈالنے والی بات تھی۔ اس کو سمجھنے میں دیر نہ لگی ـــ وہ الٹے پیروں واپس ہو گیا۔

رات کو بابا کو روٹیاں پکاتے دیکھ کر اس نے بات چھیڑ دی۔

"بابا میں کہتا ہوں تم بوڑھے آدمی کب تک روٹیاں تھوپتے رہو گے؟"

"تو کیوں نہیں سیکھ لیتا"ـــ بابا صفا بات ٹال گیا وہ ہنسا "میں سیکھ بھی لوں تو کیا ہوتا ہے۔ عورتوں کے کام عورتوں کو ہی سجتے ہیں۔"

"دو کام کرنے سے ہاتھ نہیں گھس جاتے۔ چل کھانا نکال، میں جبھی ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔"

مراد آسانی سے ٹلنے والا نہیں تھا۔ رکابیوں میں سالن نکالتے ہوئے بولا۔

"بابا اگر کہیں دارے کا پتا لگ جائے تو مزے ہی آجائیں۔"

"میں آگے بھی سنا چکا ہوں کہ یہ حرام کا پیسہ ہوگا۔ میں قطعی خرچ نہ خرچنے دوں گا تجھے۔ بس آگے بات نہ کرنا۔"

"اچھا بابا، فرض کرو ہمیں دارے کا پتہ لگ جائے اور ہم اس سے کہیں کہ اچھا بھائی ہم تیرا پتا پولیس کو نہیں بتاتے مگر تو خود پانچ ہزار دے دے تو؟"

بابا نے دھوپ میں بال نہیں سکھائے تھے۔ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے اس نے منہ اوپر تک نہیں کیا سر جھکائے جھکائے ہی بولا۔

"بیٹا اسلام نے محنت کی روٹی حلال رکھی ہے، کیوں غلط سلط باتیں سوچتا ہے؟"

مراد پھٹ پڑا "بابا مجھے معلوم ہے لادنی میں تم نے ڈاکوؤں کو چھپا رکھا ہے"

بابا اطمینان سے بولا "مجھے معلوم تھا کہ میرے بوڑھے چہرے کے نقوش راز کو راز نہ رکھنے دیں گے۔ مگر۔ وہ ایک لمحے کو رکا، وہ مجبور ہے ــــ!"

"کون مجبور ہے؟ وہ ڈاکو؟ ہزاروں کو بے گھر کر چکا اور کتنوں کی بددعائیں سمیٹی ہوں گی اور مجبور رہے!" مراد جل کر بولا ــــ

بوڑھا اسی اطمینان سے بولا "ہاں بیٹا ہم تم کیا سمجھ سکتے ہیں کہ کون کتنا مجبور ہے۔ قسم ہے مولا کی میں تو جب کبھی کسی چور کو دیکھتا ہوں، سوچتا ہوں کہ مولا جانے اس نے کن مجبوریوں کے تحت چوری کرنی سیکھی ہوگی۔ اپنے آپ سے کوئی ذلت مول لینا نہیں چاہتا بیٹا۔ خواہ مخواہ اسے پھنسواؤ گے" "میں نے کہا نہ بدل میں روپے لے لیں گے" مراد اطمینان سے بولا ــــ

"اتنا نیچ مت بن نامراد" بوڑھا پوری طاقت سے چلایا۔

آدھی رات کو لادنی کا قفل کھڑکھڑایا اور بابا اندر کود کر بولا۔

"دارے اب تیری خیریت اسی میں ہے کہ چلا جائے۔ مراد کو سب پتا لگ گیا ہے۔ جوانی کا گرم خون ہے وہ پولیس کو خبر دے کر دم لے گا۔ اس کے تیور یہی بتا رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں تیری حفاظت سے پھروں اور اپنے مولا کے آگے شرمسار ہوں، خدا کے لئے چلا جا دارے"

دارے نے بڑے سمان سے چاچے کی پیٹھ سہلائی "فکر نہ کر چاچے

والا گرو کی کرپا ہے۔ دکھ نہ جھیل، جارات بہت چلی گئی جا کر سوجا۔ بابا کھڑکی تک آیا اور اک دم سناٹے میں آگیا۔ باہر سرگوشیوں میں ریشماں اور مراد باتیں کر رہے تھے میں کہتی ہوں مراد بابا کی بات سن لو۔ حرام کا پیسہ پنپنے نہیں دے گا۔ مولا کے لیے نہ جاؤ! رسول کی دھائی تمہیں!"

مراد رکے بغیر بولا " بابا تو پیغمبر ہوتے ہوتے رہ گیا اس کی بات مانیں لوں تو بس زندگی میں غم اور فکریں ہی نہ رہ جائیں میری منزل کھوٹی مت کر ریشم۔ میں نے اسی لیے تو رات کی تاریکی میں جانے کا طے کیا تھا کہ بابا نہیں ہے، تو اب تو آڑے آ رہی ہے میں نے اس لیے تجھے نہیں پکارا تھا کہ تو راستہ روکے میں نے تو اس لیے جگایا تھا کہ مجھے نہ دیکھ کر بابا یقینی تیرے گھر پوچھنے آئے گا۔ تو کہہ دینا کہ ہاں وہ کل رات کہہ رہا تھا کہ بہت فجر سے اٹھ کر منگل ہاٹ کو جاؤں گا" اور وہ بڑھ گیا۔ اک دم کھڑکی میں سے بابا للکارا۔ "رک جا مراد آگے نہ بڑھنا۔ مراد نے پلٹ کر دیکھا۔ کھڑکی میں بابا کا ہیولا کھڑا نظر آ رہا تھا اس نے کچھ غصہ اور کچھ حقارت سے باپ کو دیکھا اور زن سے آگے نکل گیا بابا چلایا۔ " مراد میں کہتا ہوں رک جا۔ دارا میرا مہمان ہے۔ وہ میری پناہ میں ہے۔" مراد نے گھوم کر دیکھ اور تیزی سے بولا " فالتو باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں بابا" بوڑھا چلایا۔ "میرے پٹھانی خون کو جوش نہ دلا مراد۔ بات کے پیچھے میں دھن دولت اولاد تک سے لڑ سکتا ہوں۔ پلٹ آ" مراد نے ایسی فضول بات کا جواب دینے تک کی ضرورت نہ سمجھی۔ بوڑھا تپ گیا وہ تیر کی تیزی سے پیچھے پلٹا اور دارے کی چم چم چمکتی بندوق اٹھا کر نال کھڑکی سے باہر نکال دی۔ دارا لپکا "کیا کرتے ہو بابا؟ یہ کیا حماقت ہے چلیے؟ بندوق اندر کر لو" ۔

"دعائیں" رات کے سناٹے میں ایک آواز گونجی اور بابا نے بڑی آہستگی سے بندوق دارے کے ہاتھوں میں تھمادی۔

چاچا چا تم ہوش میں ہو نہیں ہو ۔۔۔" دارا بھبکا

آوازیں اس کے دماغ میں سنسنا رہی تھیں۔ وہ بالکل پرسکون تھا

"ہاں۔ میں ہوش میں ہوں میں جانتا ہوں مراد میرا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ بھی جوان بیٹا مگر میرا وعدہ؟ میں بیٹے کی موت دیکھ سکتا ہوں، وعدہ کی نہیں۔ دارے، وہ رکا، اب تم چل ہی دو تو بہتر ہے اب بات چھپی نہیں رہ سکتی"

بڑے پرسکون انداز میں وہ چوپائے سے گزر رہا تھا کہ خوف کے مارے زرد کانپتی ریشماں کھڑی نظر آئی اک دم بوڑھے کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح ڈول گیا زندگی بھر کے سارے غم اس ایک لمحے میں اس کے بوڑھے چہرے پر سمٹ آئے۔ ریشماں کو گلے لگا کر چیخ چیخ کر رو دیا۔

"بیٹی آج تو بیوہ ہو گئی"

اس کے آنسو کسی طرح رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

سیپ

ساری گڑبڑ شاہد میاں نے پیدا کی، بیٹھے بٹھائے حوض میں تیرتے ہوئے پھول پر لپک پڑے اور بے چاری چاند کو مجبور کیا کہ کسی بھی طرح وہ پھول لادے جو ہوا کے ہلکورون کے ساتھ لچکتا لچکاتا ان کے شوق کو اور تیز کر رہا تھا چاند نے کنارے پر بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ لمبا کیا، مگر پھول بجائے ہاتھ میں آنے کے ایک جھونکے کے ساتھ اور دور ہو گیا اور چاند نے ذرا جو جسم آگے جھکایا تو دھڑام سے حوض کے اندر!

چھوٹے نواب اپنی بھونڈی آواز سے کوئی عاشقانہ شعر گنگناتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بار یونہی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا اور بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ چاند اپنے بالوں کا پانی نچوڑتے ہوئے کھڑی تھی۔ لباس سارا کا سارا پانی میں بھیگ کر بدن سے چپک رہ گیا تھا، اور جسم

کی ہر ادپنجائی نچائی یوں واضح ہو رہی تھی کہ بس! کالے کالے بالوں کی لٹیں گورے گورے گالوں پر جھم گئی تھیں۔ سانس اتھل پتھل ہو گئی تھی۔ ایسے میں چھوٹے نواب کی آواز سن کر اس نے سر اونچا کیا اور دوسرے ہی لمحے بوکھلا کر سرپٹ اندر بھاگی، اور جلدی میں ڈوپٹہ بھی وہیں چھوڑ گئی۔ چھوٹے نواب کے ہاتھوں سے کبوتر اڑ گیا۔ روایتی پرندہ نہیں، بلکہ سچ مچ کا کبوتر، جس کے پیروں میں محبت بھرا پیغام باندھ کر وہ اسے سطوت جہاں کی حویلی پر اڑانے والے تھے۔ ڈیوڑھی کے چھوٹے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے جو زنانے میں کھلتا تھا، چاند نے یونہی پلٹ کر پیچھے دیکھا، پانی سے بھیگا ہوا وہ گداز اور لچک دار جسم، جسم سے چپکا ہوا وہ تنگ لباس، لباس سے ٹپکتی ہوئی وہ بوندیں اور پھر اس کا وہ گھبرایا اور شرمایا ہوا چہرہ! جس پر گھبراہٹ اور شرم سے گہری گہری لالیاں دوڑ گئی تھیں چھوٹے نواب اسی لمحے چاند پر مر مٹے۔

"بوا کہانی سناؤ" شاہد میاں حسب معمول رات کو بستر پر جاتے ہی بولے۔ امیروں کے چوچلے بھی خوب ہوتے ہیں۔ شاہد میاں جن کی عمر بمشکل چھ سات برس رہی ہوگی اصولوں کے اتنے پابند تھے کہ جب تک رات کو کہانی نہ سن لیتے انہیں نیند نہ آتی۔

حسب معمول چاند نے اپنی وہی پرانی کہانی شروع کی "ایک غریب مزدور کی بیٹی تھی، بے چاری بہت غریب تھی۔ ماں باپ کوئی نہ تھا۔ ایک دن بھیک مانگتی مانگتی وہ ایک ڈیوڑھی پر آنکلی اور نواب صاحب نے اس پر رحم کھا کر اسے پاس رکھ لیا۔"

"کتنی بڑی تھی وہ؟" شاہد میاں پوچھ رہے تھے۔

"بس یہی تمہارے اتنی ہوگی، چھ سات برس کی۔ محل میں وہ بڑے آرام سے رہ رہی تھی۔ آخر کار وہ بڑی ہوگئی۔ اسے کوئی دکھ نہ تھا کوئی رنج نہ تھا. نواب صاحب اور ان کی بیگم بڑے آرام سے رکھتے تھے اسے۔ اب جب کہ وہ بڑی ہوگئی، نواب صاحب نے سوچا کہ اس کی شادی کر دیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے لائق کوئی لڑکا ہی نظر میں نہ جچتا تھا۔ کیونکہ بہت وہ حسین اور بڑی اچھی تھی۔ کہنے کو تو وہ ایک غریب مزدور کی لڑکی تھی مگر خدا نے اسے اتنی پیاری شکل دی تھی کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔" چاند نے شاہد میاں کے پلنگ کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی، پھر تھوڑی دیر رک کر بولی۔

"یوں تو وہ بھکارن تھی مگر دیکھنے میں شہزادی سی لگتی تھی۔ اس کے حسن اور نزاکت کی وجہ سے کئی لوگ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ نواب صاحب بھی بیچارے سوچتے کہ کس سے اس کی شادی کریں۔"

خر۔ خر، شاہد میاں خراٹے لے رہے تھے۔ چاند نے سینے تک دلائی کھینچ دی اور خود پلنگ میں لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔

صبح کا واقعہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا اور اس کی سانس یوں پھولنے لگی، گویا وہ ابھی حوض میں سے گر کر نکلی ہو۔ اسے یاد آنے لگا۔ اس کا حوض میں گر جانا، چھوٹے نواب کا ایک دم غیر متوقع طور پر آجانا، اس کا جلدی میں ڈوپٹہ چھوڑ کر بھاگ جانا، چھوٹے نواب کے ہاتھ سے کبوتر کا اڑ جانا اور پھر اس کا مڑ کر دیکھنا۔ وہ منظر، کہ چھوٹے نواب کا ہاتھ کبوتر کے اڑ جانے سے یونہی پھیلا رہ گیا ہے اور وہ دم بخود اسے یوں گھور رہے ہیں کہ پلک تک جھپکانے کی سدھ نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں شاہد میاں کو ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔

نہ وہ مردانے میں چلنے کی ضد کرتے نہ یہ سب ہوتا۔ قصور تو میرا ہی ہے، گئی ہی کیوں۔ میرے مولیٰ" وہ گھبرا گئی، وحشت سے اس نے ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں۔ اسے ایسا لگا کہ چھوٹے نواب اب تک اسے گھور رہے ہیں۔ اس نے اپنا دوپٹہ منہ پر تانا اور وہیں شاہد میاں کی پائنتی کو لیٹ گئی۔

چھوٹے نواب کی ٹکٹکی جو ٹوٹی تو انہیں خیال آیا کہ ان کے ہاتھوں میں کبوتر تھا، جو ہاتھ سے چھوٹ کر منڈیر پر جا بیٹھا ہے۔ سطوت جہاں کے نام جو محبت نامہ لکھا تھا، اسے توڑ مروڑ کر وہیں پھینکا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

چھوٹے نواب اپنی "جنرل نالج" کے لیے پورے محل میں مشہور تھے چپا چپا کو کتنے مہینے کا حمل ہے۔ صنوبر کا حمل کون سی دائی نے گرایا، شرافت جنگ ہر تیسری رات کو اپنے کمرے پر کیوں نہیں رہتے، اماں جان نے کون سی نئی چھوکری نوکر رکھی ہے، مالن بی کو نوکری سے کیوں الگ کر دیا گیا، روشن بی نے کون سا گرم جوشاندہ پیا تھا کہ چپ چپاتے تیسری ہی خوراک میں ان کا پیٹ گر گیا تھا اماں جان نے زنانے کو مردانے سے ملحق کیوں نہیں رکھا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن کا علم کسی کو ہو نہ ہو چھوٹے نواب کو ضرور ہو جاتا۔ مگر آج انہیں معلوم ہوا کہ وہ اب تک اندھیرے میں رہے ہیں، کہ ڈیوڑھی میں ایسا چاند چھپا چھپ چمک رہا ہو اور وہ اس کی ٹھنڈی کرنوں سے مستفید نہ ہوئے ہوں۔ "بہت تمارے کی" انہوں نے خود کو گالی دی۔ کروٹیں بدل بدل کر جب وہ بہت ہی پریشان ہو گئے تو انہیں چمپا یاد آئی۔

"وہ چھوکری کون ہے جو حوض پر کھڑی تھی صبح"۔ انہوں نے بہت ہی بے

تعلق سے پوچھنا چاہا۔ مگر چھپائے ان کے دل کی لگن چھپی نہ رہ سکی، وہ بھی تو ایک ہی مویشی خانے کی داروغہ تھی، معلوم تھا کون سا جانور کون سا چارہ کھاتا ہے۔ ٹال کر بولی۔

"اے میں کیا جانوں، ہوگی کوئی۔"

ہوگی کوئی کیا معنی "وہ گرجے۔ "تو زنانے میں نہیں رہتی؟"

"اے حضور زنانے میں تو ہزاروں ہی پڑی ہیں، مجھے کیا معلوم حضور کس کو پوچھتے ہیں۔"

چھوٹے نواب ٹھنڈے پڑے "ارے وہی جس کے لمبے لمبے بال ہیں گورا گورا رنگ ہے۔ ارے کیسی کیا پہچان بتاؤں یہ سمجھ لے پھلوارن جو پھول لاتی ہے نا گلاب کے، انہی میں ایک پھول سمجھ لے۔"

چمپا جل بھن کر بولی۔

"ارے میاں وہی بھکارن چھوکری ہے جسے بڑے حضور نے دس برس پیچھے پال لیا تھا۔ سنتے ہیں کسی غریب مزدور کی بیٹی تھی، پتہ نہیں ماں باپ کدھر مرکھپ گئے تھے۔ بھیک مانگتی مانگتی ڈیوڑھی پر آئی تھی۔ صورت اچھی تھی کم عمر تھی، حضور کو ترس آ گیا بس رکھ لیا۔ حضور کی زندگی ہو، بڑا نرم دل ہے حضور کا"، وہ ایک دم نواب حضور کو دعائیں دینے پر تل گئی۔

"دس برس" چھوٹے نواب کی آنکھیں پھیل گئیں" مگر ان دس برسوں میں تو وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آئی۔"

بلی کے منہ میں چھیچھڑہ دے دو تو پھر کھینچنا آسان بات نہیں چمپا جھلا کر بولی۔

"حضور نے خیال نہ کیا ہوگا، چھپن دفعہ تو دلہن شاہزادی نے اسی کے ہاتھ سے حضور کے لیے پان بھیجے ہوں گے۔ ساری ڈیوڑھی میں تو بھاگی بھاگی پھرتی تھی۔ اب ادھر تین برس سے اماں جان نے مردانے میں اس کا آنا جانا موقوف کرادیا ہے۔" اور چمپا معنی خیز ہنسی ہنس کر چپ ہو گئی۔

"اچھا تو یہ وہی چاند ہے۔" چھوٹے نواب نے دس برس پہلے کی چھوٹی سی چاند کو اپنی آنکھوں میں لا بٹھایا۔

چمپا اور اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی "اچھا تو یہ وہی چاند ہے، وہی چاند ہے۔ تو اب اس میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔ حرام زادی اماں جان کے دل پر بھی خوب چڑھی ہوئی ہے۔ کوئی تو خوبی نہیں بس اتنی ضرور ہے کہ محل کی اور چھوکریوں کی طرح کُدکڑے نہیں لگاتی پھرتی، مردوں کو اپنی چھب نہیں دکھاتی۔"

چھوٹے نواب نے یونہی بے خیالی میں چمپا کو دیکھا، مگر در اصل وہ چمپا کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

"چھوٹی صاحبزادی کے وقت بھی اتنے بر نہ ڈھونڈے ہوں گے حضور نے جانے رانڈ کے پاس کیا جادو ہے۔"

چھوٹے نواب کی آنکھیں تو چمپا ہی کو دیکھ رہی تھیں مگر چمپا کے پیکر میں چاند مسکرا رہی تھی۔ چمپا نے انہیں بے ہوش دیکھ کر آخری چرکا دیا۔

"سینکڑوں بر پلٹائے گئے، اب کہیں جا کر اس کی بات پکی ہوئی ہے۔"

"تو اس کی شادی ہو رہی ہے کیا؟" چھوٹے نواب ہڑبڑا کر بولے۔

"اور کیا عود دان میں ڈال کر دھونی لیں گے اس کی۔" چمپا سٹر سٹر کرتی چلی

گئی۔تب بھی چھوٹے نواب کو یقین نہ آیا کہ چودھویں کا چاند اتنی جلد غروب ہو سکتا ہے۔ بادلوں میں چھپ جانا اور بات ہے، اور اک دم ڈوب ہی جانا! چھوٹے نواب تو یہ جانتے تھے کہ چاند کو بڑھنے میں اگر پندرہ دن لگتے ہیں تو گھٹنے میں بھی اتنے ہی لگیں گے۔

"بوا کہانی سنائیے" شاہد میاں نے حسب معمول بستر پر جاتے ہی چاند سے فرمائش کی۔

حسب معمول چاند نے اپنی وہی پرانی کہانی سنانی شروع کی جو وہ کئی دنوں سے سناتی چلی آرہی تھی۔ چاند کو اس ادھوری کہانی کے سوا اور کوئی کہانی یاد نہ تھی۔ چڑے چڑیا، راجہ رانی، طوطا مینا کی کہانیاں نہ اسے سنائی گئیں نہ یاد کرائی گئیں، اس لیے وہ روزانہ اپنی ہی کہانی سناتی جاتی، جو اس نے ڈیوڑھی میں اپنے بارے میں سن رکھی تھی۔ شاہد میاں بھی ایسے بانگڑو تھے کبھی یہ نہ کہا کہ بوا روزروز ایک ہی کہانی سنائے جاتی ہے۔

ایک تھی لڑکی۔۔۔۔۔ غریب مزدور کی لڑکی تھی، اس لیے بے چاری۔۔

۔۔۔ شاہد میاں اونگھ رہے تھے۔

"نواب صاحب بھی بے چارے سوچتے کہ کس سے اس کی شادی کریں۔"

خُر خُر خُر شاہد میاں سو گئے تھے، چاند نے سینے تک دلائی کھینچ دی۔

"روزانہ اسی مقام پر آکر شاہد میاں کی آنکھ لگ جاتی ہے اور میری کہانی ہے بھی تو اتنی ہی۔ اگر ایک آدھ دن ان کی آنکھ نہ لگے اور وہ پوری ہی کہانی سننے پر تل جائیں تو اس کہانی کا انجام کیا کروں گی میں۔"

چھوٹے نواب کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی، دن کا چین تو خیر اڑ ہی گیا

تھا۔ چاند کے بارے میں انہیں پتہ چلا کہ ہے تو غریب کی بیٹی مگر عزت کو یوں۔ لیے لیے پھرتی ہے جیسے نازک آبگینہ ہو، دھکا لگا اور گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ چھوٹے نواب کا خیال تھا کہ غریبوں کی عزت کوئی چیز نہیں ہوتی اور یہ بھی کم از کم ان کا کھا کر ان سے تو یہ نمک حرامی نہ کرے کہ اپنے آپ کو چھپائی پھرے۔ اور پھر چاند کے بارے میں تو انہوں نے یہ سنا کہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی، یوں سنبھل کر قدم اٹھاتی ہے گویا کانچ کے محل میں چل رہی ہو کہ ذرا زور سے قدم پڑا اور یہ محل چٹخا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی پارسائی اور نیک نامی کے سبب سے اماں حضور اور ابا حضور دونوں کے زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ جہاں محل کی اور دوسری چھوکریاں معاشقے لڑاتی پھرتی ہیں، چاند کا یہ حال ہے کہ کسی مرد کی صورت دیکھتے ہی ایسی حواس باختہ ہو جاتی ہے کہ پسینہ چھوٹ جاتا ہے، اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ گھبرائے گی ضرور مگر ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گی۔ چھوٹے نواب کو اسی سلسلے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اصطبل کے داروغہ نے ایک بار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا تو چاند نے اتنی زور سے اس کے ہاتھ کو کاٹا تھا کہ منہ میں گوشت کا نچہ آگیا تھا۔

"پھر یہ سونے کی چڑیا ہتھے کیسے چڑھے"؟ وہ کسمسائے "مگر تم بھی اپنے چچا کے بھتیجے نہیں اگر چاند کی ناک نہ گھسوا لی اپنے آگے"۔ اس دن کے بعد سے چھوٹے نواب کو ایک بار بھی تو چاند کی جھلک نہ دکھائی دی۔ انہیں آج سارا غصہ شاہد میاں پر ہی آتا تھا۔

آخر یہ حرامی پلا ضد کیوں نہیں کرتا کہ مجھے باہر والے حوض پر لے چل۔" اور پھر چاند کی شادی کی خبر سن کر تو گویا دل پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

"کس کا چاند، اور چاندنی کس کے نصیبوں میں آئی" انہوں نے اپنے لیے چوڑے پلنگ کو دیکھا۔ ہائے ہائے چاند کا پھول ایسا جسم، اور وہ تڑپ کر رہ گئے۔

زنانے میں جانا قیامت صغرا سے کم تو نہ تھا۔ یہ بھی ایک عجیب مصیبت تھی اماں جان نے جو قاعدہ بنا رکھا تھا، اس سے کوئی ایک انگل بھی ادھر ادھر نہ ہٹ سکتا قیامت صغرا چھوڑ قیامت کبریٰ ہی کیوں نہ آجاتی، مگر اب تو جانا ضرور تھا۔ پریشان حال پریشان صورت، بال بکھرائے اک دم چھتے اٹھائے وہ اندر داخل ہو گئے۔ اماں جان الگ بد حواس، پوچھنے کی مہلت بھی نہ ملی کہ "اے میاں دن دہاڑے زنانے میں کیوں گھس آئے"، کہ ایک دم چھوٹے نواب پھٹ پڑے۔

"میں نے سنا ہے آپ نے چاند کی بات پکی کر لی ہے"۔

اماں جان بوکھلائی ہوئی تھیں، کیا جواب دیتیں۔

"مجھے تو آج پتہ چلا۔ کم بخت بڑے درجے کا شرابی، آوارہ۔ تین تین عورتیں تو گھر میں گھسا رکھی ہیں۔ چاند یتیم ہے، یسیر ہے، بیکس ہے، لاوارث ہے تو کیا آپ پر اس کا یہی حق ہے کہ جان بوجھ کر کنوئیں میں جھونک دیں۔ ویسے اگر کنوئیں میں جھونکنا ہی ہوتا چنداں مضائقہ نہ تھا مگر.... اور آواز ان کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

اماں جان پر آج اپنے بیٹے کی غربا پروری اور نرم دلی کی حقیقت کھلی "پالی نوازیوں، باندی بہودڑیوں پر کیسے جی کڑھا رہا ہے میرا بچہ" شرمسار ہو کر آنکھیں جھکا لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ویسے جھوٹ موٹ ہی یہ پوچھ بیٹھتیں کہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے تو جناب کو دم دباتے ہی بن پڑتی۔ مگر چھوٹے نواب

کی صورت پر اس وقت وہی غم چھایا ہوا تھا جو کسی عزیز کی میت کو کاندھا دینے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

چاند پیک دان اٹھائے چلی آرہی تھی، نگاہیں اٹھا کر جو دیکھا تو سامنے ہی چھوٹے نواب یوں پریشان حال اور غم زدہ صورت بنائے بیٹھے تھے گویا چمپا کی موت کی خبر لے کر آئے ہوں۔ (چھوٹے نواب کو چمپا سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا۔ ڈیوڑھی میں یہ بات بالکل عام تھی) اماں جان نے محبت بھری نظروں سے چاند کو دیکھا اور چٹ چٹ بلائیں توڑیں۔

"ہے ہے، میری بچی کا نصیبہ ہی پھوٹ گیا تھا، سمجھو وہ تو چھوٹے میاں ہوتے نہ بھدرہ پھوٹتا۔"

چھوٹے نواب نے حیران ہو کر اماں جان کی طرف دیکھا۔ چاند کی اس طرح والہانہ محبت کر رہی تھیں کہ کبھی گل بانو کی بھی نہ کی ہوگی۔ چاند نے کچھ نہ سمجھ کر چھوٹے نواب کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی وحشت اور چمک نظر آئی جو اس دن ڈوپٹہ چھوڑ کر بھاگ آنے والے روز نظر آئی تھی۔ ایک دم لجا کر اس نے خود کو دیکھا۔

"دوپٹہ تو میں اوڑھے ہوئے ہوں پھر یہ کیوں ایسی کوری کوری نگاہوں سے تاک رہے ہیں مجھے۔"

اس رات چاند کو کہانی سنانا بھی نہ سوجھا۔ بار بار رک جاتی اور شاہد میاں اسے ٹھیلتے "ہاں آگے کیا ہوا؟" وہ بار بار چونک کر اپنے آپ کو دیکھتی۔ پانی سے بھیگا ہوا جسم۔ جسم سے چپکے ہوئے کپڑے، کپڑوں سے

ٹپکتی ہوئی بوندیں۔ دوپٹہ حوض کی منڈیر پر پڑا ہوا، اور ایک دم چھوٹے نواب کے ہاتھوں سے کبوتر اڑ گیا۔

سطوت جہاں کے پاس سے جو کبوتر آیا تو چھوٹے نواب نے اس کی گردن ہی مروڑ دی۔ اتنے دنوں کی پیغام رسانی کا اسے یہی صلہ ملنے والا تھا۔ محبت نامہ پڑا ہوا کے جھونکوں سے کانپتا رہا اور چھوٹے نواب غصے میں ہاتھ ملتے رہے۔ چاند ایک جھلک دکھا کر چھپ گئی تھی، اور یہ اندھیرا ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اندھیرا دور ہو تو کیسے؟ ذہن نئی نئی ترکیبیں لڑاتا، مگر کچھ بس نہ چلتا۔ لیکن تھے کس چچا کے بھتیجے، سلامت جنگ کے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گلاب کے نیچے کی مٹی بھی خوشبودار ہوتی ہے، تو مٹی چھوڑ یہ تو خود ہی گلاب کا اپنا ایک حصہ تھے۔ سلامت جنگ نے کیا کیا عیش نہیں کئے تھے۔ بھتیجے میں کچھ نہ کچھ تو خوبو آنی ہی تھی چچا کی۔

اس دن کا زنانے میں جانا ایسا مبارک لگا کہ اماں جان کی ساری پابندی دھری کی دھری ہی رہ گئی، اور چھوٹے نواب کھلے بندوں آنے جانے لگے۔ کہاں تو اماں جان کا وہ کڑک دار آواز سے چلانا کہ زنانے میں بلا ضرورت کسی مردوئے نے قدم دھرا تو پاؤں کٹوا کر جلتے تیل میں ڈبا دوں گی، اور اب کہاں یہ دن کہ چھٹی، اٹھائی اور دھم سے اماں جان کے کمرے میں، اور اماں جان کو شک بھی کیوں ہوتا؟ سیدھے انہی کے کمرے میں تو آتے تھے وہ کسی سے چھیڑ چھاڑ کی بات سننے میں آئی نہ کسی کو بری بری نظروں سے گھورنے کی۔ یہ ضرور ہے کہ چھوٹے نواب کے کرتوت ان

سے چھپے نہ تھے۔ اگر چھپے ہی ہوتے تو دلہن شاہزادی اپنی جان کو روتی اپنے جالی دار کمرے میں اکیلی بڑی ایک بیٹے کے واسطے ترسا اور تڑپا نہ کرتیں اور ادھر چمپا اور صنوبر کے حمل نہ گرائے جاتے۔ دلہن شہزادی کو بانجھ قرار دیا گیا اور وہ ایک چاند سا بچہ جھلانے کی آرزو ہی کرتی رہتی تھیں مگر اس وقت تو اماں جان کو شک کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے چھوٹے نواب کی آنکھوں میں وہ تڑپ اور بے چینی دیکھ لی تھی جو چاند کے دکھ سکھ سے متعلق تھی اور وہ اس دن تو خود پر نازاں ہو گئی تھیں جب چھوٹے نواب کی آنکھوں میں چاند کے پیام کی بات کرتے کرتے آنسو چھلک آئے تھے کہ میری کوکھ سے بھی کیسے بیٹے نے جنم لیا ہے۔

ہاں ادھر ادھر لڑکیوں بالیوں میں بہت چہ میگوئیاں تھیں۔ سبھی کو یہ بات کھل رہی تھی کہ اماں جان نے آخر سب کو چھوڑ چھاڑ کے صرف بڑے بھائی پر سے ہی کیوں یہ پابندی ہٹالی۔ اماں جان کی آنکھیں بوڑھی ہونے سے دھند لا گئی ہوں اور وہ دیکھ نہ سکتی ہوں یہ اور بات ہے، مگر دیکھنے والی آنکھیں تو سات پردوں کو چیر کر دور کی خبر لاتی ہیں۔ چاند تو چھوٹے نواب کی آنکھوں سے ایسی خائف تھی کہ ایک بار گھبراہٹ میں شیشے کا وہ پیک دان ہی توڑ بیٹھی جسے بڑے حضور دلی سے لائے تھے اور جس میں آئینہ بھی لگا ہوا تھا کہ تھوک بھی دو اور صورت بھی دیکھ لو۔ چھوٹے موٹے چینی اور کانچ کے برتنوں کا تو ذکر ہی کیا، روزانہ شہید ہو رہے تھے۔ آنکھیں تو وہ بھی رکھتی تھی، سمجھ بوجھ بھی اچھی خاصی تھی اور پھر یہ تو وہ بھی دیکھتی تھی کہ چمپا اور صنوبر سارے زمانے میں کیوں ہدیہ

ملامت بنی ہوئی تھیں؟ مالن بی کیوں بلا الزام نوکری سے ہٹا دی گئی؟ اور یہ سارے کرتوت انہی چھوٹے نواب کے نہیں تو اور کس کے تھے۔

ایک ہاتھ سے بال برابر کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چق اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی چاند اماں جان کے بستر کی شکنیں صاف کر رہی تھی بے تعلقی سے بولے۔

"اماں جان کہاں ہیں؟"

چاند نے پلٹ کر دیکھا، چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ گھبرا کر اٹکتے اٹکتے بولی۔

"وہ بازو۔۔۔ بازو والے کمرے میں ہیں۔۔۔ کپڑے بدل رہی ہیں۔"

چھوٹے نواب کو وہ جھنجھنیا د آ گئے جو وہ چمپا کے بچے کے لئے خرید کر لائے تھے اور جنہیں چمپا کا بچہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے الٹ پلٹ کرتا تو اسی طرح اٹکتے اٹکتے جھن جھنایا کرتے تھے۔ چھوٹے نواب بھی اس لمحے ایک بچہ بن گئے۔ ان کا دل چاہا پھر سے اسی جھنجھنے کی جھنکار سنیں، بات چلانے کو بولے "تم اتنا کام کیوں کرتی ہو چاند؟"

چاند ہنس پڑی۔ (چھوٹے نواب کو چاندی کا وہ جھنجھنا یاد آیا جو شاہد میاں اب سے تین برس پیچھے بجاتے پھرتے تھے) مگر دوسرے ہی لمحے سہم سی گئی۔

"کام ہی کیا کرتی ہوں میں، اماں حضور مجھے کرنے ہی تو نہیں دیتیں، مجھے تو بیٹی بنا لیا ہے انہوں نے۔"

"اماں حضور کرنے ہی تو نہیں دیتیں۔ میری سنے تب نا، خود تیرے پاؤں میں تو چکر ہے، بیٹھنا تو جانتی ہی نہیں ۔۔ ۔۔" اماں جی تھک۔ اٹھا کر اندر داخل ہو چکی تھیں۔

چھوٹے نواب بوکھلا کر مڑے "اماں حضور۔۔ ۔۔" وہ جلدی جلدی بول گئے۔ "میں آج اس لیئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے کچھ کہہ سکوں، یعنی چاند کے بارے میں کچھ کہہ سکوں۔"

"نہیں بیٹا نہیں، میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ تمہارے ابا خود اسے ناپسند کرتے ہیں۔ میری چاند اوپر کی نہیں آئی کچھ، اللہ کے یہاں بھی تو جواب دینا ہو گا کہ کسی یتیم کو پالا تھا تو اس کے ساتھ کیا برابری کی۔"

وہ سمجھی تھیں کہ چاند کے بارے میں ہی کچھ کہا جائے گا۔ مگر چھوٹے نواب ہنس پڑے "نہیں اماں حضور۔ وہ بھلا چاند کے لائق کیا ہو گا۔ لیکن اس وقت میں اس بارے میں نہیں کہہ رہا تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ چاند کے لیئے آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں لیکن اصل وجہ تو آپ کو معلوم ہی نہیں۔"

اماں جان نے لاعلمی سے منہ تکنا شروع کر دیا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ چاند حسین تو ہے ہی، پیسہ بھی آپ کی وجہ سے بہت کچھ مل جائے گا۔ بغدادی قاعدہ اور قرآن تو پڑھتی ہو گی، انگریزی بھی تھوڑی بہت ہی پڑھا دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو بر کے لیئے اتنا پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ آج کل انگریزی کی کتنی قدر ہے۔"

"مگر پڑھائے گا کون؟" اماں جان ایک دم پوچھ بیٹھیں۔ کوئی غیر مرد آ کر پڑھائے، یہ خیال ہی جان لیوا تھا۔

چھوٹے نواب نے ہنس کر سر جھکا لیا "جہاں آپ نے چاند کو اپنی بیٹی کی طرح پالا کہ لوگ گل بانو اور چاند میں فرق تک محسوس نہیں کرتے وہاں میرا کیا اتنا بھی فرض نہیں کہ اسے تھوڑا بہت بڑھا ہی دوں۔ بے چاری کی زندگی سدھر جائے گی، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

اماں جان نے یہ لمبا سانس لیا، اور چاند نے گھبرا کر دیکھا کہ چھوٹے نواب کی آنکھیں بری طرح چمک رہی ہیں۔

"اے۔ بی۔ سی۔ ڈی"

چھوٹے نواب نے اپنے ہاتھ سے چاند کی انگلیوں میں قلم تھمایا اور چاند پوری کی پوری کانپ کر رہ گئی "آپ زمین پر رکھ دیجئے میں آ[illegible] گی۔"

چھوٹے نواب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے د[illegible] اور آگے پڑھانے لگے "سی۔ اے۔ ٹی۔ کیٹ۔

چاند ایک دم بول اٹھی "مگر مجھے انگریزی نہیں پڑھنا ہے کیا کروں گی میں پڑھ کے۔"

"چاند کو چاند جیسا دولہا ملے گا۔" چھوٹے نواب نے انگلی اس کے گال سے چھوا دی۔

چاند بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ چھوٹے نواب بے تعلقی سے پڑھانے پر تلے ہوئے تھے۔

"ام سے مون، مون کے معنی جانتی ہو چاند۔ چاند یعنی تم مون ہو۔" چاند خاموش ہی رہی۔

"بیٹھ جاؤ۔"

چاند انہیں گھورتی رہی، چھوٹے نواب ہنس پڑے "اوہ، غلطی میری ہی ہے پوری تختی تو یاد نہیں ہوئی تمہیں ابھی، اور میں نے آگے پڑھانا شروع کر دیا۔ ارے تم کھڑی ہی ہو۔ اماں حضور سے کہہ دوں گا، پڑھتی نہیں بھاگ بھاگ جاتی ہے۔"

چاند بیٹھ گئی۔ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ نظریں جھکا کر وہ پڑھنے لگی۔ مگر ہر بار حروف اس کی آنکھوں کے آگے سے پھسل پڑتے۔

"مجھے یاد نہیں ہو رہا، میں اماں جان سے کہہ دوں گی میں پڑھ نہیں سکتی۔" اور وہ اک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

چھوٹے نواب اسے ایک لمحے تک دیکھتے رہے پھر لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا "چاند۔۔۔" بس وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

چاند کو ان کی آنکھوں میں ایسی وحشت نظر آئی کہ اس کے سامنے ایک ننھا منا سا بچہ ہی تو کھیلنے لگا۔ وہ سلگ اٹھی۔

"میں غریب ہوں تو کیا اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ پڑھانے کے بہانے تنہا کمرے میں لا کر میرا ہاتھ پکڑ لیں۔" اور اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔

چھوٹے نواب ایک لمحے کے لئے بوکھلا سے گئے، مگر سنبھل کر بولے "غریبی کا اور مطلب ہی کیا ہے، بڑی پارسا بنی پھرتی ہے۔ اب بتاؤں گا پارسائی کیا ہوتی ہے۔"

"اور میں بھی بتاؤں گی غریبی کا مطلب کیا ہوتا ہے، ہاتھ چھوڑ دو میرا۔"

وہ پورے اعتماد سے بولی۔

چھوٹے نواب نے پوری مضبوطی سے ہاتھ پکڑ لیا۔

"چھوڑ دے کم بخت میرا ہاتھ" اور چاند نے پاس پڑی ہوئی تختی پوری طاقت سے نواب کے سر پر کھینچ ماری۔ چھوٹے نواب نے سی، کی آواز نکالی، اور دوسرے لمحے چاند کمرے سے باہر

"کیوں بیٹا، چاند نے کچھ یاد بھی کیا؟" اماں جان خوشی خوشی چھوٹے نواب سے پوچھ رہی تھیں۔

"بہت تیز ہے ماشاءاللہ، اتنی کم مدت میں بہت کچھ سیکھ گئی" چھوٹے نواب نے سنجیدگی سے جواب دیا "مگر ایک بات ہے اماں حضور، یہ پڑھتے پڑھتے دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے، باہر آنے جانے والے پر نگاہ ڈالتی رہتی ہے۔ اس سے پڑھائی کا بہت نقصان ہوتا ہے۔"

اماں جان ہنس پڑیں "اے ہے تو دروازہ بند کر لیا کرو، دروازہ ہی بند رہے گا تو کیا خاک دیکھے گی" اور انھوں نے پلٹ کر چاند کو دیکھا جو اس ہدایت کو سن کر برف ہو گئی تھی۔ بمشکل وہ بولی۔

"اماں حضور۔۔۔میں۔۔۔میں پڑھنا نہیں چاہتی، آپ۔۔۔"

چھوٹے نواب نے اشاروں میں مطلب صاف کر دیا "جان چراتی ہے، مگر کب تک بچے گی۔ اماں جان آپ مجھے اجازت دے دیجئے میں اسے ٹھونک بجا کر پڑھاؤں گا تو چند ہی دنوں میں فرفر انگلش بولے گی، اور ہاں آپ نے اس پیام کا کیا جواب دیا؟" چاند نے اس لمحے ایسا محسوس کیا جیسے اس کی قسمت کا چاند گہنا گیا ہو!

ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور چھوٹے نواب زہریلی ہنسی ہنس رہے تھے پیچ پیچ۔ انہوں نے نمک چھڑکا "ماروں گا نہیں، بالکل بھی نہیں ماروں گا، مگر ہاں زیادہ گڑبڑ کی تو کان ضرور کھینچوں گا۔"

چاند سلگ اٹھی "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

چھوٹے نواب شانے ہلا کر ہنسے "چاہوں گا کیا، کچھ بھی نہیں۔ بس تمہیں چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔"

چاند اٹھ کھڑی ہوئی، چھوٹے نواب سامنے آ کھڑے ہوئے۔ "ارے بیٹھو بھی، بھاگی کہاں ہو۔ اس دن تو تختی سے اپنا بچاؤ کر گئیں مگر آج؟" انہوں نے قہقہہ لگایا "مگر بھئی چاند، مانتے ہیں تمہیں۔ اتنی لڑکیاں ہم نے برتیں آج تک ایسی ضد، ایسی خودسری کسی میں نہ پائی۔ تم واقعی چاند ہو۔" اور انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ اونچا کیا۔

وہ پھر بولی "چھوٹے نواب اپنی حد سے آگے نہ بڑھو۔"

"حد ــــ ہماری حد کو پوچھتی ہو۔ ارے ہمارے باپ کی ڈیوڑھی ہے یہ ہماری حد کیا رہی۔ کوئی حد نہیں ہیں کوئی ڈر نہیں۔"

"تم نے شراب تو نہیں پی رکھی۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔" وہ زخمی ناگن کی طرح پھن پھنائی۔

"ہاہاہا ــــ" چھوٹے نواب ہنس پڑے بالکل دیوانوں کی طرح "پی جاؤ میرا خون پی جاؤ، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، سمجھیں۔"

"میں چلا چلا کر پوری ڈیوڑھی کو اکٹھا کر لوں گی۔" چاند نے اپنی دانست میں مدافعت کی۔

"ہونہہ"۔ وہ حقارت سے ہنسے "ذرا سی بچی کی عقل ہی کتنی ۔ میں نے اول ہی دیواریں خوب اونچی کرلی ہیں ۔ تم چیخیں بھی تو اماں جان یہی سمجھیں گی کہ تمہیں ٹھونک بجا کر پڑھا رہا ہوں اور پھر چاند . . . ."انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا "اماں حضور نے پہلے ہی تاکید کردی ہے کہ وقت پڑنے پر دروازہ بند بھی کر لیا کرو ۔ میں یہ دروازہ بند بھی کرسکتا ہوں ، سمجھ گئی نادان لڑکی ؟"

چاند نے تلملا کر ان کی طرف دیکھا "میں تمہاری بوٹیاں اڑا دوں گی"

"تم سے پہلے میں تمہاری بوٹیاں اڑا دوں گا" انہوں نے میز پر رکھی ہوئی بندوق کی طرف اشارہ کیا "یہ دیکھتی ہو کیا ہے" انہوں نے بندوق ہاتھ میں اٹھالی "یہ سب گولیاں ہی بھری ہوئی ہیں ، اور یہ رہی لبلبی ۔ ادھر لبلبی دبائی اور ادھر گولی سینے کے پار ۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیل ہو جائے گی ۔ بہت ہوا پھانسی مگر . . . ." چھوٹے نواب کا چہرہ کریہہ ہو گیا "مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے ہم نواب ہیں ، پیسے والے ہیں ۔ اس کی نوبت ہی کہاں آئے گی ۔ ارے پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے چاند رانی" اور وہ بندوق وہیں رکھ کر دروازے کی طرف بڑھے ۔ چاند کی طرف ان کی پیٹھ تھی ۔ ان کے منہ پھیرتے ہی چاند نے بندوق اٹھالی اور نال اپنے سینے سے لگالی ۔

"دھائیں ، دھائیں"۔ آواز گونجی اور چھوٹے نواب کا ہاتھ چٹخنی پر سے پھسل پڑا ۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو چاند تڑپ رہی تھی ۔

زندگی کا یہ روپ ، غریبی کی یہ غیرت یہ ادا آج تک چھوٹے نواب کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی ۔ پتہ نہیں کون سے جذبے نے انہیں زیر کیا کہ وہ رہ نہ سکے اور اسی بندوق کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا ۔

پہرے دار

کالی مرغی کٹ کٹ : کوں ، کوں ، کاں ، کاں کرتی پہلے تو طاقچے پر چڑھی ، وہاں سے اتری تو پلنگ کے نیچے جا چھپی ، وہاں بھی بات نہ بنی تو صندوق کے پیچھے جا بیٹھی ۔ ذرا غیر یقینی انداز میں اس نے گردن اٹھا کر آنگن کی طرف دیکھا ۔ زبیدہ نے دانت سے دھاگہ توڑ کر کالی کو دیکھا اور ہاتھ سے اٹھا کر ٹکے میں چھپا دیا ۔

عقیل میاں باہر سے آئے تو برآمدے میں زبیدہ کو نہ پا کر سیدھے کمرے میں چلے آئے مٹھی بھر روپیہ ان کے سامنے پھینکتے ہوئے بولے

" یہ دودھ کے پیسے ہیں ۔ ابھی باہر گیا تو ہوٹل والے نے پکار کے حوالے کر دیئے ۔"

زبیدہ نے پیسے بغیر گنے ہی اٹھا کر قلمدان کے ایک خانے میں ڈال دیئے ۔ اور لاپروائی سے بولی ۔

"ذرا ہاتھ بڑھا کر وہ مٹکا تو ہلا دیجئے۔"

"کیوں ۔ ؟" عقیل نے مٹکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں کالی کو بند کیا تھا میں نے اب تک تو اس نے انڈا دے دیا ہوگا۔"

"حد ہے تمہاری زندگی تو بس جانوروں میں گذری جا رہی ہے۔"

"جانوروں میں گذر رہی ہے ۔ ؟" وہ ذرا تنک کے بولیں ۔

"اور جو اتنا بڑا ڈھنڈار کا ڈھنڈار گھر پڑا ہے۔ اور جو آپ ہیں اس میں ۔ آپ بھی جانور ہیں ۔ ؟"

عقیل میاں بڑی شرافت سے ہنس دیئے ۔ کمال ہے بھئی اتنے مزے سے بیکے مجھے بھی جانوروں میں ملا دیا۔"

"اور کیا ۔ آپ کی باتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔"

انھوں نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی سیون اپیٹنی شروع کر دی۔

"آپ تو گویا مجھ پر احسان جتاتے ہیں نا ۔ مگر میں بھی کسی کا احسان اٹھانے والی نہیں ہوں۔ ڈیڑھ سو روپے مہینے کے منہ پر دے مارتی ہوں ۔"

عقیل میاں اس وقت بے وقت کی راگنی سے ذرا بھی توبور نہیں ہو رہے تھے۔ جانتے تھے زبیدہ یونہی دکھے دل کی ہے، ذرا سا چھیڑنے پر بلبلا اٹھتی اور پھر جب تک وہ اگلے سارے گڑے مردے نہ اکھاڑ ڈالتی، خاموش نہ رہتی۔ انھیں اس کی لعن طعن بھری باتیں سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک آدھ دن وہ اپنا لیکچر نہ جھاڑتی تو انھیں لگتا

لیے آج کا دن تو یونہی بیکار گذر گیا۔

ملک تقسیم ہوا تو بٹوارے نے خانصاحب کے رہتے بستے گھر کا بھی بٹوارہ کردیا۔ بیچارے پنشن پاکر مزے میں گزر رہے تھے۔ گھر میں جوان بیٹی تھی، بیٹا تھا۔ بہو تھی۔ چار چھ بچے مل کر گھر کو باغ و بہار بنائے رکھتے۔ بڑھاپے میں جب اولاد کی زندگی آنکھوں کے سامنے ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ تو پھر کسی چیز کی تمنا باقی نہیں رہ جاتی۔ زبیدہ کی بات چیت بھی پکی ہی تھی۔ آجکل میں اس کا بھی گھر بسنے ہی والا تھا۔ زندگی کی گاڑی یونہی بڑھی جا رہی تھی کہ ایک دم سے جھٹکا سا لگ گیا۔ ہنستے بستے گھرانے برباد ہونے لگے، لاکھوں کے دھنی بس جان بچا بچا کر گھر چھوڑ چھوڑ بھاگنے لگے۔ خان صاحب کا بیٹا تو بھگدڑ مچتے ہی اپنی بیوی بچوں کو پاکستان لے بھاگا۔ مگر خان صاحب کو اپنی مٹی عزیز تھی۔ کیسے کیسے بیٹے نے خیال بندھائے مگر وہاں تو ایک ناتھی جو کبھی ہاں سے نہ بدلی۔ باپ کے پیچھے اپنی زندگی ویران کرنے والا تو نہ تھا۔ تھک ہار کر چلا گیا۔ خان صاحب کو بس خیال تھا تو زبیدہ کا۔ انھوں نے بٹیا رانی کو بہت کہا کہ بھائی کے ساتھ پاکستان چلی جا۔ مگر اسے بھائی سے زیادہ باپ پیارا تھا۔ ذاکر تو چلا گیا مگر اس کے جاتے ہی گھر بھر میں جیسے خزاں ٹوٹ گئی۔ بچوں کی چیخ پکار، نند بھاوج کی ہنسی دل لگی۔ ساس کی تیز چنگھاڑتی آواز۔ وہ کیا گیا کہ ساری رونق ساتھ سمیٹتا گیا۔ اب گھر وہی تھا اور گھر کے مکین بھی وہی تھے۔ مگر سارے میں ایک سناٹا چھایا رہتا۔

نی ... نوکر چاکر کے جانے کے کوئی سولہ سترہ دن بعد شہر میں ہاہاکار مچی اور
وہ بھی ہو گیا جو نہ ہونا تھا۔ اس رات کی صبح یوں ہوئی کہ خان صاحب پھر کبھی
کسی صبح کو نہ اُٹھے، پہاڑ جیسی حویلی میں اب لے دے کے دو جی رہ گئے
زبیدہ اور خان صاحبن -

تھوڑے دن اور یوں ہی گذر گئے - وہی آفتاب جو ہمیشہ اپنے
ساتھ سنہری کرنیں لیے آتا اب پتہ ہی نہ چلتا کہ کب آتا اور کب چلا جاتا
روز و شب میں اس قدر یکسانیت تھی کہ ہفتے گذر جاتے اور پتہ ہی نہ
چلتا کہ آج کون دن ہے، بات ایسی ہوئی جو آج کے ان کو اور دنوں سے الگ کر دکھائی -

پھر بہت دنوں بعد ایک ایسی صبح بھی آئی جس نے شب و روز کی
یکسانیت کو ختم کر دیا۔ اس صبح زبیدہ جب نیند سے جاگی تو خلاف معمول
خان صاحبن کو بستر سے غائب پایا وہ انھیں یہاں وہاں دیکھتی بڑے دالان
میں پہنچی تو امی اکیلی کھڑی لگن سے جی کھول کر ہنستی کھڑی ہیں۔ زبیدہ نے ہاتھ
پکڑ کر انھیں کمرے میں لے جانا چاہا۔ تو انہوں نے ہنستے ہنستے زور سے ایک
طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ اس درد کو سہہ گئی مگر جب اس نے بڑے دکھ
سے کہا -

" امی پہلے منہ تو دھو لیجئے۔ بعد میں ہنستی رہیئے - تو انھوں نے تڑ تڑ
اپنے ہی منہ پر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے -

ان کا دماغ چل گیا تھا :

اتنے بڑے گھر میں کوئی بھی تو نہ تھا جو اس برے وقت کا ساتھی ہوتا
زبیدہ کو کپڑے بدلے تین تین دن گذر جاتے۔ کنگھی کئے بارہ بارہ دن ہو جاتے

مگر کوئی نہ تھا جو ہاتھ پکڑ کر منہ ہی دُھلا دیتا۔ ماں کی پریشانی الگ جی کو کھائے جاتی۔ وہ اچھی رہتیں تو اچھی رہتیں۔ اور جب توڑ پھوڑ پر اُتر آتیں تو ایک سرے سے سارے گھر کا کلیاں کرد یتیں۔

ایک دن زبیدہ باورچی خانے میں تھی۔ خان صاحبن سامنے والے ستون سے لگی بڑے سوز سے مرثیہ خوانی کر رہی تھیں کہ اک دم سے دروازہ کھڑکھڑایا۔ اور عقیل میاں اندر داخل ہوئے۔ بال اجڑے اجڑے کپڑے میلے کچیلے، ہاتھ پیروں پر منوں میل اور منہ پر اُداسی، گویا اپنے سارے پیاروں کو بیٹھے بیٹھے سلا کر آئے ہوں، دروازے کی کھٹر پٹر پر زبیدہ چونکی اور اُٹھ کر دالان میں آگئی۔ عقیل میاں نے سر گھما کر زبیدہ کو دیکھا۔ زبیدہ جو اپنے زمانے میں قیامت ڈھاتی تھی، جس کی خوبصورتی اور ہنس مکھ پن کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا، اب کیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ جیسے کوئی ٹوٹی پھوٹی قبر۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔؟ ان کے کانوں میں بڑی دور سے آواز آئی۔

عقیل بھائی۔ آپ؟ کیسی حالت ہو گئی آپ کی، بھابی جان اور بچے کہاں ہیں؟"

وہ چونکے اور پھر اسی دنیا میں لوٹے جہاں سر جھاڑ منہ پہاڑ زبیدہ کھڑی تھی اور مرثیہ خوانی کرتی خان صاحبن روتے ہوئے در و دیوار اور سائیں سائیں کرتی، روتی بلکتی ہوا میں۔

"اللہ ہی جانے تو جانتے ہیں تو اپنے کام کے سلسلے میں دلی گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو گھر جلا ہوا تھا کسی نے کہا، یہاں والے جانیں بچا

کر بھاگ نکلے۔ کوئی کہتا سب کچھ جل گیا دہ دا، پکڑ کر بولے۔

"سب کچھ جل گیا زبیدہ بی بی۔ بس ہم ٹھونٹھ باقی رہ گئے۔"

جانے اس دن کتنے دنوں بعد زبیدہ کے آنسوؤں کو راہ ملی ۔ ادھر کا سورج ملدھر ڈھل گیا۔ پیلی پیلی دھوپوں نے اپنی جگہ تاروں کو دے ڈالی ۔ پھر تاروں نے جھلملاتے سورج کا استقبال کیا۔ مگر وہ ستون کے سہارے ٹکی بیٹھی رہی ۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان بن گئے تھے۔ اور گھٹاؤں کی مانند بال، زرد چاند ایسے چہرے پر جھوم کر آ گرے تھے بڑی دیر بعد عقیل میاں نے اسے آکر اٹھایا تھا۔

"چلو زبیدہ دو گھڑی چین سے سو لو ۔ یوں تو تم بھی پاگل ہو جاؤگی۔"

مگر زبیدہ وہ دل و دماغ لائی تھی جو لاکھ درد کا سہن کرتے پھر بھی کبھی اس بوجھ سے نہ چھٹتے ۔ ماحول پھر وہی یکسانیت لیئے تھا۔ پھر اس ماحول کو اماں نے ہی اس یکسانیت سے بچایا۔ اس دن صبح وہ اپنے پلنگ پر مردہ ملیں ۔ پاس ہی خواب آور گولیوں کی خالی شیشی پڑی تھی ۔ رات زبیدہ نے بھی بےخوابی سے تنگ آکر دو گولیاں کھائی تھیں ۔ وہ بھی تو تنگ آچکی تھیں انھوں نے رات بھر کی نیند کو کافی نہ جانا ۔ ایسی سوئیں کہ پھر کبھی کسی گولی کی ضرورت نہ پڑی۔

ماں کی موت کے ایک دو ماہ بعد عقیل میاں نے بہت سوچ کر زبیدہ کو رائے دی ۔

"میرا کہا مانتی ہو تو اب تم بھی پاکستان چلی جاؤ۔ بڑے بھیا تو وہاں ہیں ہی ۔۔"

زبیدہ نے بڑے تیکھے پن سے کہا۔
"اور یہ تو بتائیے آپ سے یہ مشورہ مانگا کس کمبخت نے ہے؟"
اس کے یوں ترکھائی سے جواب دینے پر عقیل میاں اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

"آپ کو اتنی عقل نہیں بھلا میں اپنے باپ کی زندگی میں انھیں چھوڑ کر نہ گئی تو اب ان کی موت کے بعد کیا جاؤں گی۔ اب ہونا بھی کیا ہے زندگی کے سارے درجے تو پورے ہو گئے ہیں۔ میں اچھی ہوں البتہ آپ ضرور جائیے۔ اور پتہ لگائیے کہ آپ کی بیوی بچے کن حالوں میں ہیں؟ کہاں ہیں۔؟"

عقیل میاں نے بڑی بے بسی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔"کون جانے وہ کہاں ہوں۔ اور اب۔ اب تو میرا کاروبار بھی تباہ ہو گیا ہے۔"
زبیدہ ان کا اشارہ سمجھ گئی۔ فوراً بولی۔"روپے پیسے کی آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔" مگر عقیل میاں جتنی بار جانے کا سوچتے اتنی ہی بار رہ جاتے۔

"نہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں تو کیسے؟"

زبیدہ سلگ پڑی۔" واہ جیسے آپ میرے پہریدار ہی تو ہیں نا؟ گویا آپ کے بغیر میں مر ہی تو جاؤں گی نا۔ ایسی خوش فہمی بھی اچھی نہیں۔" اور وہ بڑی دیر تک غصے میں بک بک کرتی رہی۔

غم بھرے ماہ و سال یوں ہی گزرتے رہے۔ ابھی ابھی جو بھولی بھالی زبیدہ اٹھارہ سال کی معصوم لڑکی تھی، اب غم زندگی کے ہاتھوں

ایک بوڑھی عورت بن چکی تھی۔ اس کے کانوں کے پاس سفید بال لہرانے لگے تھے۔ اور دس برس کی مدت میں اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اور چہرے سے شادابی یوں دور ہو چکی تھی کہ اس کی عمر کی لڑکیاں اب اُسے مخاطب کرتے ہوئے خالہ کا اضافہ کر دیتیں۔ زندگی نے اس کے چہرے کی شادابی ہی نہیں، اس کے مزاج کی خوبصورتی اور وہ ہنسی بھی چھین لی تھی، جس کی وجہ سے وہ سب ہنسی کا فی چڑیا کے نام سے مشہور تھی۔ اب وہ اس قدر چڑچڑی اور زود رنج ہو چکی تھی کہ یہ بھی نہ دیکھتی کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ اس کی تنہائی اور بے کیف زندگی کے ساتھی اب وہ سارے جانور تھے جو اس نے وقت کاٹنے کو پال رکھے تھے۔ مگر اب ان کے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ کالی پیلی مرغیاں۔ ذبح بکریں۔ سفید کتا۔ بھورو بھوری بلیاں، انھیں کے گرد اس کی زندگی گھومتی تھی۔ عقیل میاں کے دم سے گھر میں کسی مرد کی موجودگی کا احساس ضرور رہتا مگر زبیدہ کے لئے ان کا وجود اس قدر بے معنی تھا۔ عقیل میاں بھی عجیب انسان تھے۔ مسلسل اس کی چیخ پکار اور بیجا ناراضگی سے تنگ آ کر وہ بھی اڑنے کی سوچ رہے تھے۔ مگر ابھی تک انھیں کوئی ایسا کارگر بہانہ نہ مل سکا۔ اس دن جب وہ بازار سے لوٹتے ہوئے مرغیوں کے لئے زبیدہ کی فرمائش پر نیا ڈربہ لائے تو زبیدہ دیکھتے ہی چیخ اٹھی۔

"یہ ڈربہ ہے۔ یہ ایسا ڈربہ میں نے لانے کو کہا تھا؟ اس میں تو کھڑکی تک نہیں۔ جالی تک نہیں۔ میری مرغیاں مر نہ جائیں گی۔ اس سے اچھا یہ ہے کہ اسے آپ اپنا بیڈ روم بنا لیں۔" عقیل میاں نے جواب نہ دیا گھنٹہ بھر تک یونہی سن رہے۔ ہر ہر پہلو پہ غور کر لیا۔ پھر رسانیت سے

سے بولے۔

"بس زبیدہ بی بی بہت ہو چکا۔ اب آپ کا ہمارا ساتھ ختم۔ ہم پاکستان جا رہے ہیں۔"

زبیدہ نے حیرت سے دیکھا آج تک انھوں نے ایسی بات کبھی نہ کی تھی۔ یہ آج انھیں کیا ہو گیا۔ اس نے چاہا انھیں روک لے۔ مگر وہ تو غصہ میں لپک جھپک اپنا سامان پیک کئے جا رہے تھے۔

"ہونہہ میری جوتی سے۔ میں کون ان کے بھروسے زندگی گزار رہی تھی۔" دوسرے دن جب عقیل میاں جانے کو اُٹھے تو اُسے احساس ہوا کہ ارے یہ تو واقعی چلے جا رہے ہیں۔ دیوار سے ٹیک لگائے اس نے بڑی سچائی اور بے باکی سے کہا۔" مرغیوں کی دیکھ ریکھ کون کریگا جی؟"

وہاں تو ہر جواب جیسے سوچا سمجھا ہی تھا جھٹ سے بولے

"تم نہیں رہو گیا۔"

"ہوٹل والے سے رات کے روپئے کون لایا کرے گا بھلا۔"

"خود ہی چلی جانا۔ کوئی بچہ تو ہو نہیں تم۔"

"اچھا گایوں بھینسیوں کی سانی چارہ کون کرے گا۔؟"

"تو کیا میں کوئی گوالے کی اولاد ہوں۔" وہ بھبھک کر بولے" پیسے پھینکوں تو ہزاروں نوکر مل جائیں گے۔"

"اور جو کتا بیمار پڑ گیا۔ تو مجھے تو جانوروں کا دواخانہ معلوم بھی نہیں۔ میں کیا کروں گی۔؟"

انھوں نے اسے گھور کر اُسے دیکھا۔

"رکشا والا خود ہی پہنچا دے گا۔" انھوں نے تیزی سے جواب دیا اور لپک کر ہولڈال اٹھا لیا۔ ابھی ایک قدم دروازے میں اور ایک قدم دہلیز پر تھا کہ زبیدہ کی دکھ بھری آواز آئی۔ "یہ سب کچھ تو ہو جائے گا مگر میری اپنی دیکھ بھال کون کرے گا۔؟"

ان کے قدم جیسے وہیں گڑے کے گڑے رہ گئے انھوں نے بڑی مشکل سے سر گھما کر دیکھا۔ زبیدہ دیوار سے لگی اس قدر بے بس نظر آرہی تھی۔ اس سوال کا جواب تو انھوں نے سوچا بھی نہ تھا۔

من من بھر کے قدم اٹھاتے وہ زبیدہ کے پاس پہنچے اور ایکدم جیسے ان کے چہرے پہ مسکراہٹ سی دوڑ گئی۔ روتی ہوئی زبیدہ کا سر اٹھا کر انھوں نے پیار سے پوچھا۔

"کیوں جھبو — میں تیرا پہرے دار ہوں۔؟"

"زبیدہ نے شرما کر اپنا منہ ہاتھوں میں چھپالیا۔

"بے شرم کہیں کے۔" خاموش رہنا تو سیکھا ہی نہیں ہے۔ ہر سوال کا جواب جیسے زبان پر موجود ہے۔" اور اسکے ساتھ ہی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ چہرے سے ہٹائے تو دیکھا۔۔ شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بہو کا بار اٹھائے کھڑے ہیں —

پیاسی ندی

سہ پہر کا وقت تھا۔ دھوپ کے دن! اُلسی نشہ سا چھا رہی تھی کہ خود بخود آنکھیں مندی جاتی تھیں۔ صحن میں نیم کے پیڑ کے نیچے چوکی بچھی ہوئی تھی۔ بڑی آپا مشین پر کھڑ کھڑ سے بار بار بٹیں اور سلیمہ بیگم دوپہر کی گرمی میں گہری دھار اُلٹ پلٹ رہی تھیں۔ سلیمہ بیگم نے ذرا ذرا دیر تک گرمی دیکھی اور بازو کا تکیہ بنا کر وہیں لیٹ گئیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سائے میں مشین کی کھڑ کھڑ بھی لوری کا کام دے گئی۔ اور کہاں تو سلیمہ بیگم کی بڑی آپا سے سدا جلتی رہتی تھی۔ کہ جہاں میں سوئی اور یہ مشین پر سوار ہوئیں۔ گویا جنم جنم کی دشمنی نبھا رہی ہوں۔ سلیمہ بیگم نیند کی بڑی کچی تھیں [illegible] ادھر سے ادھر ہونے لگے۔ دھوپ کی تیزی کم ہو گئی، ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا۔ اور سلیمہ بیگم جھٹ سے اٹھ بیٹھیں۔ منڈی منڈی

انھوں نے بڑھتی دھوپ کی طرف دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا۔ چار بجنے والے ہیں کوئی دم میں آتے ہوں گے۔ کچھ جھلا کر بولیں۔

"اوئی آفرین ہے بڑی آپا تم پر۔ بھلے کو جگا دیتیں ایک دھکا دے کر تو کیسا بگڑ جاتا۔؟

بڑی آپا نے مشین کا کھر کھراتا پہیہ روک کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولیں "لے نہ! میں کیوں اٹھاتی پھرتی؟ معلوم نہیں کیسا حدیث ہے۔ تیسری نیند میں سے کسی کو یوں ہی اٹھا دینا گناہ ہے۔"

"آفریں ہے تم پر۔ لے میں کہاں بھول گئیں کیا۔ مجھے سلام میاں کے ساتھ توشہ پکا کر دینا ہے۔"

"اوئی جھاڑ دھڑے میرا یادگیر۔ سیوئیں میں ایسی الجھی کہ یاد ہی نہ رہی سلیمہ بیگم ایک کراہٹیں اور ترکاری کی ٹوکری اٹھا لائیں۔ انڈیل کر بولیں۔

"چلو ہوگئی کسلائی ولائی۔ لو یہ ذرا ترکاریاں چھیل کر تو دینا مجھے۔"

"تمہاری عقل تو چرنے گئی ہے بی بی۔ بھلا یہ کھلڈی تر دلی تم توشے میں دوگی۔"

لے تو ہوا کیا۔ سلیمہ بیگم حیرت سے چھری تھامے تھامے بولیں۔

"بارہ دانی بیل کی ہی تو ہیں نا۔ بڑی آپا نے ہاتھ گھما کر صحن کی پرلی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں ہے تو، مگر پھر"

ہاں، ہاں ہے تو۔" وہ منہ چڑکا کر بولیں۔ "اری کلموہی اس بیل کے سارے پھل کر ڈے ہیں۔"

"نیک بخت مجھے پہلے سے کیوں نہ کہہ دیا۔" سلیمہ بیگم نے ترائیاں سامنے لوٹ دیں۔ "بھلا میں جان کر سلام میاں کو کڑوی ترائیاں کھلا دیتی۔ میرا تو بس چلے تو اپنا دل بھی کاٹ کر کھلا دوں۔"

سلام میاں اپنے کمرے سے نمودار ہوئے۔ ماں خالہ کو مخاطب کر کے بولے "میں ذرا بازار جا رہا ہوں تھرماس خریدنے۔ تب تک توشہ تیار رہنا چاہیئے۔ آتے ہی گاڑی پہ بیٹھ جاؤں گا۔

بڑی آپا نے چھوٹی بہن کو دیکھا جیسے کہتی ہوں "لو سن لو اب پکا ڈالا اپنا سر۔"

"رات کے کھانے کے لئے قیمہ آیا رکھا ہے۔ وہ بھر دیتی ہوں اور صبح ناشتے کے لئے جو آلو آئے رکھے ان کے بھجیا پکائے دیتی ہوں۔ انڈے ہی بنا دیتی مگر بساند نہ ہو جائے یہی ڈر ہے۔ کریم بخش اور سودا لے آئے گا۔"

بڑ بڑ دھڑ دھڑ جلدی میں سلیمہ بیگم نے ہنڈیا بھونی اور چنگیز بھر پراٹھے دم کی دم میں تیار کر کے رکھ دیئے۔ سلام میاں گھر میں داخل ہوئے تو سلیمہ کا دل منہ میں آگیا۔ تولیہ اٹھا جھپاکے سے وہ غسلخانہ میں گھس گئے۔

"خالہ بیگم۔ بس سب کچھ تیار ہے نا۔"

ہاں ہاں تم نہا تو لو۔ سب کچھ تیار ہے! دروازے پر جب تک چھن چھن کرتا تانگہ آ لگے۔ سلیمہ بیگم نے بستر، صندوق، لوٹا بدھنا، چھاگل تھرموس سب کچھ باہر لا کر رکھ دیا۔ توشہ دان میں کھانا بھی۔

سلام میاں تیار ہو کر باہر نکلے۔ ترماں کو جڑ لانے کو بولے "خالہ بیگم

کیا اچھا ہوتا اگر میں آپ کا ہی بیٹا ہوتا۔ اماں جان سے کچھ ہوتا ہوا آتا ہی نہیں؟"
بڑی آپا نے یہ بات سن کر سلیمہ بیگم کی طرف دیکھا مگر وہ یہ بات سن کر ساکت ہو گئیں۔ کریم بخش تانگہ لے آیا۔ تو سلیم میاں نے ماں کو سلام کیا پھر خالہ کے پاس آئے۔

"اچھا خالہ بیگم چلتے ہیں۔" اور وہ سیٹ میں منڈی ڈالے ذرا کی ذرا جھک گئے۔

سلیمہ بیگم نے اپنی بھرآئی ہوئی آواز کو سنبھال کر کہا۔" میاں گاؤں میں جہاں لاری ٹھہرتی ہے۔ وہاں سنتروں کا باغ ہے۔ اس باغ میں ایک نیم کا جھاڑ بھی ہے۔ اس سے لگ کر تین چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔ ایک سلیم میاں کی ایک شاہد میاں کی۔ اور ایک ثمینہ بی بی کی۔" ان کی آنکھیں پک پک برسنی شروع ہو گئیں۔ نیفے میں اڑسی ہوئی تھیلی سے پانچ روپے نکال کر بولیں۔

"میاں ان قبروں پر فاتحہ پڑھ دینا اور اس کا دودھ منگوا کر معصوم بچوں کو پلوا دینا۔"

سلام میاں گم سم کھڑے سن رہے تھے اور میاں میں نے چودہ قرآن شریف بھی پڑھے ہیں۔ وہ بھی میرے پیاروں کے نام بخش دینا۔" یہاں آکر ان کی آواز ڈوب گئی۔ بڑی آپا لپک کر اٹھیں اور ان کا سر اپنے سینے سے لگاتی ہوئی بولیں۔" میں کہوں تمہارا دماغ ٹھکانے ہے سلیمہ! بھلا یہ کوئی رونے کا مقام ہے۔ میری تو عقل حیران ہے کہ تمہارے دل سے یہ داغ کب مٹیں گے۔ روتے روتے اندھی ہو جاؤ گی کلموہی۔

سلیمہ بیگم کے آنسوؤں کو راہ مل گئی۔ بلک بلک کر رونے لگیں۔
"آپا جان۔ میں نے ان کو اپنے سینے سے کبھی دودھ بھی نہیں پلایا کبھی ان کے منہ ہاتھ بھی نہیں دھلائے۔ پیدا ہوتے ہی ....."
"بس کر سیمو۔ تجھے قسم ہے میری۔" بڑی آپا کی آنکھیں نم ہو گئیں سلام میاں کا دل ان کے حلق میں پھڑپھڑانے لگا۔
"اماں رات تلک یہیں کھڑا رہوں گا؟" باہر سے تانگے والے کی آواز آئی اور سلام میاں باہر کو لپک گئے
"میاں۔ مالی سے کہہ کے ان کی قبروں پر موتیا کا پودا بھی لگوا دینا ہائے میرے موتیا کے نازک پھول کیسے مرجھا گئے۔ ہائے خدایا۔"
"ہائے خدایا۔"
سلام میاں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ خالہ بیگم کی آنسو بھری آنکھیں انھیں بار بار یاد آتیں اور تمام راستہ ان کی اپنی آنکھیں نم رہیں۔ سا
سلیمہ بیگم کو چار برس ہوئے بڑی آپا گاؤں سے کھینچ لائی تھیں، وہ وہیں بیاہی ہوئی تھیں۔ شادی کا سال گزرا کہ پیٹ سے رہیں۔ چاند سا سپوت ہوا۔ ساس نندوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ مگر چلّہ چھٹی تو بڑی بات ہے دن بھی نہ ٹلا ہو گا کہ وہ دودھ کا دھلا گورا چٹا میدے کا سا گولہ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ سال بھر بعد پھر اللہ نے خوشی دکھائی۔ وہی حشر اب بھی ہوا۔ تیسری بار جب خدا کی مہربانی ہوئی تو ساس نے ہر ہر طرح سے حفاظت کروائی۔ دیکھو بیٹا سنبھل کر چلیو، پیرا ونچا نیچا نہ پڑ جائے۔

"اری گرم سرد چیز نہ چکھ لیجیو۔"

"جھار جھنکار تلے اٹھنا بیٹھنا مت رکھیو۔"

"اے بیٹا تیرے کمرے میں کھڑکی ہوا کے رخ پر ہی کھلتی ہے۔ یہاں میرے کمرے میں آکر پڑ جا۔"

"ادئی اتنی سیڑھیاں چڑھ کر کدھر جائے گی۔ اب میں کہوں صبح نہیں ہونے کی۔"

اب کی بار بیٹی ہوئی مگر خوشی دیکھنا قسمت میں کہاں تھا۔ کوئی تو کہتی کہ پیٹ کی خرابی ہوگی اور کوئی بوڑھی کہتی تھی کہ کسی پلید روح کا سایہ ہے۔ سلیمہ بیگم کی چھاتیاں سدا لوتھ بنی رہتیں۔ کسی بچے کے ہونٹ تک نہ لگے۔ ارمان کس کے دل میں نہیں رہتے یہ تو پیدا ہونے سے پہلے ہی بڑے چاؤ سے، ارمان سے بچوں کے نام سوچ لیا کرتیں۔ مگر نام لے کر پکارنا، چمکارنا، دھمکانا کبھی نصیب نہیں ہوا۔

شاہد میاں، ساجد میاں اور تمینہ بی بی کے بعد تو یہ عالم ہو گیا کہ سلیمہ بیگم کا دل سدا بہار پھوڑا بن گیا۔ جب دیکھو تب رستا رہتا۔ کوئی دوا دارو کام نہ آتا۔ بڑی آپا بہن سے ملنے کبھی کبھار یوں ہی گاؤں چلی جایا کرتی تھیں۔ اب کی بار آئیں تو دیکھا کہ سیمو کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ بڑی بہن تھیں اور پھر سینے میں ماتا کا احساس تھا۔ تین پھول جیسے بچے آنکھوں کے سامنے ہی چلے گئے کیا کچھ نہ گزری ہوگی دل پہ دم دلاسا دیا۔ اور ساتھ لے کر چلی آئیں۔ بہنوئی زمیندار تھے۔ خود بھی کھیتی باڑی کرتے تھے تو وہ بھلا اپنی جاگیر، کھیت کھلیان چھوڑ کر کیسے آتے۔ ہاں بیوی کو جانے کی اجازت ضرور دے دی۔

سال چھ مہینے میں گاڑی میں کھیت کا سامان لدوا تے خود گھوڑے پر بڑھ جاتے۔ اور سالی کے ہاں آکر رات دو رات ٹھہرتے اور پھر چلے جاتے بڑی آپا جس وقت سلیمہ بیگم کو لے کر چلی ہیں تو راستے میں سنتروں کا باغ پڑتا تھا۔ باغ پڑتے ہی سلیمہ بیگم گاڑی سے کودیں اور قبروں کے سامنے لوٹ گئیں۔ منہ پر خاک ڈالتیں، بال نوچتیں قبروں کو بڑے پیار سے سہلا کر پوچھتیں۔

"ساجد میاں سردی تو نہیں لگتی بیٹے۔؟"

"دھوپ میں مت بیٹھا کرو بیٹی۔ رنگ کالا پڑ جائے گا۔ تو کوئی بیاہ کر بھی نہ لے جائے گا۔"

"اے واہ شاہد میاں مرد کی صورت ہو کر بجلیوں سے ڈرتے ہو۔"

بڑی آپا نے منہ میں پلو ٹھونس لیا۔ اور سلیمہ بیگم وہیں بے ہوش ہو کر گر بولیں۔ لاکھ بڑی آپا نے چاہا کہ سلیمہ بیگم کا دل بہل جائے مگر ان کے پہ غم ایسا چھایا تھا کہ کبھی ہنستا ہی نہ تھا۔ بڑی بیگم کی اپنی دوا اولادیں تھیں بیٹی بیاہ دی تھی۔ سو وہ سسرال میں بیٹھی راج رچ رہی تھیں سلام میاں اب اکیسویں میں تھے۔ خالہ پر نثار۔ خالہ بھی دل وجان سے چاہتیں۔ مگر ان کی موجودگی میں بھی ان کے دل کا چراغ روشن نہ ہوا۔ سلام میاں نے ایک دن بڑے پیار سے کہا تھا "خالہ بیگم میں تو بس آپ کو ہی اماں جان کہا کروں گا۔ کیونکہ آپ اماں جان سے کچھ زیادہ ہی چاہتی ہوں گی مجھے!"

سلیمہ بی بی کانپ گئیں "نہ، نہ، میاں! ایسا مت کہو۔ بڑا ایسی

منحوس ماری ہوں کہ جس پر میرا سایہ پڑا وہ تباہ ہوکر رہ گیا۔ اللہ تمہاری سلامتی کرے میاں۔"

سلام میاں نے ہنس کر بات ٹال دی "ارے خالہ بیگم میں آپ کو بھلا اماں کہہ بھی کیسے سکتا ہوں۔ آپ زیادہ سے زیادہ بس میری بہن ہی تو لگتی ہیں۔"

سچ بات بھی یہی تھی۔ بڑی آپا اور سلیمہ بیگم کی عمروں میں اچھا خاصہ ماں بیٹیوں کا سا فرق تھا۔ یوں کہ دونوں برابر، برابر جو بیٹھیں، تو آنے جانے والا یہی تو سوال کرتا "بیٹی کو کہاں دیا؟"

بڑی آپا ہنس کر بولتیں "اوئی میری بیٹی کاہے کو ہے بہن ہے چھوٹی" شادی ماں باپ نے جلدی جلدی ہی کر دی تھی۔ تین بچے بھی ہوئے مگر لڑکی جیسی دکھائی دیتیں۔ نیس کے بھی اندر ہی تھیں۔

بہار کے دن تھے، چنے کے کھیتوں میں فصل تیار ہوگئی۔ میاں بڑی لدوائے آئے تھے۔ وقت بڑے بڑے گھاؤ مندمل کر دیتا ہے سامنے ہرے چنے کے ڈال پڑے ہوئے تھے۔ دونوں بہنیں ہنستی جا رہی تھیں کچھ سلام میاں کی شادی کا ذکر تھا اور سلیمہ بیگم چٹخارے لے لے کر چنے بھی کھاتی جا رہی تھیں۔ بڑی آپا نے بہت غور سے انھیں دیکھا۔ یوں بھی کئی دنوں سے وہ کھٹی میٹھی چیزوں کی ٹوہ لیتی پھرتی تھیں چال بھی بدل گئی تھی۔ بڑی آپا نے مذاق سے کہا

"معلوم ہوتا ہے میاں کا جادو چل گیا۔"

سلیمہ بیگم جھینپ کر بولیں "اوئی آفریں ہے بڑی آپا تم پر۔"

ماں جیسی عمر اور مجھ سے مذاق کرتی پھرتی ہو۔"

بڑی آپا ہنس کر بولیں۔"ہائے واہ تو کیا ہوا۔ بہن تو ہوں ہی۔ مَیں تو پچھلے دو مہینوں سے تیری چال بدلی بدلی پا رہی ہوں۔"

مانع ہیں نئے پھول کھلنے والے ہوں تو مرجھائے پھولوں کا غم دل کو لگ کے نہیں رہ جاتا۔ نئی خوشی نے پرانے غم بھلا دیئے۔ اب تو شہر میں تھیں۔ نئی باتیں۔ نئے لوگ۔ بڑی آپا نے شروع سے ہی دیکھ دکھا کر دائی بلا لی۔ ہر ہفتے دو ہفتے کو لیڈی ڈاکٹر بھی کوئی سا ٹانک لکھ دیتی یا گولیاں۔

دن بیتتے گئے اور سلیمہ بیگم کے دل کی دھکن بڑھتی گئی۔ باتوں باتوں میں بڑی آپا دم دلا سا بھی دیتیں۔ مگر سلیمہ بیگم کے اوسان بجا نہ تھے۔ جس دن سلیمہ بیگم کو درد لگے ہیں۔ سارے گھر میں لے دے دے مچی ہوئی تھی۔ بھاگ دوڑ، اٹھا پٹخ، سامان کی باندھا باندھی۔ رکھا سینتی۔ بڑی آپا ہاتھ ملتی جاتیں۔ اور رہ رہ کے دیکھتیں۔"دیکھئے اب کیا خیر خبر ملتی ہے۔" ایک بار ڈاکٹرنی باہر نکلی۔ اور ذرا سراسیمہ ہو کر بولی۔"انھیں پہلے کتنے بچے ہوئے ہیں۔؟"

"تین۔" بڑی آپا سہم کر بولیں۔

"اچھی حالت میں ہوئے؟"

"نہیں!" بڑی آپا کانپ گئیں۔"ہو ہو کر مرتے گئے اللہ ہی جانے کیا خرابی رہی ہوگی۔"

بڑے دھیمے دھیمے لہجہ میں ڈاکٹرنی نے ان سے تین چار باتیں

گیں - جاتے جاتے بولی -

"موت زندگی اللہ کے ہاتھ ہے - نسوانی خرابی ایسی ہے کہ کبھی بچہ نہیں جنے گا - ابھی خود آپ کو بتا چکی ہوں -" ڈاکٹرنی اندر چلی گئی اور بڑی آپا کا دل ڈوب گیا -

چھ دن گزر گئے تھے مگر نہ تو سلیمہ بیگم کے آنسو سوکھے تھے نہ بڑی آپا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار ہی ٹوٹا تھا - سلیمہ بیگم کی چھاتیاں تھیں کہ اناطس ہو گئی تھیں - اتنے برسوں کی گھٹی ہوئی مامتا اپنے زور شور کے ساتھ پھوٹ پڑنے کو بے تاب تھی - رونا تو خیر تھا ہی - مارے تکلیف کے بھی سلیمہ بیگم کا منہ سوج گیا - پمپ لگوا کر دودھ نکلوایا بھی، مگر مامتا کی پرجوش ندیاں تھیں کہ پھر بھی جل تھل بہے جاتی تھیں -

کمال میاں کی بہن یعنی سلیمہ بیگم کی نند بھی شہر میں بیاہی ہوئی تھیں ایک سال پہلے انھیں دو بیٹے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے تھے - میاں ان دنوں یہیں آئے ہوئے تھے - بیوی کی تکلیف ان سے دیکھی نہ گئی بولے یہ زینو ماں کے دو توام بچے ہیں دونوں ہی دودھ پیتے ہیں، میں ایک کو لے آتا ہوں"

بڑی آپا تو چپ رہ گئیں مگر سلیمہ بیگم تڑپ کر بولیں "نہ، ایسا مت کرو - میں آپ ہی برداشت کروں گی - مگر ان کے آنسو پھر پھوٹ بہے -

"عجیب دیوانی ہو -" میاں پیار سے بولے - "برداشت کیسے کرو گی، ؟ چھ سات دن تو ہو ہی گئے - حالت بگڑتی ہی جاتی ہے پھوڑے بن گئے تو فضول اپریشن کی نوبت آئے گی - ہمارا ہی کیا بھانجا تو لگتا ہے - بھانجے کو دودھ پلا دینے میں بھلا کیا قباحت ہے"

"تم نہیں سمجھتے ۔ میں ....." سلیمہ بیگم کی آواز گھوٹ گئی اور میاں باہر نکل گئے ۔

ساڑھے گیارہ مہینے کے کھیلتے ملتے بچے نے جب دودھ سے ابلتی بہتی چھاتیاں دیکھیں تو بس ٹوٹ ہی تو پڑا ۔ سلیمہ بیگم کی مامتا جیسے سیر ہو گئی ۔

ساری اکڑاہٹ جاتی رہی چہرے پر نور سا چھا گیا ۔ دل تھا کہ پھٹا جاتا تھا ۔ بس نہ چلتا تھا کہ اس بالشت بھر کے کیڑے کو اٹھا کر دل میں بھر لیں ۔

مہینہ پندرہ دن بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اس نے رنگت ہی بدل دی ۔ وہاں دو چھاتیوں سے دو پلتے تھے ۔ یہاں اکیلا تھا ۔ اور ندی میں جیسے باڑھ آتی ہے ویسا بہتا ابلتا دودھ ۔ سیر ہو کر بیٹا نیند بھر کر سوتا ۔ معصوم اور بے زبان ہیں تو کیا ' بچے محبت ضرور محسوس کرتے ہیں ۔ سلیمہ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھل کھلاتا ۔ لاڈ میں آکر ضد کرتا تو ان کے سینے پر اپنا سر پٹختا ۔ سلیمہ بیگم کا دل کیسا خوش ہوتا ۔ گال سیب جیسے دہکنے لگے ۔ چہرہ تھا کہ پھول ہو گیا ۔ مگر ادھر زینب کو اپنے پہلو میں کمی محسوس ہونے لگی ۔ پہلے سویا کرتی تھی تو ایک طرف چھوٹا ہوتا تھا ایک طرف بڑا ۔ کروٹ تک نہ لے پاتی تھی مگر خوش اور مطمئن تھی ۔ بھائی کو منہ توڑ جواب دیتے نہ آیا ۔ اب اس کا اپنا بازو سونا سونا محسوس ہوتا ۔

ہر دم کچھ کمی محسوس کرتی تین مہینے تو گزر گئے تھے ۔ مامتا کی آگ

تو ایسی آگ ہوتی ہے کہ کسی پانی سے کسی ٹھنڈک سے نہیں بجھتی۔ اتنا تو جانتی تھی کہ بھائی بھاوج کے پاس ہے۔ اچھا ہے، خوش ہے، تندرست ہے پھول کی طرح ہو رہا ہے۔ مگر جلیئن نہ تھی۔

یونہی بہانہ کر کے ایک دن بھائی بھاوج سے ملنے آ گئی۔ بچہ پاؤں چلنے لگا تھا۔ یہ موٹا موٹا روئی کا گولہ، نرم نرم گال۔ کلیا ایسا منہ تھا کہ مزا کھلا رہتا۔ اتنے ہی دنوں میں نئی نئی شرارتیں سیکھ گیا تھا۔ سلیمہ بیگم کے انگ پر یوں مانوس ہو گیا تھا کہ زینب پر ریجھا تک نہیں۔ زینب نے بلایا چمکارا بھی مگر دور ہی سے زبان نکال کر ہنستا رہا۔ لینے کو بڑھی تو دوڑ کر سلیمہ بیگم سے چمٹ گیا۔ زینب کا محبت کا مارا دل اس کی ادا سے جیسے زدا اٹھا۔ خود کو پاگل سا محسوس کرنے لگی۔ دو دن رہ کر چلنے لگی۔ تو جا کر چوکھٹ میں کھڑی ہو گئی اور دکھے دل سے بولی:

"کریم بخش میرا بچہ لا دو۔"

دروازہ میں لرزتی سرخ آنکھیں لئے زینب روتی کھڑی تھی۔ وہیں سے بولی۔ "آگ لگ جائے آپا جان میری مامتا کو، مانتی ہی نہیں دل ہے کہ پھٹا جا رہا ہے۔"

ادھر سلیمہ بیگم اسے سینے سے چمٹائے کھڑی تھیں۔ سسک کر بولیں۔ "بڑی آپا یہ گیا تو میری جان بھی اس کے ساتھ چلی جائے گی اتنا یاد رکھنا۔"

بڑی آپا چپ رہ گئیں۔ زینب کے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ سلام میاں سلیمہ بیگم کی گود سے بچہ لے کر بولے۔ "خالہ بیگم بھجوا دیجئے نا۔ دو چار

دن بعد پھر بلوالیں گے ۔

"میاں ۔" وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولیں ۔" میں دودھ کس کو پلاؤں گی ۔ زینب کے پاس تو اس کا ایک بچہ ہے نا یہ اپنے دل پر سے میرے دل کا اندازہ کیوں نہیں لگاتی ۔ ؟"

بچہ سلام میاں کی گود میں جا کر تھئی تھئی ناچنے لگا ۔ تین مہینے کے دودھ نے اسے سلیمہ بیگم کا ہی بنا کر رکھ دیا تھا ۔ زینب یہ سب کچھ دیکھ نہ سکی ۔" آپا ماں مجھ پر رحم کرو ۔ میرے دل پہ آرے سے چل رہے ہیں ۔"

بڑی آپا نے بڑے ضبط سے کہا ۔" سیمو اپنی ممتا کے سینے پر پتھر رکھ لے تو سدا کی پیاسی ہے ۔ "

سلیمہ بیگم کی بیماری کی خبر سن کر گاؤں سے کمال میاں یونہی سراسیمہ اور پریشان چلے آئے تھے ۔ سلیمہ بیگم بڑی بے چین ہو رہی تھیں ۔ دل سدا بچے کو کھوجتا تھا اور دودھ تھا کہ ابلا پڑتا تھا ۔ گھریلو دوائیں استعمال کیں ۔ پمپ لگوایا ۔ مگر یہ بہاؤ رکا نہیں ۔ ان ندیوں کو راہ مل گئی تھی اب ان کی روانی تھی کہ تیز ہوئی جا رہی تھی ۔ پندرہ سولہ دن ہی گزرے ہوں گے ۔ مگر یہ حال تھا کہ ہڈیاں اور چمڑا باقی رہ گیا تھا ۔ وہ رونق وہ دلکشی ، وہ نور جو ممتا کی آسودگی ملنے سے چھا کر رہ گیا تھا سب ختم ہو گیا ۔ بچے کے لئے رہ رہ کر پھڑکتی تھیں ۔ ان کا زندہ رہنا ہی معجزہ سے کم نہ تھا ۔

" وہ بھی مجھے ضرور یاد کرتا ہوگا ۔ میرا دودھ اس کی ہڈی ہڈی میں رچ بس گیا ہے ۔ وہ مجھے بھولے گا تو کیسے ۔"

" بڑی آپا ایک بار بس ایک بار اسے بلا لو ۔ یہ بوجھ مجھ سے سنبھلتا

نہیں - میرا سینہ اس کے ننھے ننھے گرم ہونٹوں کی تلاش کر رہا ہے ۔"

بڑی آپا بڑے کرب سے بولیں ۔" ممکن تو ہے یہ سو گمر فائدہ کیا ہے یہ سوچ [illegible] دبی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھے گی ۔ تیری پیاس میں اور شدت ہو جائے گی ۔ صبر کرو ۔ صبر ۔"

سلیمہ بیگم کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں ۔ میاں سرہانے بیٹھے سورہ یاسین سنا رہے تھے ۔ بڑی آپا منہ میں پلو ٹھونسے آنسو بہا رہی تھیں ۔ سلیمہ بیگم کی پلکیں کپکپائیں ۔ اور انھوں نے دروازے کی طرف دیکھا ۔ میاں اور زور زور سے پڑھنے لگے ۔ ابھی چوتھا مبین بھی ختم نہ ہوا ہوگا کہ سلیمہ بیگم کو ہچکی آئی اور سر ڈھلک گیا ۔ اس لمحے دروازے میں سے لپکے ہوئے زینب کے میاں آتے دکھائی دیئے ۔ بھرائی ہوئی آواز سے بولے ۔" آپا جان یہ تو بالکل جھڑک گیا ۔ دودھ کو منہ تک نہیں لگاتا ۔ اتنے دن ہو گئے مگر اب تک بھی ماں پر نہ ہل سکا ۔" اور انھوں نے بڑی آپا کے ہاتھوں میں بچہ دے دیا ۔ بڑی آپا کا دل دھک سے رہ گیا ۔ برف کی طرح ٹھنڈے سے بچے کو سلیمہ بیگم کے پہلو میں لٹا کر انھوں نے دونوں کو سر سے پاؤں تک سرخ چادر سے ڈھک دیا ۔ اور منہ ہی منہ میں درود شریف پڑھنے لگیں ۔

چاند محل

سراج بھائی کے خواب ہمیشہ سچ ہوتے تھے ـــــ فجر کی نماز سے قبل جو خواب دیکھتے وہ تو گویا ایک طرح کی بشارت ہی ہوتے ـــــ پہلی نیند کے جھونکے میں جو بھی نظر آتا وہ تو قابلِ فکر نہ ہوتا مگر جہاں صبح اٹھ کر سراج بھائی بولتے ـــــ

" رات، فجر کی اذان سے قبل میں نے دیکھا کہ بڑے ماموں میاں اپنے رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں "۔ یا پھر۔ بڑے ہی تڑکے مجھے خوب دکھائی دیا کہ سارے گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا چاند نکل آیا ہے" تو سمجھ لو وہ بات بالکل سچ ہو کر رہتی ـــــ

بڑے ماموں میاں رومال سے آنسو پونچھتے دکھائی دیے۔ اس کے چار دن بعد ہی گاؤں سے خط آیا۔ بڑی ممانی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں ـــــ چاند نکل آنے کی بات تو یوں سچ ہو گئی کہ بلقیس بیگم کی شادی کو ایک نہ دو پورے

بارہ برس ہو گئے تھے۔ سراج بھائی کو یہ خواب نہ کھائی دیا اور اس کے بعد ہی سننے میں آیا کہ بلقیس بیگم کو حمل رہ گیا۔

پھوپھا میاں اچھے بھلے تھے۔ جمعرات کی رات کو سراج بھائی یٰسین شریف پڑھ کر سوئے۔ بڑی بے کلی سے رات کٹی۔ صبح ہوتے ہوتے ذرا کی ذرا جھپکی آ گئی۔ مؤذن کی آواز پر اٹھ بیٹھے مگر ایسے پریشان پریشان کہ پوچھو مت۔ ناشتے پر کسی نے پوچھا بھی کہ "سراج میاں ایسے چپ کیوں ہو"۔ اگر چپ چاپ ہی ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ان کے چہرے سے تو پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ اماں بولیں۔

"سراج میاں یوں پریشان کیوں ہو رہے ہو" اس پر سراج بھائی اور بھی گم سم ہو گئے۔ پھوپھی بی نے زور دے کر پوچھا۔

"رات کو نیند تو اچھی لگی"؟ انہیں معلوم تھا سراج میاں کوئی خواب دیکھیں تو ایسے ہی سونٹھ بن جاتے ہیں۔ بڑا دل کڑا کر کے بولے۔

"پھوپھی بی۔ پھر چپ ہو گئے۔ پھوپھی بی کے دل میں بڑا ہول آیا۔ رسول پاک کی قسم دی تب سراج بھائی منہ سے پھوٹے۔

"پھوپھی بی۔ پھوپھا میاں کے سب درجے پورے ہو گئے"!

دوپہر کو پھوپھا میاں کھلیان سے لوٹے۔ کھانا کھایا، بات چیت کی۔ لوٹ پلوٹ کی۔ سہ پہر کو اٹھے تو بولے "دل کے پاس درد سا محسوس ہو رہا ہے"۔ دیکھتے ہی دیکھتے "یا اللہ" کا نعرہ لگایا اور چل بسے۔ بعد میں سراج بھائی نے بتایا کہ رات میں مجھے ایسا خواب دکھائی دیا کہ پھوپھا میاں اپنے خاندانی ہڑدا میں دادا میاں کی قبر کے پائنتی کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔

" مجھے یہی جگہ پسند ہے" اس پر دادا میاں بولے بھی کہ نہیں میاں پائنتی کا ہے کو پڑو ــــ ادھر سرہانے آکر سو جاؤ" تو کہنے لگے نہیں میں تو آپ کے قدموں میں ہی اچھا ہوں۔"

سراج بھائی بھی بس اللہ والے تھے ــــ پانچوں وقت کی نماز، روزے خیر، خیرات ــــ سب ہی میں ہاتھ اونچا ہی اونچا تھا ــــ اماں تو بولتیں کہ میرے گھر میں میرے میاں کے دم سے ہی ساری برکت ہے ــــ سراج بھائی کو وہ پیار سے میاں ہی کہا کرتیں ــــ سراج بھائی کی شادی کا اماں کو بڑا ارمان تھا ــــ مگر سراج بھائی کو دیکھو کہ اماں کی ایک نہ سنتے ــــ یوں احکام خداوندی کی پوری پیروی کرتے مگر یہیں آکر بدل جاتے ــــ اب پوچھو بھلا کیا ماں کی بات سننا اور ماننا، خدائی حکم نہیں ہے ــــ؟ ایک دن کسی کے کہنے پر اتنا ضرور بولے تھے کہ" مجھے تو لگتا ہے کہ خواب سے ہی مجھے بشارت ملے گی کہ کب ہے میری شادی ــــ بس تب ہی کر لوں گا ــــ"

اماں سراج بھائی کا بڑا مان رکھتیں ــــ ان کی کوئی بات نہ ٹالتیں ــــ بولتیں ــــ" میرا میاں تو اللہ والا ہے۔ اس کا رخ دیکھ کر بات کرتی ہوں" اور تھا بھی ایسا ہی ــــ کبھی تو اماں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کو نہ کہتیں ــــ سراج بھائی یوں مولوی کب تھے مگر ان کے خوابوں نے انھیں گھر بھر میں .... باقاعدہ پیر کا درجہ دے دیا ــــ ایم، اے پاس تھے ــــ یہ بھی نہیں کہ جاہل تھے ــــ انگریزی، اردو، عربی، فارسی سب ہی آتی تھی ــــ ہاں اتنا ضرور تھا کہ عربی بہت پڑھی تھی ــــ لوگ باگ پوچھتے کہ اللہ میاں نے اور کسی اولاد میں یہ گن نہ دیئے کہ سراج میاں کو ہی کیوں نواز دیا" اب یہ تو اوپر والا ہی

بچے تو ہے — ویسے اصل بات یہ تھی کہ سراج بھائی کبھی بھولے بسرے بھی ادھر ادھر نہ جاتے — اماں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتی تھیں کہ میرا میاں معصوم بچہ ہے۔ جیسے ابھی ماں پیٹ سے نکلا ہو — اور یہ اسی پاکی اور معصومیت کا نتیجہ تھا کہ اس کے خواب سچے ہوتے تھا۔

یہ تو رہی خواب کی بات — سراج بھائی تعبیر بھی ایسی دیتے کہ ادھر سے ادھر بال برابر بھی فرق نہ آتا۔

زاہدہ بیگم کو خواب دکھائی دیا کہ ان کے میاں لنگڑے ہو گئے ہیں — مگر پھر چلنے لگے — زاہدہ بیگم نے سراج بھائی کو اپنا خواب بتایا۔ چھوٹتے ہی بولے — "نوکری چھوٹ جائے گی — مگر دیکھ لینا پھر لگ جائے گی — لنگڑے ہو کر اچھا ہو جانا تو یہی بتاتا ہے۔"

تھوڑے دنوں کے لیے زاہدہ بیگم کے میاں کو نوکری سے نوٹس ملا مگر مہینے بھر کے بعد ہی کام سے لگ گئے۔

جھنا اماں پڑوس میں رہتی تھیں — ظہیر میاں کے پاس بھی آنا جانا تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح بڑی گھبرائی گھبرائی سی آئیں اور سراج بھائی سے پوچھنے لگیں سراج بھائی منہ دھوتے بیٹھے تھے — بولے — "خیر تو ہے جھنا اماں — ایسے گھبرائی ہوئی کیوں ہو —؟"

بولیں — "کیا بولوں بیٹا — صبح ہی صبح اذان سے پہلے دکھائی پڑا کہ پوری بستی میں آگ لگ گئی ہے — لوگ باگ گھروں سے نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں — اتنے میں ایک نورانی صورت بزرگ دکھائی پڑے اور بولتے ہیں — "ارے بھاگنے سے کیا ہوگا — اپنی جوان لڑکیوں کو لیکر ادھر جاؤ — اور اتنا

کہہ کر انہوں نے ہاتھ سے ایک راستہ دکھایا۔ سب ادھر کو چل پڑے۔ مگر میاں اتنے کے اتنے میں مجھے کیا دکھائی پڑتا ہے کہ جیسے میرا گھر بھی جل رہا ہے۔ اور میری بیٹی سکینہ اِدھر سے اُدھر باؤلی سی پھر رہی ہے نہ جانے اسے کیا ہوا کہ اکدم اپنے ڈوپٹے کو جان بوجھ کر آگ لگالی۔ میں پوچھتی ہوں۔ ارے باؤلی یہ آگ کیوں لگالی تو جواب دیتی ہے۔ اماں جی لٹیرے آ رہے ہیں لٹیرے۔ عزت کے۔ عصمت کے لوٹنے والے۔ اس سے اچھا تو ہے کہ خود ہی جل مروں۔" بس اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔"

سراج بھائی گم سم ہو گئے۔

"میری سمجھ میں آیا نہیں اچھی طرح۔ میں بڑی مسجد کے پیش امام سے پوچھ کر بتاؤں گا جھنا اماں!"

اس رات سراج بھائی نے گھر بھر کے مردوں سے کہہ دیا۔ "بڑی زور دار جنگ ہونے والی ہے۔ بڑے خون خرابے ہوں گے میں کہے دیتا ہوں یہ جھنا اماں کا خواب تباہی کی نشانی ہے۔"

سلام میاں نے ہنسی میں اڑانا چاہا۔ "ارے میاں تجاہلِ دوراں اب سب ہی کے خوابوں کی تعبیر دینے لگے۔ وہ جھنا اماں ایک تو سٹھیا گئی ہے۔"

"کیا بات کرتے ہیں سلام بھائی آپ بھی۔ جھنا اماں کو میں نے خود جاڑے پالے میں ٹھنڈے تخ کر دینے والے پانی سے وضو بناتے دیکھا ہے اور یہ خواب تو انھوں نے جمعرات کی رات کو دیکھا ہے، وہ بھی صبح صادق سے قبل۔"

"تم ہو بھولے بھالے۔ لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہو۔ اب بیٹھ

بٹھائے گا ہے کی بھیتا آنے والی ہے ۔ بہشت ۔"

دفعتاً میراثن نے ڈھول اپنی طرف کھینچا ۔ اس کی گھنگی تنگ کی ۔

اور تھاپ ماری ۔

دولہن میری سج رہی سنہری گوٹے سے!

"چل ہٹ ادھر" اماں نے ڈھول اپنی طرف کھینچا ۔ تجھے اتنی بھی سمجھ نہیں ۔ مہندی چڑھ رہی ہے اور سنہری گوٹوں کا گیت لے بیٹھی ۔"

اماں کی بڑے دنوں کی آرزو پوری ہونے کو جا رہی تھی ۔ اپنی نند کی بڑی بیٹی کو پیام دیا اور بات بھی پکی ہو گئی ۔ شادی کا ابھی کچھ طے نہ تھا مگر اماں نے سوچا منگنی ہی کر ڈالیں گے ۔ اماں کا کیا ہے ۔؟ جب کرنے پر آتی ہیں تو چھوٹے موٹے کاموں میں بھی ہزاروں کا خرچہ لگا دیں ۔ اب یہ منگنی کا رسم دیکھو اور چھوڑ چھمکا ۔

پلنگ چاندی کا = ایک عدد

چوکی چاندی کی = ایک عدد

گنگال تانبے کا (چاندی کا پانی کا چڑھا ہوا) = ایک عدد

مسہری کے ڈانڈے چاندی کے = چار عدد

سونے کی انگوٹھیاں (دسوں انگلیوں کی) = دس عدد

گلوبند جڑاوی = ایک عدد

پازیب سونے کی = ایک عدد

کھڑے ڈوپٹے تاش کے = پانچ عدد

کرتیاں تاش کی = پانچ عدد

چوٹیاں سرخ بانات کی ۔ پانچ عدد

آڑے پاجامے ۔ مشجّر اور ہمرو کے ۔ پانچ عدد

اِتی لمبی چوڑی فہرست بنا کے دی سراج بھائی کو ۔۔۔ کہنے لگیں "میاں تیری شادی پر تو اصل ارمان نکلیں گے ۔۔۔ یہ تو دل بہلاوا ہے "

سراج بھائی ہنس کر بولے "اماں جو آپ کے جی میں آئے کر لینا ۔۔۔ مگر اس کو دل بہلاوا کہنا تو زیادتی ہے نا ۔۔۔"

" اے میں کہتی ہوں تیری عقل ماری گئی ہے ۔۔۔ اور یہ ہے ہی کیا ۔۔؟! ارے بیٹا تم نے ہمارا زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے ۔۔"

اماں کو اس بات کا بڑا قلق رہتا کہ ان کا زمانہ کسی نے نہیں دیکھا ۔ اپنے وقتوں کی کیا کیا باتیں اماں کرتیں کہ سن لو تو یقین نہ آئے ۔۔ مگر اماں جھوٹ بولنے والی تھوڑی ہی ہیں ۔۔ اماں کے میکے میں پیسہ اس غضب کا تھا کہ اٹھائے نہ اٹھتا ۔۔ رکھے نہ رکھا جاتا ۔۔

" اے میری زبان جلے جو جھوٹ بولوں ۔۔۔ ہماری اماں کے گھر میں ایک کوٹھری تھی ۔۔۔ اچھی خاصی چوڑی چکلی ۔۔۔ وہاں روپوں کے بدرے پڑے رہتے ۔۔۔ لگان آتا ۔ کپاس بکتی ۔ گیہوں بکتا جو بھی روپیہ آتا جمع ہوتا ۔۔۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی ۔۔۔ ایک برسات ایسی آئی کہ کوٹھری ٹپکنا شروع ہو گئی ۔ بدرے پڑے سڑتے رہتے اور سارے روپے ایک دوسرے سے جڑ گئے ۔۔ بیلوں کی جوڑی چلوائی گئی تب کہیں جا کر روپے کھلے "

سراج بھائی گھر بھر کے بچوں کے ساتھ مل کر پتنگیں اڑاتے غلیل چلاتے تو اماں کہتیں ۔۔

"ارے تم لوگوں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ یہ بھی موئے کوئی کھیل ہیں۔ تمھارے ماموں تھے۔ کبوتر پالتے مرغ۔ اصیل مرغ پالتے۔ بھینسے پالتے ہزاروں کا تو میوہ ہی کھلا دیتے اور پھر انھیں لڑاتے۔ پورے گاؤں میں ان کے مرغوں، کبوتروں کی دھاک تھی۔ وہ وہ لڑائیاں ہوتیں کہ بس۔ جس دن مقابلہ ہوتا وہ تیاریاں ہوتیں۔ باہر والے صحن میں چھڑکاؤ کر کے تخت بچھا دیے جاتے۔ اس پر چاندنیاں اجلی اجلی۔ اور پھر شارے تماش بینوں کے لیے چائے پانی۔ پورے گاؤں میں دھوم مچ جاتی کہ آج حسین میاں کے کبوتر لڑنے والے ہیں۔"

اب بھی اللہ رکھے اماں کا وہی زور تھا۔ پیسے کی کیا کمی تھی۔ گاؤں جیسے گاؤں۔ ان کی ڈھیروں آمدنی۔ گاؤں کی رعیت اپنی غلام۔ یہی اماں کی زندگی تھی مگر بڑے ماموں تو یہ کہتے تھے کہ اب پہلا زمانہ نہیں رہا وہ بات ہی ختم ہوگئی۔ کہاں وہ باداجان کا طنطنہ اور کہاں ہماری یہ ردّی حالت۔ اللہ جانے کیا قارونؔ کا خزانہ دیکھے بیٹھے تھے کہ کوئی چیز نگاہوں میں نہ جچتی۔

اماں کو اپنی شادی کے قصّے سنانے میں بڑا مزہ آتا۔ "اے چاندی کی تھالیوں میں لڈو بٹے تھے۔ پوری بارات کو۔ اور بارات بھی اِتّی اُتّی تھی؟ پورا گاؤں اٹا پڑا تھا۔ اور پھر ہمارے باداجان کا ہاتھ۔ کہ ہڈّی نام کو نہ تھی۔ سننے والوں نے تو منہ میں انگلی دے لی تھی۔ اے میں کہوں دیتا بھی کون ہے چاندی کی تھالیاں۔ اور ایسی تھالیاں نہیں کہ ماشے میں گدھا مڑھ دیا جیسے پتلی پو پڑا۔ ارے دس دس تولے کی ایک ایک تھالی تھی۔"

اماں نے بڑے چاؤ چونچلوں سے سراج بھائی کی بات پکّی کی۔ منگنی میں

بڑا دھوم دھڑکا مچایا۔ چار دن پہلے سے تو دھنا میراثن اپنے پورے گھرانے کو لیے بیٹھی تھی ـــــ اماں کا کہنا تھا "چلتے چلاتے شادی بھی رچا ہی ڈالو بیٹا۔ پھر میرا تھکا وقت آرہا ہے یا جارہا ہے؟ دیکھ لو بیٹھتی ہوں تو کھڑا ہونا مشکل ۔ کھڑی ہوجاؤں تو بیٹھنا مشکل ۔"

سراج بھائی نے نا نہیں کی ۔ بولے "اماں مذاق سے کہتا تھا میں تو ۔ بھلا خوابوں کے سہارے بھی جیا کرتے ہیں ۔ آپ مقرر کر لیجئے تاریخ ـــــ آپ کی خوشی میرا دین ہے ۔"

اماں نے چٹ چٹ بلائیں توڑیں ۔ ایسے سعادت مند بچے ہوتے ہی کہاں ہیں ۔ چار حرف پڑھ کر ماں باپ کو ابے ارے کرتے پھرتے ہیں ۔ سراج میاں جیسا بیٹا ایک تو ہوے ۔ اماں کو اور کیا چاہئے تھا۔ ابھی تو منگنی کے چوچلے ہو رہے تھے ۔ ادھر اماں نے شادی کی بھی دھوم مچادی۔

سب سے پہلے تو اماں کو گھر سجانے کی سوجھی ۔

اماں کا گھر بھی ایسا ویسا نہ تھا۔ ہزاروں سے روپیہ اس کی اینٹ اینٹ میں بھرا گیا تھا ۔ یہ لٹکتے ہوئے بڑے بڑے فانوس اماں نے ابا سے لڑ لڑ کر شہر سے منگوائے تھے ۔ دیوار گیریوں کے چم چماتے بھالے ۔ ذرا پیچ در پیچ پردے، جن پر موتیوں کی بیلیں مڑھی ہوئی تھیں ۔ ایک ایک پردہ اتنے روپیوں میں آیا تھا کہ پورے سال بھر کی لگان بھی پوری نہ پڑ سکی ـــــ اماں کو اچھی اچھی چیزیں جمع کرنے کا کیا شوق تھا ۔ تھیں تو پرانے زمانے کی مگر اپنے گھر کو ایسا سجا کر رکھا کہ بڑے انگریزی داں بھی آئیں تو منظر بھر ٹک ٹک دیکھتے جائیں ـــــ ابا جان کے کسی دوست کی بیگم انھیں شہر لے گئی تھیں ۔ وہاں

ان کے ڈرائنگ روم میں میز پر بیچوں بیچ ایک مجسّمہ بھی رکھا ہوا تھا۔ بیٹھ پر تھیلے میں تیر۔ اور ہاتھ میں کمان۔ بس اماّں تھر آکر ابّا کے سر ہی تو ہو گئیں کہ "ہمارے گھر میں بھی ویسا ہی مجسّمہ لاؤ"

ابّا ہاں ہاں کر کے ٹالتے ہی رہے پھر بھی لاتے ہی بنی۔ وہ تو اماّں تھیں۔ جو سوچتیں وہ کر نہ گزرتیں۔؟

ایسا خوبصورت گھر تھا کہ گھر کہنا بھی اس کی شان کو گھٹانا تھا۔ سامنے ہی باغ تھا۔ ہرا بھرا۔ پھول بیلوں سے لدا پھندا۔ باغ کے بیچ میں حوض۔ رنگا رنگی مچھلیاں۔ ابّا کبھی مذاق کی جون میں آتے تو بولتے۔

"ایک جنّت تو شدّاد نے زمین پر بنائی تھی۔ یا پھر اب ہماری بیگم نے بنائی ہے۔"

شدّاد تو آرزو لے کر ہی چلتا بنا۔ یہاں تو اماّں بھر پور راج رچ رہی تھیں ایک کھڑکی ایسی تھی چھت پر۔ کہ ادھر چاند نکلا اور چھکا چھک اجالا گھسا بڑے کمرے میں۔ کھڑکی میں سے پورا چاند بیٹھے بیٹھے نظر آتا۔ ماموں جان نے ایک بار دیکھا تھا تو مسکرا بولے تھے۔

"تمہارا گھر تو پورا چاند محل ہے۔ فرق ہی کیا ہے؟ وہ بھی روشن۔ یہ بھی روشن" بس تب سے اماّں والے گھر کا نام ہی چاند محل پڑ گیا۔ اور ابّا تو جنّت بولتے ہی تھے۔

سراج بھائی کو سدا چاند محل دیکھ کر تھرتھری آتی۔ تھے تو اللہ والے۔ کچھ نہ کچھ خیال آتا ہی ہو گا۔ بیٹھے بیٹھے بولنا شروع کرتے۔

"کسی چیز کا، گھر کا، بچے کا، جانور کا نام بھی ذرا سمجھ بوجھ کے رکھنا چاہیئے۔

— یہ کیا ہے جو دل میں آیا اٹھا یا رکھ دیا۔ اب بھلا چاند محل بھی کوئی نام ہے۔ نام رکھتے وقت کچھ خیال ہی کیا ہوتا۔ چاند میں سیاہ سیاہ سا دھبہ ہے — اور میں کہتا ہوں جو چاند محل کو بھی سیاہی گھر گئی تو —؟ ابا مرحوم جنت کہہ کہہ کر مر گئے — اس جنت میں کسی کو رہنا بسنا نصیب نہ ہوا — میں کہتا ہوں پہلے کے یہ بزرگ —"

چاند محل میں رات سبے رات چاندنی جھلکتی رہتی — یہ منّو ماں ہے — لمبے لمبے بالوں والی — ایسے لمبے بال تھے کہ ایک رات خالہ بی اپنے بستر پر اٹھ بیٹھیں — چلا چلا کر پورے گھر کو جمع کر لیا —

ارے دوڑیو — سانپ — ناگ ہے پورا — ارے بچائیو! بچائیو دوڑیو کی ہا ہا کار سن کر سب ہی تو جاگ پڑے — بتی اونچی کی اور دیکھا تو منّو ماں کی چوٹی ان کے پلنگ سے نیچے لوٹ رہی تھی —

اے بی تم اپنے بال سمیٹ کر رکھا کرو — جی ہول گیا موا — بھلے کو دم نہ نکل گیا میرا —" وہ ہنسی کی دھوم مچی پورے گھر میں کہ توبہ — اب منّو ماں بیچاری ہے کہ شرمائے جا رہی ہے، تھوڑی تھوڑی ہوئی جا رہی ہے — نہا کر بال کھلے چھوڑ دیتی تو لگتا سیاہ چادر ہے جو پورے جسم پر لپیٹ لی ہے — شمّو بیگم تھیں — وہ بھولا بھالا چمکتے چاند ایسا پیارا چہرہ — پیاسا دیکھے تو پیاس بھول جائے — ہنستی تو پھول جھڑتے — دھان پان ایسی کہ چلتی تو دھڑکا لگا رہتا کہ ہوا سے اڑ نہ جائے — پتلے دبلے ہاتھ پاؤں — اجلی اجلی نازک انگلیاں — پھر ثریا تھی — ہونٹ سے ہونٹ تو ملتے ہی نہ تھے کبھی — جب دیکھو تب ہنس رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے۔ چلتے میں کسی کو ٹھولا مار دیا کسی کو دھکا دے دیا اور بس وہی ہلڑ مچانے

میں اوّل نمبر ــــ اور پھر زینو بی بی ــــ صابرہ بیگم ــــ شنّو بی ــــ سبھی تو تھیں ـــ چاند محل میں رات دن ہزاروں چاند چمکا کرتے ــــ کہ دیکھنے والی آنکھیں چکاچوند ہو کر رہ جائیں ــــ

کس بات کی کمی تھی ــــ پھر بھی امّاں تل گئیں گھر سجانے کو ــــ اور سچ جو پوچھو تو سجانے کو تھا بھی کیا ــــ؟ ہر چیز تو اپنی جگہ درست تھی ــــ نندوں، بھاؤجوں نے چھیڑا تو امّاں بولیں۔

"اے غصہ نہ دلاؤ بہن ــــ ماں کا دل لے کر دیکھو تب پتہ چلے گا ــــ اور اب تو اللہ رکھے میرے گھر خوشیوں کا زمانہ آرہا ہے۔ بٹیا تو ایک تھی سو پیا کا دیس بسانے چلی گئی۔ اب میرا میاں ہے۔ خوشیوں کا مینہ برسے گا مینہ اور کیا ــــ؟ دیکھو پورے گھر میں وہ رونق دوڑ جائے گی کہ لوگ منہ تکیں گے۔"

پھر وہ بڑی بھاوج سے رائے لینے پر جٹ گئیں ــــ

"میں کہوں سونے کی پائلیں ہوں اور ان میں گھونگرو تو گھر میں ذرا بھی تو پتہ چلے گا کہ بہو آئی ہے۔"

"سونے کے چندن ہار میں چکیوں کی بجائے پتّوں کی بوٹ ڈلواؤں گی ــــ وہ تو پرانی وضع ہے موئی ــــ سلیمہ آپا کی بیٹی کے پاس تو وہی پرانا سا ہے۔"

"اجی بڑی آپا ــــ زمانہ بدل رہا ہے ــــ اکلیاں اور کھڑے دوپٹے تو ہوں گے ہی ہوں گے ــــ میں کہوں تھوڑی بہت ساڑیاں کیوں نہ خرید لیں ــــ شہر سے وہ سراج میاں کے دوست کی بہن آئی تھیں نا ــــ کیسی جگ مگ جھمّکا جھول ساڑی تھی ــــ پلو پر کامدانی بھی تھی اور کرن کا حاشیہ بھی ــــ"

ڈھیروں کپڑا تھا اور گوٹا ٹھپہ کناری کی وہ ریل پیل کہ لگتا اماں نے بزازی کی دکان کھول لی ہے ۔ شادی کے دن قریب آرہے تھے اور اماں کا چلّوؤں خون بڑھتا جاتا ۔ بڑھاپا تو تھا مگر گال دیکھو تو خون جھلکی مارجاتا تھا ۔ چال میں وہ تیزی اور طنطنہ آگیا تھا کہ پلنگ سے انھیں تو پلنگ کی نواڑ ساری چرچرا کر رہ گئی ۔ گرد کی ایسی دھول اڑی کہ چھوٹی نند کو بھی مذاق کا موقع ہاتھ لگ گیا ۔

" بھاوج ماں ۔ اب یہ حال ہے تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتی ہوں گی پہلے آپ ۔" اور وہ معنی خیز ہنسی ہنسنے لگیں ۔ اماں بھی ہنسیں ۔" اری بوڑھی سے مذاق کیا کرتی ہے ۔ گذر گیا وہ زمانہ بھی ۔ یہ تو اولاد کے دیکھنے کے دن ہیں ۔"

چاند محل میں وہ گڑبڑ ہوئی کہ توبہ ۔ لوگ راتوں کو سونا بھی بھول گئے ۔ چاند دھیرے دھیرے چڑھتا ہوا بڑے کمرے میں گھس جاتا ۔ گلاب کی ٹہنیاں نیچے جھک آتیں ۔ موتیا کے پھولوں کی خوشبو سارے محل میں رچ بس جاتی ۔ اندھیرے اجالے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے اور ادھر چھوکریاں بالیاں ہیں کہ نیند آنکھوں سے اڑ کر بھاگ گئی ہے ۔ غرارے سل رہے ہیں ۔ کرتے قطع ہو رہے ہیں ۔ چمکیوں اور کرن کے بنڈے کے بنڈے کھل رہے ہیں ۔ رات ہے مگر فانوسوں کی وہ جگ مگاہٹ ہے کہ پتہ نہیں چلتا دن کدھر سے گھس آیا ہے ۔ چم چم کرتا اجالا ہے ۔ زری اور بادلے کے ڈھیر کرنیں سی پھینک رہے ہیں ۔ اور دھڑادھڑ سلائی ہو رہی ہے ۔

" اماں رات کو ابا خواب میں دکھائی دیئے ۔" ناشتے پر ایک دن سراج ۔

بھائی بولے ۔

اماں ، کے ہاتھ کا نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جا گرا ۔" سچ "؟ پھٹی ہوئی آنکھیں بول اٹھیں ۔

" ہاں ہاں جھوٹ تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں " سراج بھائی کنمنی سی آواز میں بولے ۔

" کیا کہا " اماں سہمی ہوئی سی آواز سے بولیں ۔

سراج بھائی ہنس پڑے " بولے وولے کچھ بھی نہیں ۔ بس میں کھڑا تھا تو مسکرا کر دیکھتے رہے اور پھر جیسے ہوا میں اڑ گئے ۔ بعد میں دیکھتا ہوں تو ابّا تو اڑے چلے جا رہے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز پکڑے ہوئے ہیں ۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ گیہوں کی دو موٹی موٹی روٹیاں ہیں ۔ اماں ۔ خواب میں مردے کا کھاتا دکھائی دینا بہت برا ہے ۔ میں آج ہی ابّا کو دو پارے پڑھ کر بخشوں گا ۔"

جیسے اماں کو کچھ یاد آیا ۔ بولیں ۔" ہاں میاں اگر خواب میں دانت گرے ہوئے دکھائی دیں تو ۔۔؟؟"

سراج میاں ہڑبڑا کر بولے "کیوں ۔؟ کس کو دکھائی پڑے ؟"

اماں بھی ہول کھا گئیں بولیں ۔" مجھے ہی دکھے میاں ۔ بس میں اسی چوکی پہ آنگن کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی ایسا لگا جیسے میرے دانتوں میں چل سی ہو رہی ہے ۔ بس میں نے ذرا کی ذرا تھوکا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے سارے دانت گر گئے پھر اس کے بعد میری چوکی کو آپی آپ دھکا سا لگا ۔ اس کے بعد جانے اور کیا دکھتا کہ اکدم کسی نے میرے پلنگ کو دھکا دیا اور میری

آنکھ کھل گئی۔

سراج میاں نے کھاتے برتن پر سے ہاتھ سمیٹ لیا۔ دلی پریشانی چھپا کر بولے "خیر۔ ایسے خواب تو دکھتے ہی رہتے ہیں۔ آیتیں دم کر کے سونا چاہیئے۔ پھر انھوں نے سب کو سنایا۔ "میں ایک آیت بتاتا ہوں۔ اسے پڑھ کر سینے پر دم کر لینا چاہیئے۔ اللّٰهُمَّ بِسْمِكَ اَمُوْتُ وَ اَحْيَا اور پھر سیدھی کروٹ سو جانا چاہیئے۔ بائیں کروٹ کوئی نہ سوئے۔ دل دبتا ہے تو برے برے خواب نظر آتے ہیں۔"

اس رات سراج میاں کا دل آپ ہی آپ ہول ہو رہا تھا۔ جمعرات کی رات تھی۔ وضو کر کے انھوں نے یٰسین شریف پڑھا۔ سوتے وقت آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کی اور سیدھی کروٹ سو رہے۔ نیند جیسے شرط لگا کر بیٹھی تھی کہ آؤں گی نہیں۔ سراج میاں کا دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا۔ جاگتے جاگتے ہی تین کے گھنٹے ہو گئے۔ چاند اتر کر گھٹ رہا تھا۔ سراج میاں نے تہجّد کی نماز پڑھی۔ دیر تک بیٹھے وظیفہ کرتے رہے۔ پھر آ کر لیٹ گئے۔ چاند سیدھا منہ پر چمک رہا تھا۔ جھاڑ کی اوٹ میں ہوا تو ان کے منہ پر اندھیرا پڑ گیا۔ اور ان کو ذرا کی ذرا جھپکی سی آ گئی۔ آنکھ جو چٹ سے کھلی تو بڑی مسجد کے موذن کی آواز کان میں پڑی۔ اکدم اٹھ بیٹھے۔ جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ سانس دھونکنی ایسے چل رہی تھی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے، آنکھوں پر ہاتھ پھیرے تو گیلی گیلی سی تھیں۔ پھر اکدم سے وہی خواب آنکھوں میں پھر گیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بڑا پراسرار اندھیرا سارے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال لال روشنی سی پھیلی اور اجالا ہو گیا۔ اب جو غور سے دیکھتے ہیں

تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لال روشنی جو پھوٹ رہی ہے وہ سورج نہیں ہے۔ خون کا دریا جیسا ہے اور چڑھے جا رہا ہے۔ پھر یکا یک چاند محل ڈولنے لگا۔ ہوا نہیں ہوا کا ہلکا سا جھونکا تک بھی نہیں مگر عالم یہ ہے کہ چاند محل کٹی پتنگ کی طرح ڈولے جا رہا ہے۔ اتنے میں دکھائی دیا کہ اماں ادھر سے مشعل لیے آتی ہیں۔ دھاڑوں سے رو رہی ہیں مگر منہ سے کچھ بولتیں نہیں۔ سراج میاں پوچھتے ہیں کہ اماں ہوا کیا۔ بولو تو سہی۔ سلام نہ کلام۔ بس چپ چاپ بڑھے جاتی ہیں۔ اکدم چاند محل زور زور سے ڈولنے لگا۔ اب تو اماں آواز سے رونے لگیں اور چیخ کر بولیں۔ میرا ایک چراغ تھا وہ بھی گل ہو گیا۔ ایسا کہتے ہی مشعل آپ ہی آپ بجھ گئی۔ اماں نے جھٹ محل کا صدر دروازہ کھولا اور وہ چاند محل میں گھس گئیں۔ اب ہر طرف بھکا بھک اجالا ہو گیا۔ بس آگ کے شعلے تھے کہ گھرے چلے آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاند محل تھرایا اور خون کے دریا میں جا پڑا۔ بس ایک ذری دیر کو اماں دکھائی دیں کہ ادھر چٹ سے سراج میاں کی آنکھ کھل گئی۔

بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اپنا خواب خود ان کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔ عالم یہ تھا کہ مسلسل کانپے جا رہے تھے۔ اٹھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور جب مسجد کی طرف چلے ہیں تو یہ حالت تھی کہ بچوں کی طرح ٹھسک ٹھسک رو رہے ہیں اور آسمان کی طرف دیکھے جاتے ہیں۔!

پاکستان بن گیا —

مسلمانوں کو گوہر مراد مل گیا —

اب کیا ہو گا —؟

مرد لوگ بیٹھک میں بیٹھے تو اخبار ہاتھوں میں تھے اور جتنے منہ اتنی باتیں ۔ پھر سب کو ایسے سانپ سونگھ گیا کہ گم سم بیٹھے ہیں مگر زبان نہیں کھلتی ۔

"اب کیا ہوگا میاں ۔؟" ماموں میاں نے جمیل میاں سے پوچھا ۔ حال ہی میں علی گڈھ سے پڑھ کر آئے تھے ۔ شہروں کی سٹر ہزار باتیں سناتے تھے اور ہر مشکل مسئلے کا حل بتا سکنے کا دعوی کرتے تھے ۔

"اب تو ہر طرف آگ لگ جائے گی آگ ۔ پتہ نہیں کیا ہوگا اور کیا ہونے والا ہے ۔" انھوں نے پریشانی سے کہا ۔ "اور سنا ہے کچھ ۔"؟.... ماموں نے آواز نیچی کرلی ۔ گھر تو عورتوں سے بھرا پڑا تھا ۔ بات کا بتنگڑ بن جاتا ۔

اکدم سراج میاں بولے ۔ "آپ لوگ تو اس دن سنتے تھے ۔ جھنا اماں کے خواب کی تعبیر یہی ہے ۔ اب دیکھیے ہر طرف سچ مچ آگ لگے گی ۔ پھر کہیے گا کہ جھنا اماں خرانٹ بڈھی ہے ۔"

خاموشی اور بھی پر اسرار ہوگئی ۔

"جہاں تک بنے خدا کی عبادت کرو ۔" سراج میاں نے دل ہی دل میں کانپ کر کہا ۔ کلام اللہ میں بڑی برکت ہے ہر بلا ٹل جاتی ہے ۔"!

جمیل میاں نے بگڑ کر کہا ۔ "یہ خون خرابے ہوں گے تو کیا آیۃ الکرسی پڑھنے سے رک جائیں گے ۔"؟

جمیل میاں بے بات گرم ہو رہے تھے سراج میاں ٹال گئے ۔

رات کو سراج میاں سونے کے لئے لیٹے تو چاند ان کے منہ پر چمک

رہا تھا۔ انھیں ایسا لگا کہ چاند کے سیاہ دھبّے سرخ ہو گئے ہیں اور ان سے لہو ٹپک رہا ہے۔ وہ ساری رات جاگتے رہے۔

"اب بھلائی اسی میں ہے کہ اپنی جوان بیٹیوں کی عزت محفوظ رکھنے بھاگا جائے" ماموں میاں نے اخبار سب کے سامنے کر دیا۔

منّوماں تھی۔ جس کے لمبے لمبے بال تھے اور نہا کر چھوڑ دیتی تو لگتا کہ سیاہ چادر اوڑھ رکھی ہے۔

پھر شمو تھی۔ چاند ایسی چمکتی صورت۔ ہنستی گاتی بھولی بھالی مینا۔ اور ثریا تھی کہ بس مسکرائے جاتی اس کے ہونٹ تو ادھ کھلی کلی کی پتیوں کی طرح کانپے جاتے۔ ان سب کا کیا ہوگا۔؟

زینو بی بی۔ صابرہ۔ اور شنوماں۔ یہ کھلتی ہوئی کلیاں۔ جن سے ابھی باغ مہکنے والا تھا۔ ان سب کا کیا ہوگا۔

"پھوپھو جان آپ تو اپنی بیٹی کو لے حیدر آباد چلی جائیے"؟ جمیل میاں نے رائے دی۔

"میں اکیلی عورت ذات کیسے جاؤں۔ کوئی ساتھ والا بھی تو نہیں"؟ اور پھوپھامیاں کی یاد میں ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگیں۔ کیسا بے وقت ساتھ چھوٹا کہ تنکے کا بھی سہارا نہ رہا۔

"میں بھی تو جاؤں گا" ماموں میاں بول اٹھے۔ یہ اتنی جوان جوان لڑکیاں۔ خدا وہ دن نہ دکھائے۔ اگر کچھ ہو ہوا گیا تو بن موت مر جائیں گے۔ اس سے اچھا تو یہ ہوگا کہ خود ہی اپنے ہاتھوں زہر پلادیں۔ عزت جیسی چیز تو بچ جائے گی"

" آپ چلے جائیںگے تو پھر ...... سراج میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔
" ارے سبھی چلیں گے میاں۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے ۔ میں تو دیکھوں گا اور بن پڑا تو پاکستان چل دوں گا ۔"
سونے کی پازیب میں گھونگھرو تو ہونے ہی چاہئیں۔ کچھ تو پتہ چلے گا کہ گھر میں بہو آئی ہے "!
" اماں ۔ اماں ۔" سراج میاں جھنجھوڑتے مگر اماں پر اس بری طرح ہزیان چھایا تھا کہ بڑبڑائے جاتیں۔
" چاندی کی چوکی تو دولہن کے نہانے کے لیے ہے۔ توبہ ہے سلیم میاں مسہری کے ڈانڈے پیتل کے پڑ گئے ۔"
ادھر چاندنی پھوپھی بی کے رخساروں کی طرح رنگ کھو چکی تھی۔ پیلی پیلی بے نور ۔
ماموں میاں کا خط آیا۔
" بڑی بری خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ ہم تو مرتے پڑتے یہاں تک جیسے تیسے پہونچ گئے۔ جلنے کی راہ ہوتے ہوئے آئے۔ پونے دو دن کا راستہ ہے مگر پورے تیرہ دنوں میں پہونچے ہیں۔ راستوں میں کٹے ہوئے سر ہیں۔ دھڑ ہیں اور سڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ۔ سن رہے ہیں ادھر حالات بہت کڑے ہو گئے ہیں۔ تم بھی آجاؤ۔ سر چھپانے کو جھونپڑا مل جائیگا۔ یہاں ظہیر یار جنگ کی ایک کوٹھی مل گئی ہے ۔ بس اس میں رہ رہے ہیں۔ اپنا چاند محل بہت یاد آتا ہے۔ مگر اب کہاں وہ زمانہ ۔ اتنا رو چکے ہیں کہ آنسو بھی سوکھ گئے ہیں کچھ بھی کر کے چلے آؤ۔ پھر پاکستان جانے کے بارے میں سوچا جائے گا۔"

"اماں چلوگی پاکستان"؟

"اونہوں"!

"اچھا تو اماں حیدر آباد چلو ــــ وہاں چار مینار ہے اور اماں وہاں بہت اچھی اچھی چیزیں ملتی ہیں ــ چاند محل کو خوب سجا لینا ــ پھر چاند جیسی دولہن لانا۔

ــ آں اماں"؟

میاں ــ سراج میاں میں صدقے گئی ــ میری بچی کو بچالو ــ کیسی تباہی آئی ہے مولا" جھنا اماں گرتی پڑتی آئی ــ اور سراج میاں کے پیروں میں لوٹ گئی ــ

سراج میاں نے گڑبڑا کر دیکھا ــ سکینہ جھنا اماں کے کندھے سے لگی کانپ رہی تھی ــ

" بولو میاں کیا کروں اس جوان بچی کا حشر ــ اس سے تو اچھا ہے کہ آپ ہی آگ لگادوں"؟

" نہیں جھنا اماں ــ ایسا مت کرو ــ میں جو موجود ہوں ــ دیکھو تم فکر نہ کرو ــ میں اسے اور تمہیں دونوں کو ماموں میاں کے پاس چھوڑ آتا ہوں ــ ادھر اللہ نگہبان ہے اماں کا" "وہ تو چاند محل چھوڑنے والی نہیں" ــ رک کر بولے۔

"کیوں کانپ رہی ہو بہن ــ میں موجود ہوں تمہارے لیے"

سراج میاں نے منہ ہی منہ میں آئتیں بدبدانی شروع کر دیں ــ

" بھیا" سہمی ہوئی آواز میں سکینہ چیخی ــ

"کوئی بات نہیں اوپر اللہ ہے"

"سراج میاں۔ سراج میاں۔ سراج میاں" چھنا اماں کی آواز ابھری۔
ابھری اور پھر ڈوب گئی۔

"بھیا۔ بھئی۔ یا۔" سکینہ کی آواز چاند میں سے آرہی تھی۔ یا اس سے بھی کہیں دور سے۔ بس آگ کے شعلے تھے کہ گھر سے چلے آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاند محل تھرّایا اور خون کے دریا میں جا پڑا۔ بس ایک ذری دیر کو اماں دکھائی دیں۔ ہاتھ میں مشعل لیے۔ پھر مشعل بجھ گئی۔

"میاں۔ او میاں۔ یہ چوکی بالکل چھوٹی ہے۔"

"سونے کی پازیب میں گھونگھرو بھی نہیں لگوائے تم نے۔ چھنا کا کہاں پیدا ہو رہا ہے"۔؟ کیا کہیں گے کہنے والے۔ کیسی پائل بنوائی کہ جھنکار بھی نہیں ہے۔"

"فانوس بجھ رہے ہیں۔ ارے یہ چاند پر سیاہی کیسی تیر رہی ہے"؟
میری آنکھوں میں دھند سی چھا رہی ہے۔ بیٹا۔ او بیٹا۔ میاں۔ سراج میاں۔ کوئی نہیں بولتا۔ کوئی جواب نہیں دیتا۔

"نہیں نہیں۔ یہ جنت ہے میری۔ میں اسے مرے دم تک نہیں چھوڑوں گی۔ اس کے ذرے ذرے سے مجھے پیار ہے۔"

"میاں پھر ایسا لگا کہ آپی آپ میرے سارے دانت جھڑ گئے ہیں اس کے بعد۔ اس کے بعد میری آنکھ....

"ایک جنّت تو شدّاد نے زمین پر بنوائی تھی یا پھر اب ہماری بیگم نے بنائی

ہے ـــ"!

شدّاد تو آرزو دے کر ہی چلتا بنا۔ یہاں تو امّاں بھرپور راج رچ رہی تھیں ـــ ایک کھڑکی ایسی تھی چھت پر کہ ادھر چاند نکلا اور چھکا چھک اجالا گھسا بڑے کمرے میں ـــ کھڑکی میں سے پورا چاند بیٹھے بیٹھے نظر آتا ـــ ماموں جان نے ایک بار دیکھا تھا تو مسکرا کر بولے تھے ـــ "تمہارا گھر تو پورا چاند محل ہے ـــ"

بس تب سے امّاں والے گھر کا نام ہی چاند محل پڑ گیا ـــ اور ابّا مرحوم تو اسے جنّت بولتے ہی تھے ـــ

شادی کی رات

بیٹھک سے لے کے اندر برآمدے تک برآمدے سے لیکر دالان تک دالان سے لے کر۔ غرض کہ پوری حویلی میں عجیب سہما سہما سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ صبح ہی صبح روز کی طرح گلابو سلیم میاں کے پاؤں دبانے ان کے بستر پر کھڑی تھی کہ ناگہاں سلیم میاں نے اس کا ہاتھ جھپٹ کر اسے اپنی رضائی میں کھینچ لیا۔

منجھلی پھوپھی نے یہ کاروائی دیکھ لی اور چونکہ بمبک نالی کی طرح وہ کوئی بات اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتی تھیں اس لئے جھٹ سے جا کر صفیہ بی سے لگا دیا کہ "اے تمہارے میاں کی مت ماری گئی ہے گلابو سے ٹھٹھیل ہو رہی ہے"

صفیہ بیگم کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ جھرجھرا کر پھوپھی کو دیکھا اد

بولیں ۔۔ "آپ سدا لوں ہی دو کی تین لگایا کرتی ہیں ۔"

"اے میرا کیا پیٹ بھرتا ہے دو کی تین کرنے سے ۔ پاؤں اللہ نے دیئے ہیں چل کر دیکھ ہی نہ لو ۔"

ہر چند کہ یہ سخت گناہ کی بات تھی کہ دو کے بیچ میں آنکھ جھکائی جائے مگر منجلی پھوپھی کو منزل پہونچانا بھی تو تھا ۔

دبے دبے پیروں سے چلتی چلتی دونوں بڑی کھڑکی کے پاس پہونچیں تو صفیہ بیگم نے سچ مچ ہی اپنی آنکھوں دیکھا ۔ گلابو کا تو نام ونشان نہیں ، مگر یہ کیا ضرور ہے کہ گلابو .... انہوں نے پھر بھی اپنے میاں کو بے گناہ ٹھہرانا چاہا ۔

"اے بی تمہاری عقل ہے کہ واہ ۔ میں کہوں تم نے تیرہ برس ملیچ رچا ڈھیر سے بچے پیدا کئے اور تمہیں اتنا ہی نہیں معلوم کہ ....

سلیم میاں کے کان بھی چوہے کی تیزی کو مات کر گئے ۔ انگرم سے انہوں نے دھکا دے کر گلابو کو لوٹ دیا ۔

"کم بخت کو پیر دبانے تک کا سلیقہ نہیں ۔ یہ کدھر گھسی چلی آرہی ہے ۔"

صفیہ بیگم نے ہولا کر منجھلی پھوپھی کو دیکھا ۔ منجلی پھوپھی نے گلابو کو دیکھا مگر ذرا ہنس کر بولیں ۔

"وہ تو کمبو کا شت کاری" ابھی نہیں ہوئی ۔"

"کیا مطلب ۔ ؟ صغیہ بیگم چڑ گئیں ۔!

"دوئی مطلب وطلب کی اس میں کون بات ہے ۔"

سلیم میاں کو اپنی بے گناہی جتانی منظور تھی اور سوائے منجلی پھوپھی کے کس کے سامنے رونا رو سکتے تھے ۔

"قسم اللہ کی بنئے پھوپھی وہ پلنگ نواڑ کا ہے ۔ وہ ایک جھکولے سے میرے بازو آپڑی ۔"

"اچھا میاں! آ بھی پڑی تو اسے رضائی سے کس نے ڈھانپا ۔ موئی گلابو نہ ہوئی عید بقرعید کا حصہ ہوگئی کہ سرپوش سے ڈھک دیا ۔"

سلیم میاں نے غصے سے ان کی طرف دیکھا ۔ تو مطلب آپ کا یہی ہے کہ میں نے جان کر اس کا ہاتھ پکڑ کر گرا لیا ۔"

"یہ خود تم ہی کہہ رہے ہو میاں ۔ میں نے کب کہا ہے بھلا ۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔ انسان تھکا ماندہ ہو کر آتا ہے تو اسے اتنی بھی مہلت نہیں کہ چار گھڑی پاؤں ہی دبوا لے ۔"

"تو میاں تم پاؤں دبوانے کے لئے اس کنکالہ کو ہی کیوں چڑھائے لیتے ہو ۔ کیا رحیمو نہیں ہے ۔"

"وہ ۔ وہ ۔ پہلے تو سلیم میاں سٹ پٹائے پھر سنبھلے ۔" وہ بات کچھ ایسی ہے کہ اب وہ دبانی ہے تو اسی کے پیروں کی عادت لگ گئی ۔"

"ہونہہ اسی کے پیروں کی عادت لگ گئی ۔ تم، تم نہ ہوئے بھینس ہوگئے کہ تھنوں کو ایک ہی گوالے کے ہاتھوں کی عادت ہوگئی ۔"

سلیم میاں گھر کے مالک تھے چاہتے جو کرتے ۔ مگر کھلے خزانے کچھ کرتے پھرتے یوں بھی تو شرم آتی تھی کہ دو بیٹیوں کے باپ بھی تھے ۔ اور بیٹیاں اللہ رکھے اتنی بڑی کہ کہو تو چوہا سنبھال لیں ۔

"تم کو تو شرم نہیں ۔ گھر میں بچے ہیں ان کا خیال تو ہو ۔"

اب تک تو سلیم میاں طرح دیئے جاتے تھے ۔ مگر اب چڑ گئے ۔

"کمال کی بات ہے منجھو پھوپھی ۔ اب ہماری شرم کو کیا ہو گیا ۔ ہم نے کچھ کیا ہو تو ایک بات بھی ہو ۔ یہاں تو بے قصوری میں جی حضوری ہو گئی ۔"

"اپنا کیا ہے میاں ۔ دو نوالوں کے بھوکے ہیں ۔ زندگی تو تم دونوں کی ہے ۔ ہمارا کیا بھروسہ ۔؟"

مگر حقیقت تو یہ تھی کہ منجلی پھوپھی صرف دو نوالوں کی ہی بھوکی نہ تھیں جب تک اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر نہ لگا دیتیں ان کا پیٹ نہ بھرتا ۔ لڑائی لگا دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ ابھی ابھی دونوں ہنس بول رہے ہیں ۔ میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی ہیں ۔ اتنے ہی اتنے ذرا کی ذرا جو سپاری لینے اٹھیں تو جھٹ جا کے کان بھر دئیے ۔ اب میاں انتظار میں بیٹھے ہیں کہ اب سپاری لے کے آتی ہیں ۔ جب سپاری لے کے آئی ہیں اور یہاں عدالت کی کارروائی ہی ختم نہیں ہو چکتی ۔ وہ تو کہو دونوں ہی کو عقل آ گئی اور سمجھ گئے کہ نہیں ان کا طور کچھ کچھ بھبک نائی سے ملتا جلتا ہے ۔ ورنہ اب تک تو ایک گھر کے دو گھر ہو گئے ہوتے ۔ آج کی بات کو بھی پہلے تو صفیہ بیگم نے مذاق ہی سمجھا مگر جب خود آنکھوں سے رضائی سے بندریا اچھلتی دیکھی تو سمجھ گئیں کہ نہیں تہ میں کچھ نہ کچھ ہے ضرور ۔

سلیم میاں کی پندرہ برس ادھر صفیہ بیگم سے شادی ہوئی تھی ۔ شادی ہوئی اس وقت صفیہ بی کی عمر ۱۵ سال تھی ۔ پندرہ سال تک کون بیٹی بٹھائے رکھتا ہے مگر وہاں بھی عجیب کھیل ہو گیا ۔ صفو کی نہ منگنی ہی ہوئی تھی نہ نسبت ہی طے ہوئی تھی ۔ ہاں تائی جان کے چھوٹے بیٹے کے لیے تاکی ہوئی ضرور تھیں ۔ بس اتنا ہی قصہ تھا ، آگے پیچھے کوئی بات نہ تھی ۔ مگر ایک دن ہوا یوں کہ شہر سے صفیہ بی کے بڑے چچا کے بیٹے چھٹیاں گذارنے گاؤں

آ سئے۔ اب اماں نے تو صفیہ بی کو ہر فن میں طاق کر رکھا تھا۔ کون کام بھلا نہ آتا۔ صبح ہی صبح عابد میاں جب گاؤں کی ہوا کھانے کو نکلنے کو ہوئے تو اماں نے کہا۔

"میاں ناشتہ تو کرتے جاؤ۔"

"باپ رے" وہ چھڑی ہلا کر بولے۔ "اب ناشتہ پکے گا، میں کھاؤں گا پھر جاؤں گا۔ بس اب تو واپسی پر ہی بات اٹھا رکھئے۔"

مگر اتنے کے اتنے باورچی خانے سے گھر کے اتارے گھی کی لپٹیں چلنے لگیں اور جب تک کہ چچی بھتیجے کی بات ختم ہوئی۔ ادھر دسترخوان بھی بچھ گیا۔ قیمہ انڈے بھی تلے گئے اور گرم گرم پراٹھے بھی اترنے لگے۔ اور پھر صفیہ نے آکر نیوتا بھی دے دیا۔

"بھائی میاں دو نوالے ہی لے لیجئے۔ ادھر گاؤں کی سیر کو آپ نکل گئے تو دل پلٹے نہ پلٹے گا۔ انسان کھنچ کر رہ جاتا ہے، بارہ سے پہلے کیا آپ کی واپسی ہوگی۔"

"اچھا" وہ مسکرا کر بولے۔ اور پتلون کے پائنچے ذرا ذرا چڑھا کر دھپ سے بیٹھ گئے۔

شہر میں تو ادندھے سیدھے بازاری گھی اور دوکان کے گیہوں، جیسے بھی بنا بس پیٹ بھر لیا۔ یہاں تو گھی کی خوشبو سیدھی دل تک تیرتی چلی گئی۔ صفیہ پراٹھے اٹھاتی۔ اور چچی بی گرم گرم لا کر سامنے ڈالتی جاتیں۔ ادھر بلی بھر پراٹھے دم کی دم میں چٹ کر گئے۔ نرم نرم ایسے کہ حلق سے اترتے تو معلوم بھی نہ ہوتا۔ اسی جنون میں لگے ہاتھوں تعریف بھی کر دی۔

"ارے واہ۔ صفیہ کیا خستہ پراٹھے ڈالتی ہیں بھئی۔"

"اے لو۔ بس اتنی ہی بات پر اماں کے تو ایک دل کے ہزاروں دل ہوگئے وہ چار چھ دن گاؤں رہے بھی مگر۔ بس اتنا ہی قصہ تھا آگے پیچھے کوئی بات نہ تھی۔ مگر اتری سردیوں میں جب تائی اماں بیٹے کی نسبت لے کر آئیں تو اماں نے محض قیمے پراٹھوں والی بات پر بھرپور جواب دے دیا کہ۔

"ہماری صفو کی نسبت تو گاؤں سے پرے لگی ہے۔"

تائی نے دیدے پھاڑے تو اماں نے وضاحت کی۔

"اے ہماری جٹھانی کا بیٹا شہر میں پڑھتا ہے کہ نہیں۔؟ اس نے اپنے منہ سے بات چھیڑی ہے۔"

اب دن ہیں کہ بیتے جا رہے ہیں۔ صفیہ چاروں طرف سے یوں پھل پھول رہی ہے جیسے ترائی کی بیل۔ مگر شہر سے اب سلام آیا نہ تب۔ ڈیڑھ سال تو یوں گذرا جیسے پلک بھی نہ جھپکائی ہو۔ ادھر کے سارے لڑکے گھ گئے۔ کون جوان لڑکوں کو ڈھیل دیتا ہے بی۔ صفیہ بیگم بیٹھی کی بیٹھی رہیں۔ صورت یوں بری کاہے کو تھی۔ رنگ روپ دو چار سے اچھا ہی تھا۔ اور گن ڈھنگ کی بات تو جانے دو۔ کون ماں باپ اولاد کو سکھانے پڑھانے میں کوتاہی کرتے ہیں۔

صفیہ کی ایک خالہ تھیں جن کے لڑکے، مکتب کی پڑھائی پوری ہوئے بعد گاؤں باہر بھیج دیئے گئے تھے۔ ان بے چاری کا یہ حال تھا کہ کسی تمار تطار میں نہ تھیں۔ وطن تھا نہ دولت۔ مکان تھے نہ گاؤں۔ گنوا رہے۔ کرائے کے مکان میں رہتی تھیں۔ پھر بھلا کیا کسی کی نظروں میں

پہنچنے چلی تھیں) ۔ ؟ ایسوں کی اولاد بھی تو نگاہ میں نہیں چڑھتی ۔ کسی کو یہ تک نہ معلوم تھا کہ بنّے میاں کی تعلیم کیا ہوتی ہے ۔ اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں ۔ ہاں بس ایک بار یونہی صفیہ کے باوا گھومتے گھامتے چلے گئے تو دیکھا کہ مکان کا دروازہ کھلا ہے ۔ گلی سے چراغ کی تھرتھراتی لو ان کے مکان میں گر رہی ہے ۔ اور خالہ ہیں کہ روئی کی پونیاں ، اونچے نیچے ہاتھوں نکالتی بیٹھی ہیں ۔

کئی دنوں بعد بنّے میاں گاؤں لوٹے تو صورت شکل تو بدلی ہی بدلی ۔ گن ڈھنگ بھی بدلے ہوئے تھے ۔ یہ اندازہ تو کون لگاتا کہ کہاں تک تعلیم پائی مگر سر ویسے ہی جھکا رہا جیسے کہ لدی ڈالی زمین کی طرف جھکی آتی ہے ۔

کرایے دار کے تین مہینے چڑھ گئے ۔ نوروپیہ سر پر لگ گیا ۔ اس نے دو دن چار دن انتظار دیکھا ، اور پھر سامان اٹھا اٹھا باہر پھینکنا شروع کیا ۔ جلتا اڑتا سامان تھا ہی کیا ۔ ایک آدھ پٹی ۔ ٹرنک اور یونہی دو چار خالی خولی برتن ۔

صفیہ کی اماں نے یوں نہیں کہ بیٹی کے لیئے داماد ڈھونڈھا ہے بلکہ مروت ناطے انہیں اپنے گھر میں بلا لیا ۔ یوں رشتہ بھی تو آتا ہی تھا ۔ مگر چولہا ہانڈی الگ ہی الگ رہا ۔ اللہ ہی جانے بیچاری کیا پکاتیں اور کیا کھاتیں ۔ چولہا تو برائے نام کبھی کبھار ہی سلگتا تو سلگ جاتا ورنہ یہی ہوتا کہ چولہا ٹھنڈا پڑا ہے اور دھلے دھلائے برتن کونے سے دھرے پڑے ہیں ۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ ہاتھی نکل گیا تھا بس دم باقی تھی ۔ اب بنّے میاں ہاتھ پاؤں ہلا رہے تھے کہ کیسے بھی بنے اور شہر چل دیں ۔ اور یہ بیڑا کٹے ۔

ایک رات بنّے میاں دیر سے لوٹے تو دروازے سے ہی بولے ۔
"اماں جی بڑی بھوک لگی ہے آج تو ۔ ۔ کیا پکایا ہے ۔"

اماں نے چنگیر سے روٹی اور بیسن نکال سامنے رکھ دیا اور خود پھر بستر پر جا پڑیں۔

انہوں نے ایک ہی نوالہ منہ میں رکھا نہیں کہ الجھ پڑے ۔ اماں بی سچ بتانا بیسن میں کتنی ریت ملائی تھی ۔"

اماں چونک کر دیکھنے لگیں ۔" اوئی، لا حول ہے کہ نیچ کھالی ۔"؟

" نہیں ۔ وہ اس ڈھٹائی سے بولے ۔" بات لیکن ہے اچھی ۔ اس طرح بیسن کی بچت ہو جاتی ہوگی ۔ لقمہ رکابی پر سے پھینک کر بولے ۔" میں نہیں کھانا داتا یہ ریت کے گولے ۔"

آنگن میں ایک سایہ سا کانپا اور مرغیوں کے کھڑارٹے کے پاس کھڑی پر رہ گئی ۔ تھوڑی دیر بعد صفو ہاتھ میں دو انڈے لئے ہوئے آئی اور وہیں دروازے کے پاس کھڑی بولی ۔

" خالہ بی ۔ یہ لیجئے ۔ تیل تو آپ کے پاس ہو گا ہی ۔"

اس کے پندرہ دن بعد جب بنے سلیم میاں گاؤں سے شہر چلے تو ساتھ اماں بی کے علاوہ پھول دار لال ریشم میں لپٹی ہوئی صفیہ بھی تھی ۔ گاڑی میں دھچکے لگتے تو صفیہ کا خوشبودار جسم ان کی پیٹھ سے ڈھکے کھانے لگتا اور ریت کے گولے جیسے ان کے حلق میں اٹکنے لگتے ۔

بڑے بوڑھے بہو کے قدم کا شگن بہت مانتے ہیں ۔ صفیہ کا قدم بھی بڑا بابرکت تھا ۔ سلیم میاں نے تن من دھن کی بازی لگا کر، فاقے کر کر کے ٹیوشن کر کر کے وکالت پاس کی تھی ۔ پہلے تو یوں ہی سی آمدنی ہوا کی ۔ لیکن دن گذرتے گئے اور گھر میں گویا پھاوڑے لگ گئے ۔ یوں کہ برس دو برس

بعد صفیہ جب میکے لوٹی ہے تو جسم ہونے سے پیلا تھا اور میاں تو واری پلہاری تھے کبن داموں ایسا ہیرا ملا۔ بیوی میاں پر نثار ہیں تو میاں بیوی پر فدا۔ قابل رشک زندگی تھی ۔ اور بڑے مزے سے گذر رہا تھی ۔

مرد کا دل پلٹتے دیر نہیں لگتی ۔ جس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ڈال محبت جتاتے ہیں، بات کی بات میں اس سے آنکھیں پھیر بیٹھتے ہیں اور یوں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔

سلیم میاں کے دل میں محبتِ بیرت کا وہ جذبہ تھا کہ بولنے بتانے کی بات نہیں ۔ سمجھنے کی بات تھی ۔ کبھی جھوٹوں بھی اپنی بی بی کو تکلیف نہ ہونے دی ۔ زچگی تو صفیہ بیگم کی ہوتی اور دردزہ ان کے شروع ہو جاتا ... ہر چیخ پر آنسو نکلے پڑتے ۔

منجلی پھوپھی سلیم میاں کے رشتوں سے آتی تھیں ۔ ان کے مرد کا انتقال ہوا تو کوئی انھیں پوچھنے والا نہ تھا ۔ بس سلیم میاں ہی ایسے دکھائی دیئے جن سے کچھ امید ہو سکتی تھی اور ان ہی کے منہ آپڑیں ۔ بچاری اپنی عادت سے مجبور تھیں ۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا ۔ جہاں موقعہ ملتا بس دو نو میں لگا دیتیں ۔ نہ اس سے کچھ فائدہ ملتا نہ نفع ۔ مگر بس عادت جو تھی ۔ سلیم میاں کا دل پھیرنے کا انہوں نے ایک سے بڑھ کر ایک جتن کیا مگر وہ تو ایسے پکے تھے ہنس کر ٹال جاتے ۔

"منجھے پھوپھی ۔ وہ ہنستے ہنستے بولتے ۔ "آپ یوں نہ کریں تو بھلا کھانا ہضم کیسے ہوئے ۔"

صفیہ بی تو ان کی آنکھوں کی پتلی تھیں ۔ گھر بھرے میں یہ برکتیں انہی ۔

کے دم قدم سے تھیں ۔ پھر خدا نے کوکھ بھی ایسی بھاری بھرکم دی تھی کہ دن گذرتے نہیں تھے اور پانچ چھ بچوں کی ماں بن بیٹھیں ۔

ایک دن یہ اپنی بیٹھک میں مثلوں کی ورق گردانی کرتے بیٹھے تھے ۔ کوئی بڑا مقدمہ لڑنے والے تھے ۔ سامنے پیالی میں چائے رکھی تھی ۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا ۔ اتنے انہماک میں تھے کہ چائے بھاپیں چھوڑتی چھوڑتی برف ہوگئی ۔ سطح پر سفید سی جھلی تیر گئی ۔ دیوار پر لٹکے گھنٹے نے گیارہ بجائے تو ان کی محویت ٹوٹی ۔ چائے حلق میں انڈیلی اور بستر پر لیٹ گئے ۔ قندیل کی لو نیچی کردی ۔ اکدم بھڑسے کواڑ کھڑکھڑائے اور بند ہو گئے ۔

انہوں نے ہڑبڑا کر دیکھا ۔ آنے والی ہانپتی کھڑی تھی ۔ انہوں نے کچھ پوچھنا چاہا تو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا "شیش" ۔

یہ اس کی سراسیمگی دیکھ کر "شیش" ہو گئے ۔

دس ۔ پندرہ ۔ بیس ۔ تیس منٹ گذر گئے تو وہ ذرا کچھ سنبھلی ۔

"ہم ہے گے میاں اب جاتی ہیں ۔" وہ اکھڑے لہجے میں بولی ۔ یہ اٹھ کر بیٹھ گئے ۔ چلتے چلتے وہ رک گئی ۔ پلٹ کر دیکھا ۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا ۔

"کون ہو تم ۔ روتی کیوں ہو ۔ ۔ ؟"

یہ سامنے بڑا سا بنگلہ ہے نا گے ۔ دہائی رہتی میں ۔ پن وان ۔ وہ ذرا رکی ۔ وان کا مالک اتّا برا ہے ۔ اب تو میرے پیچھے ۔ وہ رک گئی ۔

سلیم میاں بھی چھ بچوں کے باپ تھے ۔ سمجھ گئے سب ۔

"پھر اب کہاں جائے گی ۔ ۔ ؟"

"کہیں نوکری ڈھونڈھوں ں ۔"

سلیم میاں کو خیال آیا کہ نوکرانی کی یوں بھی ضرورت تھی ہی ۔

"یہاں نوکری کرے گی ۔"؟

"ہو میاں" وہ خوش ہو کر بولی ۔

"کھانا پکانا آتا ہے ۔"؟

ہو میاں ۔ کھانا پکانا، جھاڑو بہارو ۔ برتن باسن ۔ بچھونے بچھانا۔ اٹھانا ۔ سب کام آتا میرے کو ۔"

اتنی رات کو اسے اندر لے کر آئے ۔ صفیہ بیگم نے اسے سر سے پیر تک دیکھا ۔ میاں اس عمر میں تھے کہ ہر برائی کو اپنا لیں ۔ مرد کی چڑھتی عمر اور اترتی عمر اتنی خطرناک نہیں ہوتی، جتنی کہ یہ رکتی عمر ۔ سلیم میاں چالیس بیتالیس کے جھپیٹے میں تھے ۔ سورج ٹھیک نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ نہیں کہتیں تو ممکن تھا میاں غصہ ہو جائے اور رکھتی ہیں تو ممکن ہے باندی سوت ہو جائے ۔ اور اپنی اماں کے منہ سے سدا سنتی رہی تھیں ۔ "بھتیجی بہو نہ ہوئے ۔ باندی سوت نہ ہوئے ۔" برداشت نہیں ہو پاتی ۔

مگر میاں نے تو رائے دائے کی جگہ ہی نہ رکھی ۔ بس اتنا کہہ کر چلتے بنے ۔

"یہ کل سے کھانا پکایا کرے گی ۔ یہیں رہے گی ۔"

منجھلی پھوپھی نے صبح اٹھ کر اسے دیکھا تو دل میں کھدبدی سی ہونے لگی

"صفو ماں ۔ میں کہوں، اب میرے ہوتے اس کی کیا ضرورت تھی ۔"

باورچی خانے کا سارا انتظام انہی کے سپرد تھا ۔ چاول، شکر، دال

دال، سب چیزوں کی خُرد بُرد جاری رہتی ۔ بلا شرکتِ غیرے ہر چیز پر قابض تھیں ۔ اب یہ بتائیے انہیں کہاں بھاتی ۔ ؟

صفیہ بیگم کو بھی یہ خیال چپ ہی آیا تھا کہ کچھ ہو نہ جائے ۔ کچھ بھی ہوا نہ گیا ۔ اور تو یہ ہوئی کہ میاں نے کبھی اس کے ہاتھوں پانی بھی نہ مانگا ۔ مگر ادھر منجلی پھوپھی اور خود صفیہ بیگم کا خیال تھا کہ گلا بو ہے آفت کا پرکالہ گھر کا دو گھرا کر دے گی ۔ ایسی دیدہ دن دھولی تھی کہ بس معصومیت اور حیا کا تو نام دنام نہ تھا ۔ عمر تو ہوگی سولہ سترہ کی ہی ۔ مگر صورت پہ وہ لپکا پن تھا ۔ دیکھو تو ٹکٹکی باندھے دیکھے ہی جاتی ۔ دیدے کیا تھے اچھے خاصے سرائے گھر تھے ۔ جانے کتنے یہاں ٹھہرے ہوں گے ، اور کتنے چلے گئے ہونگے ۔ آنے کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ بڑے دروازے میں جا کر کھڑی ہو گئی ۔ منجلی پھوپھی نے پوچھا بھی کہ وہاں کیا کام ۔ مردانے میں کیوں کھڑی ہے ؟"

بولی " جرا کام ہے میرے کو ۔"

شرفو بساطی اپنا ٹھیلا دھکاتا گذرا تو وہیں سے کھڑے کھڑے بڑی باکی سے ہنس کر بولی ۔

" ادے تیرے پاس بال صفا پوڈر ہوئینگا ۔۔۔ ؟"

صفیہ بیگم کا حلق میں کلیجہ آگیا ۔ منجلی پھوپھی بھی ایک دفعہ گڑبڑا گئیں ۔ شرفو نے شہ پائی تو وہ بھی ہنس کر بولا " ہے تو ۔ پر دام ؟" اور اس نے اپنا منہ بیچ پچکا دیا ۔ جیسے ہوائی بوسہ لیتا ہو ۔

یہ بے حیا وہیں کھڑی کھی کھی کر کے ہنستی رہی ۔

صفیہ بیگم اپنے سہاگ کی خیر منانے لگیں ۔ اگر الگ کرتی ہیں تو میاں

غصہ دکھائیں گے اور رکھتی ہیں تو سامنے ہی نتیجہ ہے۔ اس کے اڑبھنگ چالے تو ایسے تھے کہ منہ پھوڑ کے بولتے بھی نہ آتا کہ "اری بے حیا یہ کوئی ڈھنگ ہے۔؟"

دو دو بیٹیاں سامنے تھیں کہ جوانی قدم چومنے کو بیکل آ رہی تھی اور پھر بیٹوں والا گھر تھا۔ وہ دن دور نہ تھا کہ باپ بیٹے سبھی ایک ہی حوض پر بیٹھے منہ دھویا کرتے۔ اس دلالہ کا کیا جاتا تھا۔ مگر بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ چونکہ کوئی حرکت ایسی دیکھی نہ تھی اس لیے الزام بھی دیتے نہ آتا۔

سلیم میاں کی بڑی بیٹی زاہدہ قد قامت میں لگ بھگ گلابو کے برابر ہی آتی تھی۔ ایک رات سلیم میاں دیر سے سوئے۔ صبح آنکھ ہی نہ کھلتی تھی پیر دکھے جا رہے تھے۔ گلابو کسی کام سے گذری تو یہ سمجھے کہ زاہدہ ہے۔ بولے۔

"ذرا پاؤں پہ پاؤں تو دینا دو ایک منّو۔"

منّو پاؤں دبانے پہ آئی تو گھنٹے سے دو گھنٹے گذر گئے۔ بجلی کی سی پھرتی سے ایسی کوملتا سے پاؤں دھرے جاتی تھی کہ سلیم میاں دس بجے کے اٹھتے بارہ بجے بستر سے اٹھے۔

رضائی پھینکی تو ہول گئے۔ "ارے تو۔"!

"پھر کیا۔ آج تو بولے کہ دبا۔"!

پھر کیا تھا روزانہ زاہدہ کے دھوکے میں گلابو آتی گئی۔ پہلے پہل تو یہ ہوتا کہ کام زیادہ ہوتا تو سلیم میاں پڑھتے لکھتے باہر رات کے بارہ بجا دیتے۔ اٹھ کر جانا۔ جان پہ آتا تو بیٹھک والے پلنگ پر ہی لڑھک جاتے۔ اور یہ مہینے

میں ایک آدھ بار ہی ہوتا ۔ ورنہ ان کا معمول تھا کہ بی بی کے ساتھ ہی ہوتے ۔ اماں نے اتنی آزادی کبھی نہ دی کہ جوان جورو کے ہوتے ساتے الگ سیج سجائیں وہ تو اماں کی آنکھ بند ہوئی تو اتنا بھی ہوا ۔ مگر اب جو بیر دیوانے کی لت پڑی تو بیشتر ادھر بیٹھک ہی میں اٹھ آیا ۔ بولتا کون ۔ بادشاہ اپنی رعایا کا پالن ہار ہوتا ہے وہ جو کرے سو کرے کسی کی کیا ہمت کہ دخل دے ۔ اور صفیہ بیگم لاکھ جنم مرن کی ساتھی تھیں ۔ تھیں تو رعایا جیسی ۔

یہ لت یہاں تک بڑھی کہ اب گھر بھر میں سناٹا ہی پڑ گیا ۔ اتنی بڑی بات تھی ڈھکی چھپی رہتی بھی تو کیسے ؟ ۔ اور پھر منجلی پھوپھی تھیں جس کا پلڑا بھاری دیکھتیں اسی میں جا بیٹھتیں ۔ اگر سلیم میاں جیت پہ ہیں تو انہیں کے ساتھ ہو گئیں اور پھر ساس بن کر بہو کو سمجھاتی پھر رہی ہیں ۔ صفیہ بیگم کا ساتھ دیا تو سلیم میاں کے لتے لیے جا رہے ہیں ۔

اب تک گویا پردے پردے میں کھیل ہوتا تھا ۔ اب ایک ہی دم سے پردہ ہٹ گیا تو کاہے کا لحاظ ۔ سلیم میاں کی جوتی کو غرض تھی کہ بی بی کی منوتی کرتے پھرتے ۔ بلکہ غصہ ہی آیا ۔ "ارے مرد کو تو حق ہے کہ چاہے چار کرے ۔ میں خواہ مخواہ پابند ہو کر رہ گیا ہوں ۔"

اس دن سلیم میاں کورٹ نہ گئے ۔ اپنے ہی کمرے میں لوٹنیاں لگاتے پڑے رہے ۔ چائے کا حکم ہوا ابھی تو گلابو کو ۔ پان منگوائے بھی تو گلابو سے ۔ کھانا لگانے کو کہا بھی تو گلابو سے ۔

حرام کا پردہ آنکھوں پر پڑتا ہے تو سب سے پہلے بیوی کی صورت میں کیڑے پڑتے ہیں ۔ چار بجے اٹھے نہانے کے لیے جاتے تھے تو ہمیشہ کی طرح

صفیہ بی نے کہا۔

کون سے کپڑے پہنئے گا۔"؟

سلیم میاں نے اجنبی اجنبی نظروں سے صفیہ کو دیکھا۔ بھرے بھرے گال۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گیہواں رنگ۔ قد و قامت مناسب۔ مگر کانوں کے پاس سے بالوں میں سفیدی سی آ رہی تھی۔ اور آنکھوں کے کونوں کے پاس ہلکی سی جھریاں آج پہلی بار دکھائی دیں۔

"کیا اسی صورت کا میں آج تک دیوانہ رہا ہوں"

" مجھے اللہ نے خود ہاتھ پیر دیئے ہیں" وہ تنک کر بولے۔

" یہ آپ آپ غصہ کا ہے پہ آیا" صفیہ بیگم نرمی سے بولیں۔ بھلا کبھی آج تک آپ نے کپڑے نکالے ہیں۔"

" نہیں نکالے، پر اب نکال لوں گا۔ تم میرا کام کیوں کرو بھئی۔ ایک دل سے تو مجھے لتاڑتی پھرو اور دوسرے دل سے یوں ملی ملی باتیں۔ مجھے پسند نہیں۔"

" اے واہ۔ یہ میرے دو دل کب سے ہو گئے۔"

"کب سے ہو گئے" سلیم میاں گرجے۔؟ تم نے مجھ پر شک نہیں کیا کہ میں گلا بو۔ سامنے بچوں کو کھیلتا دیکھ کر ان کی آواز نیچی رہ گئی۔

" اوئی خدا خیر کرے۔ میں نے کب شک و شبہ کیا ہے۔"

" اور کیا منجلی پھوپھی جھوٹ موٹ مجھے صلواتیں سنا رہی تھیں۔؟

" تو یوں کہیئے نا کہ منجلی پھوپھی سنا رہی تھیں۔ میں تو نہ تھی۔"

"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے دونوں کے خیالات ایک ہی ہیں۔"

صفیہ بیگم کو آج اندازہ ہوا کہ مرد کتنے کچے کانوں کے ہوتے ہیں۔ آخر منجلی پھوپھی کی کارستانی کام آ ہی گئی۔

منجلی پھوپھی کے صفیہ بیگم نے لتّے لے ڈالے۔

"آج تک نہیں کہا تھا، مگر آج کہتی ہوں، آپ کو کیا مزہ آتا ہے لگائی بجھائی کرنے میں ۔۔۔"؟

منجلی پھوپھی چڑ گئیں۔"لڑائی تم دونوں کی اور سیاپے میں میں آ رہی ہوں۔ اے واہ ۔۔۔"

"وہ میاں میرے، میں بی بی ان کی ۔۔۔ وہ ایک گلابو چھوڑ ہزار چھوکریوں سے لگتے پھریں۔ میں کچھ نہیں کہتی تو آپ کو میری کریا کیوں آئے ۔۔۔ بھلا میں نے آپ سے کہا تھا کہ صبح والی بات پر پوچھ گچھ کیجیے ۔۔۔"

"اے واہ ۔۔۔ منجلی پھوپھی زبردستی محبت پر اتر آئیں ۔۔۔"ہماری بچی کا گھر جلے اور ہم بیٹھے منہ دیکھا کریں ۔۔۔ ہمارے سامنے کے بچے غلطیاں کریں گے تو ہم نہ بتائیں تو کون بتائے ۔۔۔"؟

"ایسی بزرگی آپ ہی کو مبارک کہ گھر میں آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑک جائے۔۔۔ میں آپ سے صاف کہے دیتی ہوں، خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ نہ اڑایا کیجئے۔"

لفظ "ٹانگ اڑانا" منجلی پھوپھی کو بے حد کھل گیا اور وہ لمبی جھولنا چارپائی میں پسر گئیں ۔۔۔ غصے کے اظہار کے لیئے زاہدہ کو پکار کر کہدیا۔"مجھے جگانا مت بھوک نہیں ہے ۔۔۔" منجلی پھوپھی کو جب تب غصہ آتا، ان کی بھوک بند ہو جاتی تھی اور نیند گھمگھس جاتی تھی ۔۔۔

صفیہ بیگم کو شروع دن سے ہی گلابو کا چلن نہ بھایا۔ ہر بازاری وصف اس میں موجود تھا۔ سلیم میاں نے جب بتایا کہ کیوں وہ بڑے بنگلے سے بھاگی تھی تو صفیہ بیگم کو ذرا تو یقین نہ آیا۔

منہ کالا کیا ہوگا چھنال نے تو مالکن نے دھتا بتا دیا ہوگا۔" ان کو پورا یقین تھا۔ مگر مرد کو ہتھیا ل بنا لینا ان کے اپنے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اب بات سے بات سوچتی جاتیں تو خیال آتا گیا کہ کمبخت چولی لنگوٹی سے آئی تھی اور اب لہن بہن نو گزی ساڑی باندھے پھرتی ہے۔ کس نے لا کر دی ہوگی۔؟ سلیم میاں کے علاوہ لا بھی کون سکتا تھا۔

اور اس دن شرفو بنا طی سے کس دیدہ دلیری سے پوچھ رہی تھی "او ے تیرے پاس بال صفا پوڈر ہے۔" صفیہ بی کو یاد تھا کہ بڑے ماموں نے رنڈی گھر ڈال لی تھی۔ مگر وہ بھی اتنی بچہ بانک نہ تھی کہ رستہ چلتوں سے ہوائی بوسوں کے بدلے ایسے ایسے پوڈر، صابنیں مانگتی۔؟

شام کو سلیم میاں کا معمول تھا کہ سونے سے قبل دودھ کا ایک گلاس پیتے۔ اماں کہتی تھیں دماغی کام کرنے والوں کو طاقت بھی ملنی چاہیئے۔ اور انہوں نے ہی پابندی لگائی تھی۔ یہ اماں سے کہتے کہ اسی میں پتی ڈال کر چاء بنا دیا کیجئے۔ مگر اماں کہاں سنتیں۔؟

"ارے نیک بخت! بھینس کے دودھ میں ماں کے دودھ کی سی طاقت ہوتی ہے، موئی پتی سے سارا جوہر چلا جاتا ہے۔"

اماں مر بھی گئیں۔ مگر صفیہ بی پابندی سے انہیں دودھ پلائے جاتیں کبھی کام میں ہوتے تو گلاس لیے بیٹھی رہتیں۔ یہ بولتے "رکھ دو۔ ابھی پی لوں

گا۔"

صفیہ بی ہنستیں۔ "جی سب معلوم ہے۔ صبح کو گلاس جوں کا توں پڑا ملے گا۔"

"قسم خدا کی تم پکی ہندوستانی بیوی ہو۔ لاؤ ادھر۔" اور ہنستے ہنستے گلاس چڑھا جاتے۔

آج بھی روز کی طرح یہ گلاس لیے پہونچیں تو میاں کے تیور بدلے بگڑے تھے۔

"میں بچہ نہیں ہوں کہ چٹس چسر۔ دودھ پیا کروں۔" وہ گلاس دیکھتے ہی جھلا گئے۔

"مجھے معلوم تھی یہ بات۔" وہ سادگی سے بولیں۔ سلیم میاں نے کچھ کچا کرا نہیں دیکھا۔ "یوں سرپر ملک الموت کی طرح کھڑی کیوں ہو جاتی ہو۔ کیا میز نہیں ہے گلاس رکھنے کے لیے۔؟"

صفیہ بیگم کا دل مرجھا سا گیا۔ "خدا کی قدرت ہے کہ آج آپ مجھے ان لفظوں سے نوازتے ہیں۔"

"تو کیا تمہیں گود میں اٹھا کر ناچتا پھروں۔" وہ لال دیدے کر کے بولے۔

صفیہ بیگم کا سانس ایک لمحہ کو رک سا گیا۔ "آپ"! وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔

انہوں نے بے توڑ جواب دیا۔ "ہاں میں"

دودھ کا گلاس ہاتھ میں کپکپا رہا تھا۔ سلیم میاں کو بے بات غصہ آرہا تھا۔ گلاس چھینا اور زمین پر پٹخ دیا۔ "مجھے یہ نخرے بھاتے نہیں۔ اب یہ قصہ

کیوں چل رہے ہیں ۔"؟

اب تک تو صفیہ بی کی آنکھوں میں نمی تھی ۔ مگر یہ نمی سرسر بہتے پانی سے بدل گئی ۔ پندرہ برس سے بڑھ کے ہو گئے تھے آج تک آدھی بات بھی سلیم میاں نے نہ کہی ہو گی ۔ کبھی اونچی آواز سے پکارا تک نہیں ۔ لڑائی جھگڑے کون میاں بیوی میں نہیں ہوتے ۔؟ مگر ان کے جھگڑوں کی بھی بات دوسری تھی ۔ گرمی کے دن ہیں اور سلیم میاں ہیں کہ گھسے چلے آ رہے ہیں ۔ انھوں نے ناز سے منہ پھیر لیا ۔

" ہائے اللہ ۔ کوئی بات ہوئی یہ بھی ۔"!

" دیکھو صفّو بی ، ادھر منہ کرو ورنہ !؟ ۔"

" ورنہ کیا ۔" یہ لگاوٹ سے پوچھتیں ۔

" یہ خود ہی معلوم ہو جائے گا ۔"

ان کو منہ پھیرنا تھا نہ پھیرا ۔ چلو بات بند ہو گئی ۔ دوسرے دن یہ نماز میں کھڑی ہیں کہ بازوؤں میں کچ کچا کے دو تین بوٹے توڑ لیے ۔ سلام پھیرے پھیرے تک یہ لال لال ہو جاتیں ۔

" توبہ ہے نماز کا تو خیال کرتے ۔ کتنے گناہ کی بات ہے ۔" جیسے سارا گناہ تمہارے سر جائے گا ۔ بھلے کو کل چپ چاپ اِدھر گھس جائیں تو کیا بگڑ جاتا ۔"

مگر اسے لڑائی کون کہے ۔ اس سے ہٹ کر کبھی تو لڑائی نہ ہوئی ۔ کبھی کوئی بات ہوئی بھی تو یہ ہنس کر ٹال جاتیں کبھی یہ خود طرح دیئے جاتے ۔ کیسے بہتے پانی جیسی رواں دواں زندگی تھی ۔ اس کمبخت نے کانٹے بو دیئے ۔

آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے مگر سلیم میاں تو جیسے پتھر بن گئے تھے ورنہ کبھی

ان سے صفیہ بی کے آنسو دیکھے گئے ۔؟ شہر باہر کا کوئی مقدمہ لگا تھا ۔ یکشت بیاتِ ہزاپیا ت ٹھہری تھی ۔ انھوں نے ابھی اپنی آنکھیں بھیگی بھیگی سی، اٹھائی ہی تھیں کہ سلیم میاں نے وہیں اپنا بستر صندوق پٹخ دیا ۔" اے لو بھائی ۔ میں نہیں جاتا واتا ۔ کیا تمہیں رنجیدہ کر کے مجھے جینا ہے ۔"؟

کہاں تو وہ تھی ۔ اور کہاں یہ ندی ۔ کیسے کیسے دن ان آنکھوں سے دیکھنے پڑتے ہیں ۔

صفیہ بیگم نے روتے میں ان کا ہاتھ پکڑ لیا ۔" آپ کو اتنی تلخ باتیں کہتے خیال نہیں ہوتا ۔"

سلیم میاں کے سر پر گلابو کی جوانی کا بھوت چڑھا بیٹھا تھا ۔ تپک کر بولے یہ تلخ باتیں ہیں ۔؟ ۔ یہ تلخ باتیں ہیں ۔؟ ارے تم سی بیوی سے نباہ کیسے ہوا، اس پر تعجب آتا ہے ۔؟ بھلے کو اب تک طلاق نہ ہو گئی ۔!

لاکھ بیوی تھیں ۔ محبت بھرا دل رکھتی تھیں مگر اتنا بڑا طعنہ سن کر چپکی نہ رہ سکیں ۔ دل سنسنا اٹھا کانپ کر بولیں ۔

" نہیں ہوئی تو اب دے دیجئے ۔ جانا ہی کیا ہے ۔"

" اچھا ۔! سلیم میاں ڈپٹ کر بولے ۔" یہ بات ۔"

" ہاں ! ۔ اس بے عزتی اور بے لطفی زندگی سے تو طلاق ہی بھلی ۔"

سلیم میاں برداشت نہ کر سکے تیزی سے بولے ۔" جاؤ تمہیں طلاق دے دی ۔ ہاں دیدی ۔ بہت ہو چکا ۔"

اب تک صفیہ بی تو تھی غصے میں کہے جا رہی تھیں ۔

سلیم میاں کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو چکر سے آ گئے ۔ سر گھوم گیا ۔" جاؤ

طلاق دی ۔"

اتنے برسوں کا بندھن تین لفظوں میں ختم ۔ تین لمحوں میں ختم ۔ کیا اسی دن کے لئے یہ پیار ہوا تھا ۔ کیا ایسی ہی محبت ہوتی ہے ۔ سلیم میاں بس بھرے ناگ کی طرح فوں فوں کر رہے تھے ۔ صفیہ بیگم کا ساکت جسم وہیں کھڑا کانپ اٹھا ۔!

بچے سو گئے تھے ۔ سامنے چارپائی پر جمیل سویا تھا ۔ اس کے بازو رفیعہ ۔ پھر ایک بڑے سے پلنگ پر منا ۔ رؤف اور کمال تھے ۔ بازو کی پلنگڑی پر زاہدہ سوئی تھی ۔ برس دن میں جوان ہو جائے گی ۔ لیکن میں کہاں رہوں گی کہ اسے اپنے ہاتھوں ڈولی چڑھاؤں ۔ یہ منا میرے بیٖے کیسا بلکے گا ۔ ۔ رفو ۔ کمال اور رفیعہ ۔ یہ تو میرے بغیر نوالہ اٹھاتے نہیں ۔ ان کا کیا ہوگا" صفو بی کا دل بھر آیا ۔

" خدایا تو کسی گھر میں بیٹی نہ پیدا کیجو ۔ زندگی کے اتنے سال سکھ سے بتانے کے بعد ایسی افتاد پڑے، اس سے تو اچھا ہے کہ پیدا ہی نہ ہووے۔" بلورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا ۔" کہاں جاؤں گی ۔ اماں کے پاس ۔ ۔؟ گاؤں والے کیا تھوکیں گے ۔ پہلے جاتی تھی تو گہنوں سے لدی ۔ کپڑوں سے سجی ۔ جیسے کوئی دلہن سسرال میں اترتی ہو ۔ اب کیسے جاؤں گی ۔ اب کیا ۔' جاؤں گی ۔ پاس پڑوس والے اماں کی جان کو آجائیں گے ۔

"ادی! کیسی تربیت کی تھی کہ میاں سے نباہ نہ ہوا ۔"

" اے بی یہ شہر کی ہوا لگی ہے ۔ کہ کھڑا کھڑی میاں سے طلاق لے لی ۔" ادی بی تو گیا کیا ۔ ماشاءاللہ سجیلا ڈول ہے کیا کمی ہے"؟ یہ آخری

خیال آیا تو صفیہ پوری کانپ گئی ۔!

"نہیں نہیں! میں گاؤں نہیں جاؤں گی ۔"

بھاری قدموں اور بوجھل دل سے اٹھ کر الماری کے پاس گئیں ۔ کپڑوں سے لدی ہوئی تھی ۔ نچلے خانے میں زیورات کا ڈبہ تھا ۔ دس بارہ ہزار سے کیا کم کے رہے ہوں گے ۔ چاندی کا زیور الگ ۔ یہ سب حرام ہو چکا ۔ میرا کیا تھا ۔ پانچ تولے سونے اور پچاس تولے چاندی سے آئی تھی ۔ بس وہی میرا ہے ۔ کانوں سے لویں اتار کر صندوقچی میں رکھ دیں ۔ پھر دا ں کنگن اتار دیئے ۔ سہاگ لڑی اتارتے اتارتے صفیہ بی کا کلیجہ کٹ کٹ گیا ۔

ایک وہ نصیب والیاں ہوتی ہیں کہ میت سے اپنا سہاگ اتارتی ہیں ایک میں کرموں جلی ہوں کہ بھرے گھر سے خالی جا رہی ہوں ۔"

انگوٹھیاں اتار کر نچلے خانے میں ڈالیں ۔ سونے کا موٹا سا چھلہ میاں نے پہلی رات منہ دیکھ کر چڑھایا تھا ۔ کیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اس دن ۔ ؟ لال لال کپڑوں میں میں تھی کہ سمٹی جاتی تھی اور وہ تھے کہ گھسے چلے آتے تھے ۔ پھر انگلی کھینچ کر اتنی زور سے انگوٹھی پہنائی کہ انگلی چھل ۔ ‌ ‌ئی ۔ میں بازو سرکتی تو وہ اور قریب آتے ۔"

"آج میں ان کے قریب جانا چاہتی ہوں تو وہ بازو سرک گئے ہیں ۔ کیا زندگی ہے مولی ۔"

چھوٹے خانے سے اپنے جہیز کا تین تولے کا ہار اور دو تولے کی چوڑیاں نکال کر پہنیں اور پاؤں کے پازیب کپڑے میں بلند ھ لیے ۔

پندرہ برس سے اوپر شادی کو ہو گئے ۔ اب تک جہیز کے کپڑے کیا

ساتھ دیتے ۔ مگر چوتھی کا جوڑا اور چھلے چھٹی کے جوڑے اب تک موجود تھے ۔ اماں نے کیسے چاؤ سے ہر بار چھوچھک چھٹی کی ۔ ہر بار دولہن بنایا ۔ پانچ چھ جوڑے ۔ اور یہ زیور ۔

چوتھی کا جوڑا اٹھایا کہ آنسو ٹپک پڑے ۔ شادی کو دو دن ہوئے ہیں ۔ میاں ہیں کہ منہ سے منہ نہیں ہٹاتے ۔ رشتے کے بھائی بند ۔ سالے بہنوئی ہنسی اڑاتے ہیں ۔ مذاق سے فقرے کستے ہیں مگر یہ ہیں کہ کمرے کی کنڈی نہیں کھولتے ۔ چوتھی کا جوڑا اہرے رنگ کا تھا ۔ ٹھپہ گوٹہ لگی کرتی ۔ بانگڑی حاشیے اور کرنوں لگا ڈوپٹہ ۔ تنگ تنگ کلی دار پاجامہ کہ پھنسا پھنسا جاتا ۔ بدن سے پٹی ہوئی چولی ۔ کیا گت بن گئی تھی ایسے بھاری جوڑے کی ۔

بھاری دل سے، جلدی سے صفیہ بیگم نے جوڑا لپیٹ دیا ۔ اماں نے اپنے جہیز کے چاندی کے دو چار برتن حوالے کر دیئے تھے ۔ رکابی، اس میں پہلی بار ساتھ ساتھ کھانا کھایا تھا ۔ ایک نوالہ وہ میرے منہ میں دیتے، میں ان کے منہ میں دیتی کس قدر زور سے انگلی کو کاٹ کھایا تھا ۔

" روٹی کھائیں گے یا مجھی کو کھالیں گے ۔" میں ہنس کر بولی تھی ۔

" دیکھ لینا یہ بھی ۔" بڑے معنی خیز انداز سے کہا تھا اور پھر سچ مچ جیسے مجھے کھا ہی گئے تھے ۔

کیا ہو حق سناٹا ہے ۔ ساڑھے نو ہو رہے ہیں ۔ اسی وقت تو پہلی بار انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا ۔

" اٹھو ۔ ساڑھے نو ہو گئے ۔ نیند آ رہی ہے ۔"

کس قدر شرارت بھری آنکھیں تھیں ان کی ۔ نیند و نیند خاک بھی نہ آ

رہی تھی۔ بس مجھے ستانا مقصود تھا۔

ساڑھے نو بج رہے تھے' نیند و نیند خاک بھی نہ آرہی تھی۔ سامنے ہی دودھ فرش پر جم سا چلا تھا۔ کانچ کے گلاس کی کرچیاں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ یہ سسکیاں کیسی ہیں۔؟ جیسے صفیہ دلہن بنتے وقت روئی تھی۔ بیٹھک کا یہ پلنگ۔ پہلے یہاں کب تھا۔ یہاں تو بس میز اور دو ایک کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بھلا اماں نے اس بات کی اجازت ہی کب دی کہ میں بی صفیہ سے ہٹ کر کوئی بات سوچوں۔

ایک بار صفیہ سے کیسے جٹ گئی تھی۔ گرمی کے دن کہ بدن جھلسے جاتے۔ صفو بی بار بار کروٹیں بدلتیں۔ ایسے میں بھلا انہیں کیوں بھاتا کہ میں ان کے ساتھ جاگتی رہوں۔ کیسے مزے آئے۔ وہ ان کا روٹھنا جھولنا۔"

سلیم میاں نے کتاب دھیرے سے بند کردی۔ قندیل کی بتی نیچے کردی۔ ہلکا ہلکا اجالا باقی رہ گیا تھا۔ ایڑیوں کے بل چلتے وہ دروازے کی دراز تک پہنچے سسکیاں سی سنائی دے رہی تھیں یوں جیسے انہیں روکنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ پھر آنکھیں دراز سے لگ گئیں۔

صفیہ بی باری باری بس بچوں کو پیار کر رہی تھیں۔ "میرا تم پر اتنا ہی حق تھا میرے بچو کہ نو مہینے پیٹ میں رکھ رکھ دردوں سے جنوں اور یوں بے آسرا چھوڑ کر چلی جاؤں۔"

الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ صبح سے جو ساڑی صفیہ بیگم نے پہنی ہوئی تھی' وہ اتار کے اپنے جہیز کا جوڑا پہن لیا تھا۔ یہاں کی ہر ہر چیز حرام ہو گئی تھی' بھلا کیسے ساتھ لے جاتیں۔ جہیز کے جوڑے سب جھپا جھپ اور کام دار

تھے ۔ تولواں جوڑے کہ جنہیں پہن کر چلنا ہی دشوار ہو جائے۔

دودھ فرش پر جمتا جا رہا تھا ۔ بڑی سردی تھی ۔" اچھا اگر صفیہ چلی گئی تو پھر روزانہ دودھ کون لا کے دیا کرے گا ۔؟"

بے شک، دودھ اچھا نہیں لگتا، مگر عادت جو پڑ گئی ہے ۔"

صفیہ کیسی عورت ہے کہ لاکھ بول بول جاؤں، کبھی زبان نہیں ہلاتی ۔ ارے اس عمر میں بھی ایک سے ایک لڑکی مل جائے ۔ پیسے کی کون کمی ہے مگر صفیہ کی عادتیں، وہ مروّت، وہ لگن، وہ چاہت وہ محبت کہاں ملے گی ۔ پیسہ کیا اتنی ساری چیزیں دے سکتا ہے ؟"

" افوہ! میں نے طلاق بھی دے دی ۔"

ٹن ٹن ٹن گھڑی نے دس بجائے ۔

" دس بجے تو نیند بالکل ہی آجاتی تھی ۔ صفیہ کے بھرے بھرے گال ۔" افوہ! کیا مصیبت ہوتی تھی اس کی شرم ۔"

دراز سے آنکھ لگا کر سلیم میاں پھر جھانکنے لگے ۔

کیسی دولہن بنی پھر رہی تھیں کمرے میں ۔ بس بالکل ایسا ہی ہلکا ہلکا اندھیرا اس رات بھی تھا ۔ میں نے شرارت سے ہاتھ پکڑ لیا تھا تو ہنس کر اور شرما کر بولی تھی ۔

" خوشامدی کدھر کے ۔"؟

خوشامدی تو میں تھا ہی، اب جب کہ اس کی عمر اتر گئی ہے تو اسے بھول بیٹھا ہوں ۔ عمر تو میری بھی ڈھل رہی ہے پھر اس نے مجھے کیوں نہیں دھتکارا؟

صفیہ بیگم نے آئینے میں خود کو دیکھا ۔" افوہ! یہ جوڑا تو میری جان لے کر ہی چھوڑے گا ......

کیسی کیسی باتیں یاد آرہی ہیں کہ بس دل یہی سمجھا رہا ہے کہ جا۔۔۔ جاکر قدم چوم لے وہ تو تیرا جنم مرن کا ساتھی ہے۔۔۔ مگر بیچ میں یہ دیوار کس نے اٹھادی؟"

گلی میں سے تانگہ چھن چھناتا گذرا تو صفیہ بی نے اسے آواز دی۔ تانگہ دروازے کے سامنے آکر رک گیا۔

بستر، صندوق، توشے دان بدھنا اور ایک لوٹا۔۔۔ کل یہی کائنات تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی صفیہ بیگم دروازے تک پہنچیں۔

"بھائی ذرا یہ سامان چڑھا لینا تانگے میں"

ادھر صفیہ بیگم کسی کام سے مڑیں اور ادھر سلیم میاں نے تانگے والے کو ہنکا دیا۔

"اے چلے جاؤ میاں۔ کسی کو آنا جانا نہیں ہے"

تانگے والا بکتا جھکتا چلا گیا۔ چھن چھن گھوڑے کے گھنگرو بجنے لگے۔

صفیہ بیگم لپکی آئیں۔

"کہاں جارہی ہو۔۔۔؟" سلیم میاں نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

"جہاں خدا لے جائے گا" انھوں نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

"خدا تو اسی گھر میں رکھے گا"

صفیہ بیگم نے تیزی سے ان کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

سلیم میاں ہنستے ہوئے آگے بڑھے "بھلا کوئی اتنی سی بات پر ناراض ہو جایا کرتا ہے یوں۔۔۔؟"

صفیہ بیگم دور ہٹ کر بولیں "مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ میں تم پر حرام ہو چکی ہوں۔ اور تم مجھ پر۔ یاد رہے تم نے مجھے طلاق دے دی ہے"

"شادی بھی تو ہم ہی نے کی تھی نا۔ اور پھر ہم نے کچی والی تین طلاقیں تھوڑی دی تھیں۔

وہ تو جھوٹ والی تھی ـــــ ایک بار والی۔ چلو جانے دو۔"

"اچھا یہ بتاؤ صفو بی بی تم نے یہ جوڑا کیوں پہنا۔ ہمیں لبھانے کے لئے نا۔ آہئیں۔" اور انھوں نے ہاتھ پکڑ کر صفیہ بی کو اپنے پاس بٹھالیا۔ "سچ مچ آج تو بالکل ویسی ہی لگ رہی ہو جیسی......"

صفیہ بی نے ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھا تو وہ شرارت بھری ہنسی ہنس رہے تھے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح منجھلی پھوپھیا لوٹہ لینے ادھر اُدھر ڈھنڈلانے لگیں ـــــ چوری بھلے چوری سے جلئے ہیرا پھیری سے کیسے جائے ـــــ ؟ تاک جھانک کی عادت تھی سو تھی۔ اور اتنے بڑے جھگڑے کلس گئی تو وہ سے ہی رہی تھیں اب اس کا انجام دیکھنے کی بھی تو آرزو تھی ـــــ۔

"کمرے کے سامنے سے گذریں تو ـــــ گذرتیں کیا وہیں ٹھٹھک جانا پڑا ـــــ "توبہ" کر کے اک دم منہ پر پلّو کھینچ لیا ـــــ دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا پڑا تھا اور نئے بیاہتا دولہن دولہا کی طرح دونوں ایک دوسرے میں گھسے گھسائے یوں سو رہے تھے کہ صفو بیگم تو دکھائی بھی نہیں دے رہی تھیں۔ ہاں سلیم میاں کی بھاری بھر کم ٹانگیں البتہ نظر آرہی تھیں جو صفو بیگم کی کھلی ڈلی پنڈلیوں کو اپنے کساوے میں لئے ہوئے تھیں ـــ۔

"اے موئے کم بختوں بے شرموں سے اتنا تو ہوتا کہ دروازہ ہی لگا لیتے ـــ،" انھوں نے ایک تناکے سے دروازہ بھیڑا اور بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گھس گئیں۔

*

"رقیبِ روسیاہ"

ہاسپٹل کے صاف ستھرے وارڈ میں حامد میاں بولائے بولائے سے پھر رہے تھے — کبھی وہ پنجوں کے بل اونچے ہو کر شیشے کی کھڑکیوں میں سے جھانکنے کی کوشش کرتے اور کبھی دروازے کی دراز سے آنکھ لگا دیتے — اور پھر مایوس ہو کر ٹہلنے لگ جاتے۔

"اللہ جانے کب وہ خوش خبری ہم تک پہنچتی ہے — وہ پھر ٹہلنے لگ گئے —

"مے گاڈ بلیس ہر —"

پاس پڑے بنچ پر بیٹھے ہوئے اکبر میاں سکون سے بولے —

"ارے میاں پریشانی کی کون بات ہے — پہلی زچگی ہے، گھنٹوں کا ذکر ہی کیا۔ دو دو تین تین دن ٹوٹ جاتے ہیں اور مہربان برآمد نہیں ہوتے۔ یار اس بات ہونے کی کیا بات۔ ہے ہے" — "آپ کیا بتا سکتے میں کس قدر دردمند ہوں —؟ حامد میاں بال نوچتے ہوئے بولے . . .

تم دردمند ہو تو ہم بھی کچھ گلہ ٹو نہیں ہیں۔ ایسے معاملوں میں جلدی نہیں ہوا کرتی چین سے بیٹھو —" اکبر ان کے دوست بجد مطمئن تھے۔

مگر حامد میاں چین سے نہیں بیٹھے . . .

اکدم میٹرنٹی روم سے چین چیاں کی آواز سنائی دی۔ حامد میاں اچھل پڑے۔
"میں سمجھتا ہوں بے بی پیدا ہو گیا"۔
اکبر میاں اسی سنجیدگی سے بولے۔ آپ کیسے سمجھ بیٹھے کہ آپ ہی کی اولاد کی چیخ ہے۔ ارے میاں کیا اتنے بڑے ہاسپٹل میں ایک ہی عورت زچگی کے لیے آئی ہو گی؟ اگر ہمارا بے بی ہوتا تو اندر سے بوا یا مہری کوئی بھی لپکی چلی آتی"۔

حامد میاں جلدی جلدی بے قراری سے ٹہلنے لگے۔ اکبر میاں مذاق سے بولے۔
"میاں درد تمھیں لگے ہیں یا تمھاری بیوی کو؟؟"
حامد میاں جلدی سے قریب آئے۔ "کیا کہا۔ کیا ہوا الف کوٹ؟"
نہیں، یا پوچھ رہا تھا زچگی تمھاری ہو رہی ہے یا تمھاری بیوی کی؟"
"لاحول ولا۔ یہ کون مذاق کا موقع ہے؟ بائی گاڈ بالکل بے تکے آدمی ہو"!

اب ان سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا۔
"دیکھو ادھر چلتے ہیں، میٹرنٹی روم کے پچھواڑے۔ وہاں سے جھانکیں گے ذرا۔ یہ سامنے والے شیشے تو دودھیا ہیں۔ یہاں سے کچھ نظر آنا بالکل امپاسبل ہے"۔
"دیکھو میاں۔ اکبر میاں ٹھنڈے لہجے میں بولے۔ "تم پہلے ذرا اپنی یہ نکٹائی کی گرہ ڈھیلی کرو۔ پتلون کا بلٹ نکال پھینکو۔ کوٹ کے بٹن کھول دو، ورنہ آپ کا دم گھٹ جائے گا۔ عجیب پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہے ہو۔ اس وقت عورت سے بدتر نہیں، احمق معلوم ہو رہے ہو"۔

" بیرسٹری کو ڈالو چولھے میں ـــ اس وقت تو حالت تباہ ہے ـــ
اُف ـــ مائی گاڈ ـــ پتہ نہیں کب ڈلیوری ہو ـــ "
" توبہ ـــ میں نے کسی باپ کو اتنا بدحواس نہیں دیکھا ـــ "
" یوں کہو کسی عورت کو اتنا ڈلیکیٹ نہیں دیکھا ـــ عطیہ جیسی عورت کو تو کانٹا چبھ جائے اس کی بھی برداشت نہیں اور یہ تو اتنے بڑے چائلڈ کو برتھ دینے کا سوال ہے "
" تو عطیہ بی بی کون سی دنیا سے نرالی ہیں ـــ ؟ " ادھر میاں دھان پان ' ماچس کی تیلی ایسی عورتوں کو ہم نے مزے سے نو، نو ، دس، دس پونڈ کے بچے جنتے دیکھا ہے ـــ ارے بھائی تخلیق کا یہی انداز ہے ' اس میں گھبرانے یا پریشان ....
ابھی ان کی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ سفید کپڑوں میں سیاہ فام نرس رپ رپ کرتی آئی اور اپنے سفید دانت چمکا کر بولی ۔
بیرسٹر صاحب مبارک ....
ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ پیلا لہنگا جھلاتی اور نسی کے کڑے بجاتی مہری لپکی آئی اور دور ہی سے چلا کر بولی ـــ
" ہے سرکار ـــ بہو صاحب نے گورا گٹا بیٹر جنا ہے " !
" او گاڈ " ـــ حامد میاں خوشی سے اچھل پڑے ، نرس کو نظر انداز کر کے مہری کی طرف لپکے اور سُن لینے کے باوجود دوبارہ چلا کر پوچھا ـــ کیا کہا ۔ کیا ......
" بیٹر ـــ بیٹر ـــ بیٹا ـــ مرد بچہ ـــ " وہ ہنس کر بولی اور دھپ

دھپ سے پہنچتی گھیر دار لہنگے کو جھلاتی، پھر میٹرنٹی روم کو بھاگ گئی۔

نرس نے ناگواری سے اُسے دیکھا — "اتنی بار کہا ہاسپٹل میں آنا تو نہیں چھانکنا چاہئے۔ دوسرے مریضوں پر بُرا اثر پڑتا ہے —"!

حامد میاں نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے اکبر میاں کے کندھے پکڑ لئے — سُنتے ہو بھیا — بے بی سن — مطلب ہے وائٹ روز —"

اکبر میاں بولے — "ہاں وہ تو ہے، مگر ذرا نرس کو اس کا حق تو پہنچا دو، دیکھتے نہیں وہ منہ بنا رہی ہے، مہری نے اس کا حصہ لوٹ لیا —"

"یہ بات ہے —" حامد میاں نے جیب سے دس کا نوٹ نکالا — اِٹ از تھنگ فار یو — مگر لے لو —" وہ نرس کے ہاتھ میں نوٹ ٹھونسنے لگے —

نرس نے پہلے تو آنا کانا کی اور لپٹتے پچھلے رویئے پر شرمندہ ہوتی ہوئی بولی —

"دراصل یہ آپ کی مہری ہے نا — بہت خوش مزاج اور طرار ہے۔ دیکھئے نا دیکھتے ہی دیکھتے سارے ہاسپٹل سے دوستی کر لی ہے اس نے — پیر پٹخ کر بھاگنے کا تو اُسے بے حد شوق ہے —" وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔ مگر حامد میاں اس کی بے رس باتیں نہیں سُن رہے تھے۔ اکبر میاں کا بازو گھسیٹ کر بول رہے تھے —

"بھیا اندر چلو — پلیز جلدی — میں بے بی کو دیکھنے اس قدر بے چین ہو رہا ہوں۔ پلیز بی کوئیک —"

"کمال کی بات کرتے ہو میاں — بھلا کون تمہیں اتنی جلدی اندر گھسنے دیگا۔؟"

ابھی تو نرسیں بچے کو نہلانے کے لئے لے گئی ہوں گی اور پھر ابھی...... وہ چپ ہو گئے۔ پھر بول اٹھے ــ "ایسی بھی کیا بے صبری ــ پانچ سال صبر کیا اب پانچ منٹ نہیں ہوتا۔"

"یہی تو خاص بات ہے ــ اب تو بس انتہا ہو چکی ہے، بھئی ہم چل رہے ہیں اب بالکل ویٹ نہیں کر سکتے۔ اتنی دیر تو ہو گئی ــ"

ہاسپٹل میں سب سے زیادہ کرایہ والا روم لے رکھا تھا۔ بڑے آدمی تھے اور ہاتھ کھلا ہو تو سب کے منہ بند ہو جاتے ہیں۔ وہ دھڑ دھڑاتے اندر داخل ہو بھی گئے، مگر کسی نے منع نہیں کیا۔ میٹرنٹی روم سے عطیہ کو پرائیوٹ روم میں لے جایا جا چکا تھا ــ وہ سیدھے وہیں پہنچ گئے ــ

عطیہ پلنگ پر سفید چادر لپیٹے مسکراتی پڑی تھی۔ پائنتی کی طرف سفید پالش کیا ہوا چھوٹا سا جھولا لٹک رہا تھا ــ حامد میاں نے بڑی خوشی سے ہنستے ہوئے جھولے پر سے جالی ہٹائی ــ

"او مائی گاڈ ــ ہاؤ ٹائنی کریچر ــ کس قدر ننھا سا ہے ــ"

"ننھا سا کاہے کو ہے ــ" عطیہ غرور اور ناز سے بولی ــ "پورے ساڑھے نو پونڈ کا ہوا ہے ــ"

حامد میاں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ــ

"واٹ ــ ؟ ساڑھے نو پونڈ ــ مگر تم اس قدر نازک ہو سوئیٹی کیٹ۔ یہ سب کچھ ہوا کیسے ــ ؟؟"

"ہش ــ" عطیہ شرما گئی ــ

"تمھیں قسم ہے سچ سچ بتا دو ــ یہ پیدا کیسے ہو گیا؟ اور تم اس قدر ننھی سی،

"در ہیلدی نظر آ رہی ہو ــــ کسی قسم کی ویکنس نہیں ہو رہی ہے تمھیں" ــــ؟

وہ مارے حیرت کے سوال پر سوال کئے جا رہے تھے۔

مہری باہر سے سفید تولیوں کا بڑا سا گٹھا سنبھالے آئی اور اترا کر بولی

"سرکار بی بی لوگ اُدھر ہی انتجار دیکھتی بیٹھی ہیں۔ جرا انھیں بھی گھس ہونے دیں" ــــ

عطیہ نے شرمائی سی ہنسی کے ساتھ کہا ــــ سچ بھئی آپ ایسے جلدی چلے آئے ــــ بس ابھی ابھی تو مجھے یہاں لائے تھے ــــ ممی بھیا، ثریا آنٹی تو اُدھر ہی بیٹھی رہ گئیں" ــــ

" اور سرکار سب سے بڑھ کر تو چھوٹی بی بی لوگ اودھم مچا رہی ہیں مگر بڑی سرکار نے مناہی کر دی ــــ بولیں ــــ ابھی نہ جاؤ ذرا چھوڑ دو ــــ اُدھر راج و نیاج ہو رہے ہیں" وہ مٹک کر اترا اترا کر ہنسنے لگی ــــ

سرکار نے بیڑ بھامیہ بنایا۔ مگر آج عطیہ کے لئے مہری کی ہر خطا، ہر بدتمیزی قابلِ معافی تھی ــــ

"سُنا سرکار نے" ؟ عطیہ ہنس کر حامد میاں سے مخاطب ہو گئی ! اُس کے ہر انداز سے غرور ٹپک رہا تھا ــــ

تم اتنی سوئٹ ہو ڈارلنگ ــــ وہ بے تابی سے بولے ــــ تم نے مجھے باپ بنا دیا۔ میں کس قدر خوش ہوں ــــ سوہیتی" ــــ!!

" عطیہ بھی خوشی خوشی عام ماڈرن لڑکے سے انداز میں بولی۔

بے بی کا نام کیا رکھیں گے ــــ ؟؟

ہاں بھئی کیا رکھیں گے — کوئی اچھا سا — نوبل سا نیم ہونا چاہیے — تم نے کچھ سوچا ہے — ؟ بھلا ٹونی رکھ لیں تو — ؟

"ٹونی — ؟ عطیہ نے ایک دم سے انکار کر دیا — "اونہوں — وہ مائیکل صاحب کے بیٹے کا یہی نام ہے — کم بخت جب دیکھو تب بسورا کرتا ہے — ہمیں نہیں بھاتا ایسا نام —"

" تو ومی رکھ لیں — ؟ بھلا خاصا ہے —"

" نا بھیا — انکل کے چھوٹے بیٹے کا نام ہے — انہیں بخار چڑھے گا — کہیں گے ساری دنیا میں بس یہی ایک نام رہ گیا تھا" — ؟

" لالی — ارے — لالی رکھ لیں تو — ہاؤ ونڈرفل —" !

عطیہ کی ہنسی چھوٹ گئی —

" ہائے یہ تو بالکل لڑکیوں کا سا نام ہے اور ہمیں تو بے لی ہوا ہے"۔

وہ فخر سے بولی — " اچھا جی — اگر جیکو رکھ لیں تو —" ؟؟

" جیکو — ! ویری نائس — ویری بیوٹی فل ... — بہت اچھا نام ہے عطی ڈارلنگ — مگر کوئی اعتراض کرے تو —" ؟

عطیہ ناک چڑھا کر بولی — " واہ بھئی بچہ ہمارا ہے کوئی اعتراض کیوں کرنے لگا" ؟

اکدم باہر سے پیں پیں کی آواز آنے لگی — حامد میاں برا سا منہ بنا کر بولے۔

" اُف کس قدر بدتمیزی ہے — دیکھو ہارن پہ ہارن بجائے جا رہا ہے ایڈیٹ"۔

" تو ابھی جانے کی جلدی بھی کیا ہے ۔۔۔" عطیہ لگاوٹ سے بولی ۔۔۔ آج تو اس کا جی چاہتا تھا کہ بس باتیں ہی کیے جائے ۔

" شام میں ڈنر اٹنڈ کرنا ہے عطی ڈارلنگ ۔۔۔ اور میں اس قدر بور ہو رہا ہوں ۔۔۔ بھلا تمھارے اور چیکو کے بنا اب کہاں دل لگے گا ۔۔۔" ؟

" بھئی کس نے انوائٹ کیا ہے ۔۔۔" عطیہ بسور کر بولی ۔

رحمان صاحب نے ۔۔۔ ان کے بیٹے کا برتھ ڈے ہے نا آج ۔۔۔"

اور جو ہمارے بیٹے کا برتھ ڈے ہے آج ۔۔۔ عطیہ ناز سے بولی ۔

مگر ڈارلنگ میں نے پرامس جو کر لیا ہے ۔۔۔"

" جانیئے بھی آپ تو اکدم ویسے ہیں ۔۔۔ اتنی ساری تو باتیں کیا کرتے تھے ۔ یوں ہوگا ووں ہوگا اور بس چلے جارہے ہیں ۔۔۔"

مہری پھر نمودار ہو گئی ۔۔۔

" سرکار وہ کالی سسٹر ابھی جھانک گئی ہے ۔۔۔ کہہ رہی تھی اتنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ۔۔۔ چین سے سو جائیے ۔۔۔"

سرکار نے ہنس کر عطیہ کی طرف دیکھا ۔۔۔

" بھئی سچ تمھیں ریسٹ کرنا چاہئے ۔۔۔" وہ مسکرائے اور بے بی پر جھک گئے ڈارلنگ تم اسے دودھ نہیں پلاؤ گی ۔۔۔ ؟ وہ بدمعاشی سے بولے ۔۔۔

" ہٹیئے بھی ۔۔۔ آپ تو یوں ہی شرارت کرتے ہیں ۔۔۔" عطیہ شرما گئی اور وہ گئے ۔۔۔ ان کی آنکھوں میں ہنسی تھی ۔ چہرے پر ہنسی تھی ، ہونٹوں پر ہنسی تھی ، لہجے میں ہنسی تھی اور پیار ۔۔۔ پیارا ہی پیار ۔۔۔

عطیہ نے رُک رُک کے کہا ۔۔۔

ہماری زندگی پہلے ہی کیا کم حسین تھی، اب تو حسین تر ہو جائے گی — سدا بہار ہو جائے گی، اُف آپ مجھے اس قدر چاہتے ہیں —" شرم اور مسرت سے اس کا منہ تمتما گیا اور آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

دس دن ہاسپٹل میں ہی گذرے — گیارھویں دن ہی عطیہ اپنے تندرست اور سفید گلابی بچے کو لیکر گھر لوٹ آئیں — حامد میاں بیرسٹر تھے، ولایت پلٹ — اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امیر گھرانا۔ شادی بھی اچھے گھرانے میں ہوئی — عطیہ بی۔اے پاس تھی۔ باپ ڈاکٹر تھے۔ ہزاروں میں کھیلی ہوئی — تعلیم بھی اچھی ملی۔ صورت وشکل بھی پیاری پیاری — جوڑ کو جوڑ ملا — میاں بی بی دونوں نے کانونٹ میں تعلیم پائی تھی — تھے تو مسلمان اور ہندوستانی، مگر گھر میں زیادہ تر مغربیت ہی تھی۔ جب مزاج سے مزاج اور دل سے دل ملے تو پھر کیا کہنا — ؟ میاں بی بی ایک دوسرے پر پروانہ وار نثار تھے — شادی کو سات آٹھ سال گذر گئے تھے — شادی کے کوئی دو سال بعد ایک حمل ساقط ہوا۔ پھر اس کے بعد، اب کوئی پانچ سال بعد خدا نے گود بھری کی — اب زندگی کی خوشیوں میں کس بات کی کمی تھی — ؟ بس چیکو میاں رہیں اور زندگی ہے۔

چیکو میاں کو انگوٹھا چوسنے تک کی تمیز نہ تھی مگر ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی نے کھلونوں سے گھر بھر دیا — دیکھ بھال کے لئے انگریز گورنس مقرر کی گئی — بچپن سے ہی انگلش بول چال کانوں میں

پڑے گی تو شروع سے ہی ماں باپ کے رنگ میں رنگے جائیں گے ۔۔۔ بات کرنا تو قصہ رہا ابھی گھٹنے ہوتے کی سدھ نہ تھی مگر گورنس انھیں سنائے جاتی ۔۔۔

" ہلو ۔۔۔ ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر چیکو "۔۔۔ ؟

مسٹر چیکو اپنا کلیھا ایسا منہ پھاڑ کر ہنسنا شروع کر دیتے، یا ردی کی جون میں ہوتے تو لال لال ہاتھ پاؤں چلا چلا کر چیں چیں شروع کر دیتے ۔۔۔

یوں تو حامد میاں کی آمدنی ہزاروں سے تھی ۔ باپ کے گھر میں بھی کیا کمی تھی ۔۔۔ ؟ یہاں کوٹھی میں نوکروں کا بازار تھا ۔ ہاتھ ہاتھ کو، پاؤں پاؤں کو نوکر رکھتے ۔ ایک کو بلاؤ چار دوڑ پڑتے ۔۔۔ اشارہ ہلتے ہی دل بچھا دیتے ۔ مگر عطیہ حامد میاں کا ہر ہر کام اپنے ہی ہاتھوں کرتی ۔۔۔ باہر جانے کے لئے اٹھتے تو کوٹ خود پہناتی، ٹائی خود باندھتی ۔ لاکھ منع کرنے کے باوجود جوتوں کے بند تک خود باندھ دیتی ۔۔۔ غلام رسول پیچھے پیچھے برش لئے دوڑا آتا تو اس کے ہاتھ سے برش لے لیتی ۔۔۔ " تم جاؤ ۔۔۔ میں کر لوں گی ۔۔۔ "

جوتوں کو پالش کرنے میں بھی عطیہ کو مزہ آتا ۔۔۔ چھٹپن دفعہ تو دونوں کی پیار بھری نوک جھونک ہو ہی چکی ۔

" اف عطی ڈارلنگ تم ذرا اپنی اور میری پوزیشن کا تو خیال کیا کرو ۔۔۔ بھلا لوگ کیا سوچتے ہوں گے کہ ایک بیرسٹر کی بیوی، ایک ڈاکٹر کی بیٹی، اتنے بڑے گھر کی بہو اور یوں جوتوں کی پالش کرتی پھرے

آئی کانٹ بیرایٹ ۔۔۔

عطیہ کا جواب صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوتا۔

اسی پر بس نہیں ۔۔۔ بیرسٹر صاحب کے لئے کھانے کی الگ میز لگتی تھی۔ کیونکہ ان کا ٹائم سب کے ٹائم سے میل نہ کھاتا تھا ۔۔۔ یوں ڈائننگ ٹیبل ارینج کرنے کے لئے ایک سے ایک نوکر تھا۔ مگر عطیہ ہر ہر ڈش اپنے ہاتھوں سلیقے سے رکھتی۔ جگ سے پانی انڈیلتی۔ اور جب تک یہ کھانا کھاتیں میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتی رہتی۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں ۔۔۔ جہاں پھول نہیں وہاں بہار نہیں جہاں بچے نہیں وہاں پیار نہیں ۔۔۔ مگر حامد میاں اور عطیہ میں بچہ نہ ہونے کے باوجود وہ پیار تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ گھر میں بچے کی ھما کلکاریاں نہ تھیں مگر پھر بھی بہار کوٹھی کے کونے کونے سے پھوٹی پڑتی ۔۔۔ اور اب تو پوچھنا ہی کیا تھا ۔۔۔؟ حامد میاں اپنے دوستوں میں کہا کرتے ۔۔۔ "بھئی ہماری ہیپی لائف تو بس تک سے کسی کسی کو مل جاتی ہے"

حامد میاں باہر سے آئے، گاڑی پورٹیکو میں ٹھہرائی اور جلدی جلدی عطیہ کے پاس آکر بولے ۔۔۔

"ڈارلنگ۔ بس یکدم سے جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ"

"کیوں ۔۔۔؟ کس سلسلہ میں اتنی جلدی ۔۔۔" عطیہ جیکو کو فراک بدلاتے ہوئے بولی ۔۔۔

"اوہ ٹائم ہالکل نہیں ہے ۔۔۔ پلیز ۔۔۔ جلدی"

عطیہ نے ڈبے سے پف نکال کر چیکو کے گالوں پہ پوڈر تھوپا اور بولی ـــ
" سچ یہ پف اتنا سخت ہے اور چیکو کے گال اتنے نرم نرم ـــ جانے ان لوگوں کو شاپنگ کرنی کیوں نہیں آتی "ـــ

حامد میاں چیکو پر جھک کر پیار کر کے بولے ـــ" ارے عطی ڈارلنگ یہ گورنس کس لئے رکھی گئی ہے آخر ـــ ؟ بائی گاڈ، جب دیکھو تب تم چیکو کے کام میں جتی رہتی ہو ـ کبھی کپڑے بدلا رہی ہو، کبھی ہاتھ دے رہی ہو، کبھی بوتل واش کر رہی ہو کبھی...... ارے میں پوچھتا ہوں یہ مہینے کے سو روپے یوں ہی بٹور لیتی ہے کیا "ـــ

" تو ہوا کیا "ـــ عطیہ بڑے پیار سے بولی ـــ" کبھی کبھی یوں ہی جی چاہ جاتا ہے کہ چیکو گڈے کا منہ دھلا دوں بس دھلا دیتی ہوں ـ کبھی جی چاہ جاتا ہے کپڑے بدلا دوں بس بدلا دیتی ہوں "ـــ

حامد میاں ہنس کر بولے ـــ" اچھا اچھا دو چار مہینے میں سارا شوق ہوا ہو جائیگا ـ پھر ایک ایک سے کہتی پھرو گی ـــ اف مائی گاڈ، کوئی تو اسے سنبھالو، مجھے سونے تک کی مہلت نہیں ـــ ارے کوئی تو اسے اٹھاؤ، مجھے باہر جانے کے لئے تیار ہونا ہے ......

اپنے کہنے پر خود ہی خیال آگیا کہ ابھی ابھی وہ عطیہ سے باہر چلنے کو ہی کہہ رہے تھے ہڑبڑا کر بولے ـــ

" اُف مائی گڈنس ـــ سکس بج تو ہو بھی گئے ـ بس پکچر شروع ہوتی ہی ہوگی "
" مگر کون جا رہا ہے پکچر ـــ؟" عطیہ حیرت سے بولی ـ
" ہم دونوں اور کون ـــ؟ " حیرت ہے جب سے یہی کہہ رہا ہوں دیکھتیں نہیں ـ

"میں نے کپڑے بھی اسی لئے نہیں بدلے کہ بس اکرم سے چل ہی دیں ___ بڑی فرسٹ کلاس انگلش پکچر لگی ہے"

عطیہ نے چیکو کو اٹھا کر کندھے پر لٹایا اور ایک ہاتھ سے حامد میاں کی تھوڑی پکڑ کر بولی ___

"آپ ہی چلے جائیے نا ___ چیکو ابھی کھانس رہا تھا۔ میں ذرا اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی"

حامد میاں منہ سے کچھ نہ بولے ___ عطیہ خود ہی بول اٹھی ___ "آپ دیکھتے ہیں، میں نے کتنے برس ہو گئے آج تک کبھی آپ کی کوئی بات نہیں ٹالی مگر اس وقت بے بی کی کھانسی ذرا کم ہے، بڑھ گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔ پھر کبھی چلے جائیں گے ساتھ ساتھ۔ آج تو آپ اکیلے ہی دیکھ آئیے ___ جائیے نا ___ پلیز دیر نہ کیجئے ورنہ پکچر شروع ہو جائے گی"

حامد میاں اکیلے ہی پکچر چلے گئے ___

مسٹر چیکو اب پانچویں چھٹے مہینے میں تھے۔ صحت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ کسی طرف سے دیکھو سوائے فٹ بال کے اور کوئی تشبیہ یاد نہ آتی ___ رنگ ایسا کہ سفید گلاب، اور چھ مہینے کے تھے مگر بلا مبالغہ ایک سال سے اوپر ہی نظر آتے ___ بات بے بات ہنستے جاتے۔ کوئی دھمکی دیتا تو گلابی گلابی ہونٹ نکال کر یوں بسورتے کہ بس ___ کو بُری طرح پیار آجاتا ___ چھینکیں لگانے کی اتنی گندی عادت پڑ گئی تھی کہ کوئی غصہ میں ہو یا پیار میں جہاں کسی کو دیکھا اور لگے قیں قیں کرنے ___ چھ مہینے میں تو

عام بچے سیدھی طرح بیٹھ بھی نہیں پاتے، چیکو میاں لندیمنڈ فٹ بال۔ گھٹنوں کے بل گھر سے چلے جاتے ــــ گو نس کا ناک میں دم تھا ــــ آجا کے حلدمیاں سے شکایت کرتی۔

"بیرسٹر صاحب ــــ چھوٹا صاحب بھوت تلفی ہو گیا ہے۔ دن بھر میں کوئی ایک ڈزن سوٹ گندی کر ڈالتا ہے۔"

بیرسٹر صاحب بڑے پیار سے بولتے ــــ

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں ــــ ہم اور لے آئیں گے۔ بچے تو نالی ہی بھلے لگتے ہیں ــــ"

عطیہ بی نے اپنے کمرے کو درزی کی دکان بنا ڈالا ــــ ایک سے ایک بڑھیا کپڑا ــــ شفان، جارجیٹ، شنٹونگ، کریپ، امبوز، ٹیفٹا، ساٹن، اطلس، بس کمرے میں تتلیاں لگی ہوئی ہیں۔ کبھی جارجٹ کا جھنگلا سل رہا ہے تو کبھی شفان کی فراک، کبھی امبوز کے نکر شرٹ تو کبھی ساٹن کی چھوٹی سی اچکن ــــ پھر یہ کپڑے سل جاتے تو بڑے پیار سے اس لڑھکتے ہوئے فٹ بال کو جا کر اٹھلاتیں، نہلا دھلا کر کبھی چھوٹا سا کوٹ پتلون پہنا صاحب بہادر بنا دیتیں ــــ کبھی جھنگلا پہنا کر کا فور کا بجاسا بنا دیتیں۔ یہ سب ہو جاتا تو پھر ململ کا ڈھیلی آستینوں کا جالی کا کرتا اور ہرک کا چست پاجامہ پہنا کر دلی کا بانکا بنا ڈالتیں۔

اب عطیہ بی کا دن کا آدھے سے زیادہ وقت چیکو کی دیکھ ریکھ میں ہی گزرا کرتا ــــ اتنے ڈھیر سارے کام کبھی تو نہ اکتائیں۔ کبھی کپڑے سیتے سیتے دل ذرا اچٹ گیا تو اون کے پھندے ڈالنے بیٹھ گئیں۔

یوں بیرسٹر صاحب کفایت کی کرتے تھے مگر بیاں کا دل جو ٹھہرا۔ لال، نیلے، گلابی، پیلے اون کے گولے کے گولے اِدھر سے اُدھر لڑھکتے پھرتے — کبھی بوتڑ تو کبھی موزے کبھی ننھی کوٹی تو کبھی ٹوپی — عطیہ بی کا کمرہ کوئی دیکھتا بس عین بین نمائش گاہ بن کر رہ گیا تھا —

اُس دن حامد میاں باہر جانے کے لئے اٹھے تو ٹائی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بیزار ہو گئے۔ یہاں وہاں کونے میں، ریک میں، ہینگر میں — کہیں تو دکھائی دیتی — ! عطیہ وہیں گود میں چیکو کو لئے بیٹھی، ہنس ہنس کر اسے مٹھو کی طرح باتیں کرنا سکھا رہی تھی —

"ہاں بولو بیٹے — ڈے — ڈی — ڈے — ڈی "

چیکو نے جو اب ایک سال کے لگ بھگ ہو رہا تھا۔ اپنا گول گول منہ کھولا اور بولا دا..... وا —

عطیہ کو ہنسی آ گئی — " دادا نہیں — ڈے — ڈی "

چیکو پھر بولا — وا — دا —

حامد میاں جھلا کر بولے — " ایک گھنٹے سے ٹائی ڈھونڈ رہا ہوں۔ اور ذرا دھیان نہیں دیتیں — یہی وقت رہ گیا ہے باتیں سکھلانے کا۔ نان سنس "

عطیہ نے پیار سے میاں کو دیکھا اور بولی — سچ دیکھئے تو کس مزے سے وا — وا کہہ رہا ہے "

چڑ کر بولے — " کہتا پھرے، مجھے کیا — مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اُف اٹھو بھی — مائی گڈنس — دیکھو تو ابھی ناشتہ بھی نہیں لگا "

عطیہ چیکو کو مونڈھے پر ٹکا کر اٹھی ——— ہلکی سی "اونہہ" کے ساتھ الماری تک گئی اور ہینگر نکال کر بولی ———

"یہ کیا لٹک رہی ہے ٹائی" ———

ٹائی دے کر وہ دروازے تک گئی اور آواز دے کر بولی ——— "کریم سرکار کے لئے میز لگا دو" ——— اور واپس آکر خود چیکو کو لے کر بیٹھ گئی ———

"ہاں بیٹا بولو تو سہی ——— مم ——— می ——— مم ——— می ———

"مام ——— مام" ——— وہ منہ پھاڑ کر بولا اور بے بات دونوں ماں بیٹے زور زور سے ہنسنے لگے ———

حامد میاں نے ٹائی کی گرہ تنگ کرتے ہوئے ناگواری سے دونوں کو دیکھا اور ڈائننگ ہال کی طرف چل دیئے ———

جس دن پہلی بار چیکو نے "ڈیڈی" کہا عطیہ کا مارے خوشی کے برا حال ہوگیا ——— آنکھوں میں مارے خوشی کے پانی اُمڈ آیا ———

" اف دیکھئے تو ——— لوگوں کے بچے تو تین تین سال کے ہو جاتے ہیں اور منہ ہلانا تک نہیں آتا ——— وہ ثریا آنٹی کا بڑا بیٹا ٹوبی ——— تیسرا سال تو ختم بھی ہو چکا اور اب تک پانی کو پا کہتا ہے اور ہمارا چیکو ——— اُف خداوندا ——— مارے مسرت کے وہ اکدم بڑے بڑے پروگرام بنانے پر تُل گئی ———

" دیکھئے جی ——— یہ ہمارا چیکو بے حد جینیس ہے ——— ہم اسے کونونٹ میں تو داخل کریں گے ہی ——— مگر اس کا رجحان دیکھ کر تعلیم دلوائیں گے ——— وہ جیسا روس اور آسٹریلیا میں ہوتا ہے تاکہ بچوں کو ....

حامد میاں بور ہوکر بولے ــــ "ہاں ہاں سب کرلینا مگر ابھی سے اتنے لمبے چوڑے پروگرام بنانے کی کیا ضرورت ہے بھلا ــ اِٹ وِل ٹیک سَم لونگ ٹائم ــــ"

عطیہ ذرا بُرا مان کر بولی ــ "کیسے ڈیڈی ہیں آپ ــ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا کچھ نہ کر ڈالتا ــــ ننھی سی تو جان ہے اور ابھی سے اس منہ سے ڈیڈی ممی کہنے لگا ہے۔ ہائے میں تو کسی سے بتاتی بھی نہیں کہ ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا ــــ"

"عورتیں اپنے بچّوں کے متعلق کس قدر باتیں کرتی ہیں ــ !! اب تو لگتا ہے کہ تمھارے پاس کے سارے ٹاپک ختم ہوگئے ہیں ــــ"

عطیہ نے ذرا غور سے میاں کو دیکھا ــ۔ اے واہ ــ ایسی بھی کیا باتیں کرتی ہوں ــــ بس یہی تو کہ ابھی اپنا بے بی سال بھر ...... اکدم وہ کچھ یاد کرکے بولی ــــ "ہاں ڈارلنگ ــ چھ دن بعد چیکو کا پہلا برتھ ڈے ہے ۔ بہت زوردار قسم کی پارٹی کا انتظام کریں گے نا ــ آپ ــــ ؟"

حامد میاں نے غور سے عطیہ کی صورت دیکھی اور بولے ــــ "اور شائد تمھیں یہ یاد نہیں رہا کہ دو دن پہلے ہماری میرج کی سالگرہ کا ڈے پاس ہوچکا ہے۔ ہماری میریڈ لائف میں یہ شاید پہلا موقع تھا کہ کوئی "اینی ورسری" مِس ہوئی ــــ مجھے یاد تھی جان کر انجان بنا رہا۔ تمھیں اپنے چیکو سے تو فرصت ملے ــــ !

برتھ ڈے پر چیکو میاں کے ٹھاٹ نرالے تھے۔ مخمل کی نیکر،

مخمل کے جوتے — بڑے بڑے سنہرے بھورے بال الٹے بچے ہوئے — یوں رنگ کون کم گورا تھا کہ ماں نے پوڈر سرخی سے اور میدہ شہاب کر دیا تھا — کوٹھی سج رہی تھی۔ پوں پوں پیں پیں کرتی موٹریں آتیں اور کوٹھی کے ساتھ والے پارک میں ٹھہرتی جاتیں —

مہمانوں کو رسیو کرتے کرتے حامد میاں بور ہو گئے، سر میں درد ہونے لگ گیا۔ مگر عطیہ کے گلاب یونہی مہک رہے تھے — ہنس ہنس کر ایک ایک کو اتارتی۔ ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھاتی۔ چیکو کو پیار کرتی جاتی —

تحفے سنبھالنے کا وقت آیا تو چیکو میاں پورے بنئے بن گئے — جو بھی مہمان کوئی تحفہ دیتا بڑی شرافت سے لے لیتے اور سر جھکا کر ادا سے سلام کہتے — عطیہ نے خوش ہو کر فخر سے سب کی طرف دیکھا —

کمال ہے مسز حامد .... اتنا سا بچہ — بلیو می — اگر آپ یہ کہتیں کہ آج پہلا برتھ ڈے ہے تو میں تو سمجھتی کہ تین سال کے قریب ہیں یہ سٹریٹ" رپلی — میں خود سمجھ رہا تھا کہ دو ڈھائی سال سے کم کے کیا ہوں گے ماسٹر چیکو —"

ماسٹر چیکو اپنی تعریف و توصیف سے بے نیاز، تحفہ اٹھاتے اور سیدھے ماں کے ہاتھوں میں تھماتے — خوشی کے مارے عطیہ کے دانت منہ میں نہ سماتے تھے — ہنس ہنس کر بولتی — سُن رہے ہیں نا آپ —

"اجی دیکھ رہے ہیں نا آپ ۔"

مہمان چلے گئے تو عطیہ میاں سے بولی ۔ "لاکھ آپ مجھے جاہل کہہ لیں مگر میں تو اپنے چیکو کی کالے کوئلے سے نظر اتاروں گی ۔ ہائے سارے لوگوں نے جانے کیسی کیسی میلی نظروں سے دیکھا ہوگا ۔"

حامد میاں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہی بات سنائی

"اُف سر میں کس قدر درد ہو رہا ہے ۔" سیاہ ٹرم ٹیڈیکی سے ٹائی کھول کر انہوں نے یوں ہی میز پر پھینک دی اور کوٹ پتلون سمیت بیڈ پہ لیٹ گئے ۔

عطیہ خوشی خوشی باورچی خانے گئی ۔ وہاں سے کوئلہ لاکر اسے زمین پر گھسا اور تلوے اور ہتھیلیوں میں کالے داغ لگا دیئے ۔ پھر چیکو کے سر پر سے ہرے ہرے پان وار کے اس نے منہ ہی منہ بدبدانا شروع کر دیا ۔

آئے کی ، گئے کی

مالی کی ، مہتر کی ۔

بھنگی کی ، تمبولی کی

بھنگن کی ، تمبولن کی

سب کی نظر چولہے میں جائے جل ۔ جائے جل ۔ جائے جل ۔

وارے ہوئے پان اس نے مہری کو دیئے اور بولی ۔

"جا چولہے میں جلا دے پان کو ۔"

حامد میاں نے بڑی کوفت سے اس کی طرف دیکھا " حد ہے کوئی

دیکھے گا تو کیا کہے گا ــــ بی۔ اے پاس تو کیا، اس وقت چوتھی پاس بھی نہیں معلوم ہو رہیں تم ــــ یہ سب کیا نان سنس ہے "
" جی ہاں نظر بڑی بُری ہوتی ہے آپ کیا جانیں ــــ ؟ کوئی دکھ درد بھی ہو تو چلا جاتا ہے " ــــ !
ایکدم چاند میاں کو اپنے سر کے درد کا احساس ہوا۔ جھلّا کر بولے۔
" تو پھر میری نظر بھی اتار دو ــــ میں بھی درد سے مرا جا رہا ہوں " ــــ
عطیہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی ــــ
" ہائے کوئی سُنے تو کیا کہے ــــ ؟
چیکو کو تھپکی دیتی ہوئی بولی ــــ " ذرا چیکو سو جائے ــــ پھر لائٹ آف کر دوں گی " وہ دھیرے دھیرے گانے لگی ــــ
آجا نیند کی پری
آجا نیند کی پری.....

پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی کار کے ہارن کی پیں پیں سُن کر عطیہ دوڑی دوڑی آتی ــــ پورٹیکو میں جا کر خود ہی کار کا دروازہ کھولتی ــــ شرح کوٹھی کے بلیے چوڑے پورچ سے ہوتے ہوئے دونوں میاں بی بی اپنے کمرے میں آجاتے ــــ عطیہ کوٹ اتارتی۔ نکٹائی کھولتی ــــ اور تو اور جوتوں کے بند بھی خود ہی کھولتی ــــ باہر کی دو چار باتیں پوچھتی اور پھر چائے لگوانے کے لئے دوڑ جاتی ــــ
اب یہ ہوتا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی کار کے ہارن کی پیں پیں سُن کر عطیہ

دور کرنہ آتی ــــ ہارن بجا بجا کر بیرسٹر صاحب بور ہو جاتے اور خود ہی کار کا دروازہ کھول کر یوں ہی اتر پڑتے ــــ

سُرخ کوٹھی کے لمبے چوڑے پورچ (جو ان دونوں کو سدا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتا جاتا دیکھنے کا عادی تھا) سے وہ یونہی بیر پٹختے اندر کو آجاتے ــــ اندر آتے تو دیکھتے کہ گورنس تو ایک طرف آنو کی دم بنی دم بخود کھڑی ہے اور عطیہ بی بی چیکو کو سنبھال رہی ہیں ــــ ہنسا رہی ہیں گدگدا رہی ہیں۔ کپڑے بدلوا رہی ہیں ــــ کنگھی کر رہی ہیں ــــ عطیہ ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھتی اور پھر مسرت سے کھل کر بولتی ــــ

"اجی سنتے ہیں آج چیکو نے کیا کیا ــــ ٹابی پھاٹک پر بیٹھا تھا، جا کر اس کی دم گھسیٹ لی ــــ"

"قسم ہے آج تو میں حیران رہ گئی ــــ گورنس نے ذرا دلیئن پلانا چاہا تو منہ پھیر پھیر لیا اور میں نے جمچہ دکھایا تو اکدم سے لپکا چلا آیا ــــ خداوندا ــــ مجھے کس قدر پہچاننے لگا ہے ــــ"!

"ہاں ہاں تمہارا بیٹا تو بہت اڈونچرس ہے ــــ" وہ جھلا کر کچھ نہ کچھ بول ہی دیتے۔

ایک دن حامد میاں ورانڈے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چیکو سارے کمرے میں شور مچا رہا تھا، کبھی تو لکڑی کے گھوڑے پر بیٹھ کر اچکنے لگتا، کبھی اپنی چھوٹی موٹر پر بیٹھ کر کمرے کے اندر ہی ڈرائیونگ کی مشق شروع کر دیتا ــــ عطیہ بے حال تھی ــــ ہر ہر حرکت پہ نظر اور میاں کی توجہ دلانے پر آمادہ ــــ

"اے ذرا دیکھئے تو سہی یں وہ سلولائیڈ کا بوا پڑا ہے۔ مگر اپنی موٹر صاف نکال

لے گیا ۔۔۔ ذرا تو دھکا نہ دیا ۔"

" آپ نے مارک کیا زور سے چلاتے چلاتے کس مہارت سے ابھی سے نے بریک لگایا ۔۔۔ بالکل جیسا ہم آپ کرتے ہیں نا ۔"

" ہاں ہاں وہ بڑا ہو کر بس موٹر ڈرائیور ہی بنے گا ۔۔۔ اور کیا ۔"

" توبہ ۔۔۔ ایسی ہلکی بات کیسے سوچی آپ نے ۔۔۔ کیا ہم اپنے بیٹے کو بس ٹرک ڈرائیور بنا کر چھوڑیں گے ۔"

میاں نے طعنہ مارا ۔۔۔ " اب یہ تو اپنے اپنے رجحان کی بات ہے بھئی تمہارا بیٹا موٹر کی طرف بہت اٹنشن پے کرتا ہے ۔ ممکن ہے یہی اس کا پروفیشن بن جائے ۔" !

" چھی ایسا بھی کیا سوچتے ہیں آپ ۔۔۔ یہ کھیل کود کی بات تو ایسی ہے بھئی کہ ساری دنیا کے بچے ایک سے ہوتے ہیں ۔"

عطیہ نے بڑی مشکلوں سے بے بی کو " کِس " کرنا سکھایا ۔۔۔ اس دن حامد میاں کمرے سے باہر نکلے تو چیکو میاں پھدکتے ہوئے گئے اور ٹانگوں سے لپٹ گئے ۔۔۔ باپ نے لاڈ میں آکر اٹھایا تو جھٹ سے جوابی کارروائی کر دی ۔

" اچھا ۔۔۔ حامد میاں خوشی سے بولے ۔۔۔ " یہ یہ شاہکار " !!

عطیہ ہنستی ہوئی آئی اور بولی ۔۔۔

" بھئی آپ نے کسی اتنے چھوٹے بچے کو اتنا چالاک پایا ۔"

" چالاکی کی کیا بات ہے ۔ اس نے کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا کہ ڈیڈی ممی کو کِس کر رہے ہیں ۔۔۔ بچہ بھی سیکھ گیا ۔"

عطیہ شرما گئی ــــ پھر ذرا برُا مان کر بولی ــــ

"حد ہے ــــ کبھی تعریف نہیں کرتے اور بے بی جب تک پیدا نہیں ہوا تھا کتنی باتیں کیا کرتے تھے ــــ اب تو یوں لگتا ہے گھر میں آپ کو......

چیکو ــــ چیکو ــــ چیکو ــــ جب دیکھو تب چیکو ــــ جب سنو تب چیکو کی باتیں ــــ جب آؤ تب چیکو کا ذکر ــــ

حامد میاں نے بھونڈے پن سے ایک غیر متعلق سوال کیا ــــ

"ہاں ڈارلنگ ــــ یہ عورتوں کو اپنے بچّوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا میاؤں سے ؟ ــــ"

عطیہ نے ایک دم چونک کر میاں کو دیکھا ــــ

"جی ــــ جی ــــ کیا کہا آپ نے ؟ ــــ"

"یہی کہ ایک عورت اپنے بچے کو زیادہ چاہتی ہے یا اپنے شوہر کو ــــ آئی مین ــــ وہ ایک چائلڈ اور ہسبنڈ میں کس کو پری فر کرتی ہے ؟ ــــ"

"اجی واہ ــــ یہ بھی خوب سوال کیا آپ نے ــــ" کس کو کرتی ہے ــــ دونوں ہی برابر ہوتے ہیں ــــ شوہر اس کے سہاگ کی مسرت ــــ بچہ اس کی ممتا کی تسکین ــــ ایک ہی بات ہے کوئی فرق نہیں" ــــ اس نے باری باری پیار سے چیکو اور حامد میاں کو دیکھا ــــ

"حامد میاں نے صفا طعنہ مارا ــــ" بھئی ہم جو ایک دو مین بن کر پیدا ہوئے ہوتے تو ہسبینڈ سے زیادہ چائلڈ کو چاہتے"

عطیہ نے انھیں دیکھا تو بولے ــــ "ہاں بھئی سچ کہہ رہے ہیں ــــ اور کیا ــــ عورت اپنے بچے کو ہی زیادہ لَو دیتی ہے" !

عطیہ کے ہاتھ سے چیکو کی گیند چھوٹی اور دور تک لڑھکتی چلی گئی۔
دوسرے دن موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سورج غروب ہونے ہی کو تھا۔ عطیہ نے خود بھی ڈریسنگ کی اور چیکو کو پکڑ کر کپڑے بدلانے لگی ۔۔۔ شارک اسکن کے چھوٹے سے سوٹ میں مسٹر چیکو بیحد اسمارٹ نظر آ رہے تھے ۔۔۔ اس نے پیار سے دیکھا اور بولی ۔۔۔ "کیا ٹھاٹھ ہیں پیارے ۔"

گود میں اٹھائے اٹھلاتی باہر آئی اور بولی ۔۔۔

"ڈیر آج ذرا گھومنے چلیں گے نا ۔۔۔ دیکھئے آپ اور چیکو پیچھے بیٹھیں اور اسٹیرنگ میں سنبھال لوں ۔"

حامد میاں بدک کر بولے ۔۔۔ "یوں کرو کہ چیکو کو پیچھے بٹھا دو اور تم مزے میں ڈرائیونگ کرتی چلی جاؤ ۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔۔۔ اس وقت میں ذرا ہیڈیک محسوس کر رہا ہوں ۔"

عطیہ ناگواری سے بولی ۔۔۔ "جانے آپ کو کون سا ہیڈیک لپٹ گیا ہے، ہر وقت اسی کا بہانہ کرتے رہتے ہیں۔

"پلیز ۔۔۔ اکسکیوز می ۔۔۔ میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں ۔"!

"دیکھئے موسم اتنا خوشگوار ہے کہ آپ باہر نکلتے ہی موڈ میں آ جائیں گے ۔۔۔ ذرا اٹھئے تو سہی ۔" وہ ذرا بُرا مان کر بولی ۔۔۔ جانے کیا ہوتا جا رہا ہے آپ کو ۔۔۔ پہلے تو کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ اب یوں سڑے سڑے رہنے لگے ہیں ۔۔۔ اٹھئے نا ۔" ؟

حامد میاں نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا ۔۔۔ یہ عطیہ اتنی بھولی کیوں ہے ۔۔۔ !

"بھئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چیکو صاحب کے ہوتے ہوئے آپ کو میری کمپنی کی ضرورت کیسے محسوس ہو سکتی ہے — میں نہ جاؤں گا — وہ منہ موڑ کر بیٹھ گئے —

عطیہ نے اب کے نہایت غور سے میاں کو دیکھا — اور پھر چیکو کو۔

"چیکو صاحب — !! یہ بے چارے چیکو پر غصّہ کیوں "— ؟؟

وہ ساڑی کا پلو سنبھالتی اندر چلی گئی —

گورنس اپنے بھدے بھدے جسم کو سنبھالتی ہوئی آئی اور دروازے کے پاس لگی لگی بے بسی سے بولی —

"بیرسٹر صاب — ہم بول نہیں سکتا یہ چھوٹا صاب کس قدر ناٹی ہے۔ آپ بلیو نہیں کرے گا صاب۔ ہم سویا ہوا تھا اگر ہماری ناک پر کاٹ کھا گیا "—

حامد میاں کو ہنسی آ گئی مگر روک کر بولے —

"تم نے اسے پنش کیا ہوتا — ایسے تو وہ اور ناٹی ہو جائے گا "—

نہیں صاب ہم صاب لوگ کو کیسے پنش کر سکتا ہے۔ بڑا میم صاب ہم کو باتیں سنائے گا "—

کون بڑا میم صاحب "— حامد میاں حیرت سے بولے۔

آپ کا ممی سر — اس کی آواز میں بیزارگی تھی — کوئی ہمیں کچھ نہیں کرنے دیتا۔ اور بے بی حد درجہ ناٹی ہوتا جا رہا ہے "—

حامد میاں کچھ نہ بولے تو وہ پھر بولی — "ادھر ہم کنگھی کرتا ہے

تو ہمارے بال نوچ ڈالتا ہے۔ گیسٹ آئیں تو ہر ایک کو زبان نکال نکال کر چڑاتا ہے۔"

یہ چیکو اس قدر نالی ہے ۔۔۔! حامد میاں کو سوچ کر ہنسی آ گئی ۔۔۔ بولے ۔۔۔" اچھا تم جاؤ ۔۔۔ ہم ممی سے سمجھا دیں گے کہ آپ گورنس کو کسی بات پر منع نہ کیا کریں۔"

ادھر دادا دادی کیا پوتے کو دیکھنے آئے کہ چیکو میاں کو کھلی چھٹی مل گئی ۔۔۔ کسی کو دھول جما دی، کسی کو کاٹ لیا ۔۔۔ کسی کے جسم پر پانی کا گلاس اوندھا دیا تو کسی پر کتے کو بھونکنے پر لگوا دیا ۔۔۔ حامد میاں حد درجہ پریشان تھے ۔ یہ سارے کرتوت عطیہ کے تھے ۔ لاڈ میں سڑا کر دو کوڑی کا کیئے دے رہی تھی ۔۔۔ شام ہوئی تو ساس سسرے بہو اور پوتے میاں، سب لان میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھتے ۔۔۔ نوکر دور کھڑے تماشہ دیکھا کرتے ۔۔۔ کبھی پھولوں کی شامت آتی ۔۔۔ کبھی بالتو چڑیوں کی ۔۔۔ کبھی بلی کی دم کھینچی جا رہی ہے تو کبھی دادی کی ناک، عطیہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا ۔۔۔ دادا دادی بھی پھولے نہ سماتے ۔

حامد میاں اپنے کام کا بہانہ کیئے اپنے کمرے میں ہی چھپے رہتے ۔

اس دن شام کو عطیہ لپکی ہوئی آئی اور بولی ۔۔۔۔

" ہائے جلدی ڈاکٹر کے پاس چلئے ۔۔۔ چیکو گلاب کا پھول توڑ رہا تھا کہ انگلی میں کانٹا چبھ گیا ۔"

گلاب کے کانٹے سے اتنی پریشانی ۔۔۔ !! حامد میاں کا غصہ بھڑک اٹھا مگر بھلے سبھاؤ میں بولے ۔۔۔۔

"کیوں ڈرائیور کہاں ہے"۔ ؟

"وہ آج چھٹی لے کر گیا ہے ۔ اٹھئے نا جلدی ۔ پلیز ۔

"تو تم خود چلی جاؤ"۔

"میں"۔؟ وہ چلّا کر بولی ۔ "ہائے گھبراہٹ میں مجھے ڈرائیو کرنا بھی نہ سوجھے گا ۔ چلئے نا ۔ پلیز ۔ پلیز ۔

حامد میاں بدک اٹھے ۔ بپھر کر بولے ۔ " اور جو میرے دل میں اتنے سارے کانٹے چبھے ہیں تو کبھی تم نے ...... جانے کیا سوچ کر وہ چپ رہ گئے اور رسان سے بولے ۔ "چلو"۔

راستہ بھر دونوں نے ایک بات نہ کی ۔ ایک بار عطیہ نے یونہی سر اٹھا کر دیکھا ۔ ان کے بال اُلجھے ہوئے تھے ۔ قمیض کے اوپری دو بٹن کھلے ہوئے تھے ۔ وہ بڑے بے تکے پن سے کار چلا رہے تھے۔ عطیہ نے غور سے بہت غور سے حامد میاں کو دیکھا ۔ پھر دیکھا ۔ پھر دیکھا ۔ ایک بار اور دیکھا اور پھر روتے ہوئے چیکو کو زور سے لپٹا لیا۔

دوسرے دن حامد میاں باہر جانے کو اُٹھے تو عطیہ نے الماری سے کپڑے نکالے ۔ سوٹ کیس سے نیا سوئٹر ۔ ہینگر پر سے ٹائی کھینچی اور کوٹ لے کر حامد میاں کے پاس پہنچی تو وہ بولے ۔

"اخاہ ۔ یہ آج کیا کھیل ہو رہی ہے ۔ بائی گاڈ ۔ تمہیں بالکل زیبا نہیں کہ اتنے بڑے آدمی کو بچے کی طرح کپڑے پہناؤ"۔ وہ لفظ بچے پر زور دے کر بولے ۔

عطیہ نے کچھ جواب نہ دیا ــــ اور ہلکے سے مسکرا کر ان کی گردن میں ٹائی کسنے لگی ــــ ٹائی باندھ کر فارغ ہوئی تو برش لے کر جوتوں پر پالش کرنے بیٹھ آئی ــــ پالش کر چکی تو میز پر ناشتہ لگوایا ــــ میاں ناشتہ کر چکے تو ساتھ ساتھ موٹر تک آئی (آج کئی زمانے بعد لال پتھر کے پورچ نے پھر ان دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتا دیکھا) اور جب وہ موٹر میں بیٹھ گئے تو اپنا ہاتھ ہلا کر بولی ــــ "خدا حافظ بائی ــــ بائی ــــ"

حامد میاں باہر سے واپس ہوئے تو موٹر کی پیں پیں سنتے ہی عطیہ لپکی آئی ـ کار کا دروازہ کھول کر میاں کو آتارا اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر پہنچ گئے ـ ٹائی، جوتے کوٹ سے فارغ ہو گئے تو جا کر کپڑے بدل آئی اور ذرا لگاوٹ سے بولی ــــ

" اتنے دنوں سے کوئی پکچر نہیں دیکھی ــــ آج چلیں گے "ــــ؟؟

حامد میاں نے عطیہ کو دیکھا ــــ شلوار ــــ تنگ تنگ لمبی سی قمیض ــــ باریک نائلون کا انگا ــــ جسم کے سارے چھپے ڈھکے راز عیاں ہو رہے تھے ــــ وائف اتنی اسمارٹ نظر آ رہی ہو تو گھومنے کو نہ جانا سراسر بدذوقی ہے ــــ وہ مسکرائے ـ

"اچھا چلو ــــ تم کہتی ہو تو "ــــ

عطیہ نے مشینی انداز میں ہنستے ہوئے پرس اٹھایا اور بولی ــــ چلئے "ـ

پکچر دیکھ کر لوٹے تو حامد میاں پھولوں نہیں سما رہے تھے ـ عطیہ بی بی کے ہونٹوں کی لپ اسٹک ان کے اپنے ہونٹوں پر منتقل ہو گئی تھی ــــ

اتنے دنوں بعد آج پکچر دیکھنے کا مزہ آیا ––

"شام بڑی اچھی کٹی –– بائی گاڈ –– بڑی گرینڈ پکچر تھی" –– انھوں نے شر ریز نگاہوں سے عطی ڈارلنگ کو دیکھا ––

عطیہ نے خاموشی سے سر جھکا لیا ––

ایک دن ––

دو دن ––

تین دن ––

چار دن ––

ایک دن عطیہ حامد میاں کے پاس بیٹھی سوئٹر بن رہی تھی کہ گورنس لپکی ہوئی آئی اور بولی ––

" میم صاحب آپ بے بی کو اکدم بھول گیا ہے ایسے تو اس کی ہیلتھ پر برا اثر پڑیگا۔ کل سے تو وہ آپ کو بھوت یاد کر رہا ہے –– کہیں بیمار پڑ گیا تو ––؟

حامد میاں اور عطیہ نے ایک دوسرے کو چونک کر دیکھا –– پھر عطیہ غصے غصے بولنے لگی ––

پھر تمھیں سو روپے کاہے کے ملتے ہیں کہ ایک بچے کو سنبھال نہیں سکتیں –– ایسے کیسے بیمار پڑے گا ––؟

" وہ –– وہ –– میم صاب ....." گورنس نے آج تک کبھی میم صاب کو اتنے غصہ میں نہ دیکھا تھا –– سہم کر بولی –– " آپ پہلے تو اتنا لاڈ کرتا تھا اور اب اکدم بھول گیا ہے تو ....

" بکواس مت کرو ـــــ جا کر بے بی کو دیکھو "ـــــ

حامد میاں کی سمجھ میں یہ تماشا بالکل نہ آیا اور انھیں پسند بھی نہ آیا ـــــ

چار پانچ دن اور یوں ہی گذر گئے ـــــ

ایک دن عطیہ حامد میاں کی پسند کی شکم پور بنا رہی تھی ـــــ باورچی خانہ کوٹھی سے خاصہ دور تھا ـــــ عطیہ کے پیچھے وہ بے بی کے کمرے پر گئے اور مہری سے پوچھا ـــــ

" کیوں بے بی کیسا ہے "ـــــ ؟

" اچھے ہیں سرکار ـــــ پن اب سرارت پہلے جیسی نہیں کرتے۔ جرا گریب ہو گئے ہیں پہلے سے "

" اور سرکار کیا کرتی رہتی ہیں دن بھر "ـــــ انھوں نے ذرا چپکے سے پوچھا۔

سرکار وہ تو آپ کے کمرے میں ہی رہتی ہیں ـــــ کبھی سوئٹر بنتی ہیں۔ کبھی آپکے کپڑے جما جما کر رکھتی ہیں ـــــ کبھی جوتے پر پالش کرتی ہیں تو کبھی.....

" تو دن بھر یہی کام کرتی ہیں "ـــــ

" ہاں ہاں بس ایسے ہی دن گجر جاتا ہے "

اور بے بی کے پاس نہیں جاتیں "ـــــ ؟

پہلے تو سارا سارا دن بے بی سے ہنستے بولتے گجر جاتا تھا۔ پن اب تو کبھی پلٹ کر دیکھتیں بھی نہیں ـــــ اگر گورنس کچھ شکایت کرے تو بھپر کر بولتی ہیں ـــــ

" بھوروپے کا ہے کے لیتی ہے "ـــــ ؟

" اور بے بی بھی یاد نہیں کرتا "ـــــ ؟

" اے سرکار وہ تو آٹھ چار دن میں ہی سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ آپ کو اپنے

کام کاج سے کہاں بھرست کہ پاپا ہر کاری کی کھبر لیں"۔ مہری ایسی بدتمیز تھی کہ جو منہ میں آتا مزے سے بک جاتی ــــ

ابھی ابھی آٹھ چار دن پہلے جس گھر میں قہقہے اچھلتے تھے، اکدم سے سناٹا پڑ گیا ـــ چیکو میاں ماں کی شہ پاکر شیر تھے ـــ اب ماں نے رخ پھیر لیا تو ان کی مستی بھی ہوا ہوگئی۔ پہلے تو بار بار کمرے کے دروازے کے پاس آ آکر جھانکتے ـــ بڑی دل لبھانے والی آواز میں پکارے جاتے ـــ مم ـــ می ـــ مام ـــ می ـــ

مگر ممی بجائے لینے یا چمکارنے کے بولتی ـــ جاؤ آیا کے پاس جاؤ" وہ بھلا کب کوئی بات مانتے تھے کہ ابھی مان جاتے ـــ ؟ اندر ہی گھسے آتے تو وہ جھڑک کر گورنس سے بولتیں ـــ

" اسے لے جاؤ گی یا نہیں" ـــ ؟

وہ بھد بھد کرتی آتی اور ہانپتے ہوئے اٹھائے جاتی ـــ

یسوع مسیح کی دہائیاں دیتی ہوئی بولتی ـــ

خدا خدا ـــ کیا ناٹی بوائے ہے۔ ہم تے اپنی لائف میں ایسا بے بی کبھی نہیں پالا"

پندھرواڑے کے پندھرواڑے بے بی کا وزن ہوتا تھا ـــ اب کے جو ہیلتھ رپورٹ آئی تو چیکو میاں کا دو پونڈ وزن کم ہوگیا تھا ـــ

عطیہ تو سن رہ گئی مگر حامد میاں کو پتہ نہ چلا ـــ پتہ چلتا بھی نا اگر مہری اور گورنس آپس میں باتیں نہ کرتیں ـــ

" مدر اگر اٹنشن پے کرنا چھوڑ دے تو بچے کی ہیلتھ ڈاؤن ہو جاتی ہے"

مہری کچھ نہ سمجھ کر حیرت سے بولی ـــ" وہ کیا بات ہوئی" ـــ ؟

گورنس جھلا کر بولی ــــ " تم لوگ جلدی بات سمجھتا کیوں نہیں ــــ ماں محبّت کرنا چھوڑ دے تو بچّہ کا تندرستی کھراب ہو جاتا ہے ــــ دیکھو لو اتنی جلد دو پونڈ وزن اتر گیا "ــــ

" دو پونڈ ہوئے تو کتنا "ــــ ؟

" تمہارے حساب سے ایک سیر "ــــ

" تیار رے ــــ میری سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی ــ ایک سیر "ــــ ؟ ؟

حامد میاں نے جاکر جیکو کو دیکھا ۔ اپنے بستر پر وہ کھلونوں میں گھرا پڑا تھا مگر ان سے کھیل نہیں رہا تھا ــ گال پتلے پتلے ہو گئے تھے اور رنگ جو گلاب کی مانند تھا ذرا پھیکا پھیکا سا پڑ گیا تھا ۔ وہ پریشانی سے عطیہ کے پاس آئے ــــ

" ارے عطی ڈیر ــــ یہ جیکو کی ہیلتھ ڈاؤن کیوں ہوتی جارہی ہے "ــــ ؟

" ویسا ہی تو ہے "ــــ

" کہاں ہے ــــ تم نے رپورٹ دیکھی ــــ اور اب شرارتیں بھی ختم کر دی ہیں ــ وہاٹ ہیپنڈ ٹو ہم "ــــ ؟

" ہی اِز پرفکٹ لی آل رائٹ "ــــ عطیہ نے سر جھکائے جھکائے آزردگی سے جواب دیا ــــ

ہوتے ہوتے جیکو کے قہقہے بالکل ہی ختم ہو گئے ــــ اگلی رپورٹ آئی تو اس میں خاصی پریشانی کا اظہار کیا گیا تھا ــــ جیکو کو مستقل ٹمپریچر رہنے لگا ــــ جیکو کا کمرہ الگ تھا ــــ گورنس ساتھ ہی رہتی تھی وہ بار بار نئی ممی کی رٹ لگاتا ــــ گورنس کبھی ممی سے جاکر کہتی کہ بابا سرکار آپ کو

پکارتا ہے۔" تو ممّی بھیر کر گھرکی بتاتی ۔
" تم سے اتنے سے بچے کو بہلانا بھی نہیں ہوتا تو سروس کرنے نکلی ہی کیوں ہو؟"
ایک رات حامد میاں کی آنکھ کھلی تو ہلکی سبز روشنی میں انھیں عطی
ڈیر کا پلنگ خالی نظر آیا ـــ تشویش سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر
باہر نکل آئے ـــ باہر سیڑھیوں پر عطی بیٹھی چھم چھم روئے جاتی تھی۔
انھوں نے سہم کر اُسے دیکھا ـــ وہ اس قدر دبلی نظر آرہی تھی ـــ
عطیہ مشین بن کے رہ گئی تھی ـــ ہنستے ہوئے کوٹ چڑھانا
مسکراتے ہوئے ٹائی باندھنا ـــ گنگناتے ہوئے جوتوں کو پالش کرنا اور
لچکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں سے میاں کو سی آف کرنے پورچ تک آنا۔
اب حامد میاں کو عطیہ سے کوئی شکایت نہ تھی مگر پھر بھی وہ بے کل بے کل سے
نظر آتے ـــ گھر میں ان کا دل نہ لگتا ـــ کون تھا جس نے ان کی خوشیوں
بھری زندگی میں ایسے کانٹے بو دیئے تھے ـــ ؟ عطیہ کے پیار کرتے انھیں
کبھی چیکو کو پیار کرنے تمنا نہ ہوئی ـــ بلکہ انھیں چیکو کو دیکھتے ہی آگ
لگ جاتی تھی۔ مگر اب تو انھیں لگتا کہ چیکو نہیں تو کچھ بھی نہیں ـــ عطی ڈارلنگ
کی اداؤں میں کوئی دل لبھا لینے والا انداز تھا نہ زندگی میں کوئی رس ـــ گھر کی
خوشی کو کسی نے جیسے قید کر لیا تھا ـــ
اُس رات چیکو کی طبیعت اچانک اتنی بگڑ گئی کہ گورنس چیخیں مارتی
ہوئی عطیہ کے کمرے کو لپکی آئی ـــ
" سر ـــ میم صاحب ـــ بے بی چیختا ہے ـــ ممی کو یاد کرتا ہے ـــ
پاؤں پٹختا ہے اور زور زور سے ہنستا ہے "ـــ

عطیہ اکدم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر حامد میاں کی طرف دیکھ کر پھر رک سی گئی ۔۔۔ ایک پھندہ سا آکر حلق میں اٹکا اور اس نے منہ پھیر لیا ۔۔۔

بیرسٹر صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور اکدم بولے ۔۔۔ "اور تم نے ڈاکٹر کو فون بھی نہیں کیا" ۔۔۔ ؟

گورنس نے بھی دھوپ میں بال نہیں سکھائے تھے ۔۔۔ ذرا غصے سے بولی ۔۔۔

آپ دونوں کے جھگڑے نے ہمارے بے بی کا رگڑا کر دیا ۔۔۔ ایسے بیمار کو ڈاکٹر کی نہیں مدر کی لو کی ضرورت ہوتی ہے سر" ۔۔۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔۔۔

وہ بڑے پیار اور بزرگانہ انداز سے بول رہی تھی ۔۔۔

" ارے کبھی بچے کی وجہ سے ایک وائف اپنے ہسبنڈ کو ہیٹ کر سکتی ہے ۔ چائلڈ تو دونوں میں پیار بڑھاتا ہے اور ......

حامد میاں نے پھر کچھ نہیں سنا ۔۔۔ جلدی سے عطیہ کا ہاتھ پکڑا اور بولے۔

"ڈارلنگ اٹھو ۔۔۔ چیکو تمہیں پکار رہا ہے" ۔۔۔

عطیہ کے آنسو بہہ رہے تھے ۔۔۔ وہ بے تابی سے چیکو کے کمرے کی طرف بھاگی ۔۔۔ اور حامد میاں بھی پیچھے ہی لپکے ۔۔۔

" مم ۔۔۔ می ۔۔۔ مام می ۔۔۔ چیکو کی ہچکی بندھ گئی ۔۔۔ عطیہ نے بڑھ کر اسے گلے میں لپٹا کر بے تحاشا چومنا شروع کر دیا ۔۔۔ "میرا بچہ ۔۔۔ میرا گڈا ۔۔۔ میرا چیکو ۔۔۔ میرا لال ۔۔۔ وہ بدحواس ہوئی جا رہی تھی ۔۔۔

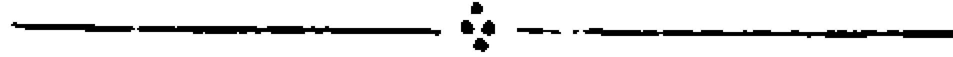
چیکو نے آنکھ کھول کر ماں کو دیکھا اور پہچان کر اکدم پیار کرنا شروع کر دیا۔

ممّی کے گالوں پر — گردن پر — بالوں پر، ننھے منّے ہونٹ — چٹ — چٹ کرتے گئے۔

حقی ڈارلنگ — تمھارا بے بی تو بڑا جینئیس ہے بھئی — حامد میاں شرارت سے مسکرائے — "ابھی سے کِس کرتا ہے — آئیں"— ؟ ؟

عطیہ نے آنسوؤں کی بوچھاڑ میں ہنستے ہنستے جھانکا اور رکتے شرماتے بولی — کس کا بیٹا ہے آخر — ؟ ؟

"اچھا" ؟ اور بیرسٹر صاحب نے آگے بڑھ کر حقی ڈارلنگ کے گال پہ ایک بھرپور "کِس" ثبت کر دیا —



خون

سیّد صاحب لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آئے اور آتے ہی پلنگ پر ڈھیر ہو گئے۔

"دولہا مسند پر سے اٹھ گیا۔" جانے کس طرح وہ یہ الفاظ ادا کر سکے۔

زاہدہ بیگم الائچی اور چکنی چاندی کے ورقوں میں مڑتفنی بیٹھی تھیں۔ انھوں نے جو یہ بات سُنی تو کیسی الائچی اور کہاں کی چکنی، ہاتھ کی تھالی پٹخ یونہی لپکی آئیں۔

"کیا کہہ رہے ہیں جی آپ؟" انھوں نے میاں کا شانہ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

گھر مہمان بیبیوں سے بھرا پڑا تھا۔ باہر ڈھم ڈھما ڈھم شہنائی پٹ رہی تھی۔ دلہن کو چڑھاوے کا جوڑا تک پہنا دیا گیا تھا بس عقد خوانی ہو کر نتھ اور کالی پوت کا لچھا پہنانا باقی تھا کہ یہ گل کھل اٹھا۔

سید صاحب نے کنوئیں میں سے آواز دی۔

"دلہا والے کہتے ہیں لڑکی میں عیب ہے۔"

"عیب؟" زاہدہ بیگم اتنی زور سے چلائیں کہ آنگن میں بیٹھی مہمان بیبیاں مڑ مڑ کر دیکھنے لگیں۔ "بولنے والے کا منہ نہ نوچ ڈالوں۔"

" منہ نوچوگی تب نوچوگی، اس وقت کیا ہوگا مگر؟ دلہا مسند سے اُٹھ گیا تو سمجھو اپنی شدہ دُنیا سے اٹھ گئی۔ چڑھاوے کا جوڑا تک چڑھ گیا، ایسی ٹھکرائی کو کون گلے لگائے گا؟" سید صاحب کی آواز ڈوبتی ہی چلی گئی۔

" مگر یہ عیب لگانے والے ہیں کون، میں بھی تو سُنوں!" وہ چنگھاڑیں۔

" عیب کا تو نام ہی نام ہے، لوگ کہہ رہے ہیں کہ دان جہیز کم ہے، اس لئے باتیں بنا رہے ہیں۔"

زاہدہ بیگم نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

" دان جہیز کم ہے؟ تو ہم نے پہلے ہی کب کہا تھا کہ گھر بھر دیں گے۔ کیا اُن کو معلوم نہ تھا کہ ہم بس گوشت کا گولہ ہی بیاہ رہے ہیں۔ اتنے پیر نورانی بھتے نا؟"

" ہاں بھتے۔" وہ سانس بھر کر بولے، " مگر یہ نہ سمجھے تھے کہ سچ مچ ہی کچھ نہ ملیگا۔"

" مگر یہ شوشہ چھوڑا کس نے ہے۔ ابھی تو وداعی کا وقت بھی نہیں آیا۔ انھیں بھلا پتہ کیسے چلا کہ ہم جہیز کے نام سے کچھ بھی نہیں دے رہے ہیں؟

سید صاحب نے بے بسی سے بیوی کو دیکھا۔

" مہر کی بات پر بات نکل آئی۔ تم نے گیارہ ہزار مہر باندھنے کو کہا تھا نا؟ ادھر سے کچھ کھس پھس ہوئی اور کسی نے کہا کہ اگر دان جہیز زیادہ ہے تو مہر بھی زیادہ بندھے گا اور اگر کم ہے تو یونہی باندھیں گے۔ مگر اتنے ہی اتنے کسی نے کہہ دیا کہ کم زیادہ کی کیا بات ہے، بس دلہن جسم کے تین لال کپڑوں سے بیاہی جا رہی ہے۔ یہ سُننا تھا جیسے سناٹا پڑ گیا۔ اور طرح طرح کی باتیں دلہا والوں میں ہونے لگیں۔"

بیوی جلدی سے بولیں " چولھے بھاڑ میں ڈالو مُوا مہر، چاہے گیارہ روپے کیوں نہ باندھ دیں وہ، ہمیں اتنا ہی قبول ہے، مگر یہ رسوائی تو نہ ملے۔"

سید صاحب ناامیدی سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "اب کچھ بھی بس میں نہیں رہ گیا ہے بیگم۔"

وہ ایک لمحہ ایک صدی بن کر گذرا۔ زاہدہ بیگم نے تھرتھراتے ہاتھوں سے پلو تھام کر آنسو پونچھے اور پوچھا۔

"تو اب سندو کا کیا بنے گا؟"

"اللہ مالک ہے۔"

زاہدہ بیگم نے چور نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا پھر سرگوشی میں بولیں۔ "گاؤں میں اب کوئی ایسا لڑکا نہیں جسے دلہا کی جگہ دی جا سکے؟"

زاہدہ بیگم کے منہ کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سید صاحب اپنی جگہ سے جیسے اُچھل پڑے۔ بیوی نے جھجک کر دیکھا تو ان کے منہ پر حیرت، خجالت اور غصّے کے کئی رنگ جھلک اٹھے تھے۔

"تم کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتی ہو بیگم! بھلا یوں بھی کہیں ہوا ہے۔ کون ہے جو اس وقت تمھاری سندو کا شوہر ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تمھیں پتہ نہیں کتنی چھان پھٹک کے بعد میں نے خون سے خون اور نسل سے نسل کا ناطہ ڈھونڈا تھا۔ تم کیا سمجھتی ہو ہم اپنی سندو کی شادی کسی بھی ایسے ویسے سے کر دیں گے۔"

"آپ اتنے غصہ تو نہ ہوں۔ آخر میں نے کون سی انہونی بات کر دی۔ آپ یہ تو سمجھئے یوں اسے جلوے کے تخت سے اٹھا دیں گے تو اس کی زندگی کیا رہ جائے گی؟"

"ہاں ہاں تو پھر یہی اچھا ہے نا کہ سامنے سے نتھو چمار کو بلا کر مسند پر بٹھا دیں۔ وہ شاہدہ کے جوڑ کا بھی ہے اور دن بھر میں کمائی بھی خوب کر لیتا ہے۔ آخر شادی کرنی ہی ٹھیری تو کسی سے بھی سہی۔"

زاہدہ بیگم نرم پڑ کر بولیں، "یہ سوچ لیجئے کہ شدہ ابھی ہمارے لئے ایک پتھر ہے۔ آج کے بعد وہ ایک چٹان بن جائے گی جسے آپ ہٹانا چاہیں تو بھی نہ ہٹا سکیں گے، پھینکنا چاہیں تو جگہ سے ہلا بھی نہ سکیں گے۔ وہ کنواریوں میں رہے گی نہ بیاہیوں میں۔ وہ بن ماں باپ کی بچی آخر کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟"

سید صاحب نے سہم کر سر اٹھایا۔ بیگم کی باتیں کتنی سچی اور دل کو لگتی ہوئی تھیں! انھیں محسوس ہونے لگا کہ ان کے سینے پر ایک چٹان رکھی ہوئی ہے اور لمحہ بہ لمحہ اس کا وزن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ گھبرا کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"پھر میں کیا کروں۔ میری نگاہ میں کوئی لڑکا نہیں۔" زاہدہ بیگم گھبرا گھبرا کر خیالوں ہی خیالوں میں ایک ایک پر نظر دوڑانے لگیں۔ کسی کی شادی کی بات پکّی ہو گئی تھی۔ کسی کی شادی ہونے والی تھی؟ کسی کو اپنے کنبے قبیلے کا دھیان تھا، کہیں خون اور نسل کے جھگڑے تھے۔ پھر..... پھر..... اب کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟

آنگن میں مہمان بیبیوں کے بچّوں نے مغرب ہو جانے اور بھوک لگ جانے پر رونے دھونے کا پروگرام زوروں پر شروع کر دیا تھا۔ بیبیاں منہ اٹھا اٹھا کر چلانے لگیں۔

"اے بی اب جلوے میں کاہے کی دیر ہے، آخر گھر جانا ہے کہ نہیں۔"

تو گویا اب سورج سر پر آ رہا ہے۔ ابھی ابھی ساروں میں یہ بات کھیل جائے گی۔ جلتا جلتا سورج ہوش و حواس کھو کر رکھ دے گا۔ لوگوں کے سامنے کیسے آنکھیں اٹھائی جا سکیں گی۔ کسے پکاروں، کدھر دیکھوں خدایا! زاہدہ بیگم نے بیچارگی سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ کھڑکی سے باہر اُن کی نگاہ پڑ گئی۔ سعید اپنی سفید

گھوڑی پر بیٹھا کھیتوں سے واپس ہو رہا تھا۔
شہنائی کی مدھم پڑتی تانیں جیسے ان کے ذہن میں پھر شور مچانے لگیں انہوں نے خوشی خوشی پیر اٹھائے اور کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہوئیں۔ اپنے آپ ان کے منہ سے نکلا۔ "سعید جا رہا ہے"
ان کی اپنی آواز ان کے اپنے ہونٹوں سے نکل کر ان کے اپنے کانوں سے ٹکرائی تو ایک دم ان کو احساس ہوا کہ ان کی یہ تمنا سب سے شدید سہی مگر سب سے زیادہ ناممکن ہے۔

سعید ان کا داماد بنے! یہ کس قدر ناممکن بات تھی۔

(۲)

سید صاحب باہر سے رقیہ کا ہاتھ پکڑے اندر آئے اور اسے زاہدہ بیگم کی گود میں دیتے ہوئے بولے:

"سُنتی ہو اپنی لاڈلی کی باتیں، کہتی ہے میں بھی جاترا دیکھنے چلوں گی۔"
زاہدہ بیگم روتی ہوئی رقیہ کو گلے لگا کر بولیں۔ "اے واہ کون بڑی عجوبہ بات کہہ دی میری بٹیا نے۔ بھلا جاترا دیکھنے بچے نہ جائیں تو اور کون جائے۔ آپ بھی عجیب بات کرتے ہیں۔"

ماں کو اپنا طرف دار پاکر رقیہ نے بھیں بھیں کرکے رونا شروع کردیا۔

"ارے بھائی میں اس کو کہاں لادے لادے گھوموں گا۔ ایسا ہی ہے تو کسی نوکر کے ساتھ چلی جائے۔"

"لادے لادے گھومیں بھی تو آپ کا کیا بگڑ جائے گا۔ اِتّی سی تو جان ہے۔"
زاہدہ بیگم لاڈ سے بولیں۔

"تھک نہ جاؤں گا" میاں ہنس کر بولے۔
"بیل کدّو کے بوجھ سے ٹوٹتی نہیں ہے" بی بی نے پیار بھرا الاہنا دیا۔
اور میاں کو اور زور سے ہنسی آگئی۔

چھم چھم کرتی گڑیا کا ہاتھ تھامے وہ جاترا کو چل پڑے۔ سیدوں کی بیٹیاں بھلا یوں چار کھونٹ کا ہے گھومتی پھریں۔ رقیہ کا یہ چھٹا ساتواں سال جا رہا تھا۔ مگر کبھی تیرے میرے کے ساتھ یوں بازاروں کی خاک نہ چھانی۔ آج تو باپ کو دیکھ کر مچل گئی۔ اور باپ بھی یوں لے آئے کہ جاترا کوئی روز روز تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ حیرت سے اِسے دیکھتی اُسے دیکھتی۔ پیروں پیروں چلی جا رہی تھی۔ کوئی غبارہ یا کھلونا دیکھ کر مچل بھی پڑتی۔ یکایکی ایک کھلونے کی دکان پر وہ ٹھٹھک گئی۔ طرح طرح کے خوبصورت گڈے گڑیاں قطار در قطار سجے ہوئے تھے۔
ننھا سا دِل للچا ہی تو پڑا وہیں۔ اُنگلی اٹھا کر بولی:
"اباجی اباجی، مجھے گڈا چاہیے، میں گڈا لوں گی" باپ دکان کے قریب لے گئے اور پوچھا "یہ گڈا چاہیئے؟"
رقیہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔
سید صاحب کی انگلی ہر گڈے گڑیا پر سے پھسلتی گئی۔ مگر بٹیا رانی کے منہ سے ہاں نہ نکلی۔
"اب کونسا گڈا باقی رہ گیا ہے ری" وہ جھلا کر بولے۔
بٹیا نے معصومیت سے انگلی سے اشارہ کیا: "وہ جو لال ٹوپی پہنے بیٹھا ہے"
باپ نے حیرت سے ٹوپی کو دیکھا، دیدے پھاڑ کر بولے "کیا؟"
سیدوں کی بیٹی، گھر کی چار دیواری میں پلی بڑھی، اسے دنیا داری سے کیا سروکار۔

نواز خاں پانی پینے اندر اٹھ کر گئے تھے ۔ دکان کی رکھوالی کو اپنے آٹھ نو سالہ بیٹے حبیب خاں کو باہر بٹھا گئے تھے جو اپنی سج دھج اور سنجیدگی سے خود بھی گڈا ہی لگ رہا تھا۔ اتنے میں اندر سے نواز خاں آئے تو سید صاحب کو بے بھاؤ قہقہے لگاتے دیکھا۔ سید صاحب انھیں دیکھتے ہی بولے۔

"اجی سُنتے ہو خاں صاحب، بٹیا نے تو کمال کر دیا۔ ارے اپنے حبیب کو گُڈا سمجھ کر بولتی ہے اسے لوں گی"

خاں صاحب ایک لمحے کو تو سن سے رہ گئے ۔ پھر خود بھی زور زور سے ہنسنے لگے ۔ حبیب، جواب تک سچ مچ گڈا بنا بیٹھا تھا ۔ یوں کھل کھلا کر قہقہے سُن کر جیسے جاگ پڑا ۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک ننھی سی چینی کی مورت سامنے کھڑی ہاتھ چلا چلا کر ضد کر رہی تھی ۔

"ناں جی میں تو اسی کو لوں گی"

حبیب بن داموں بک گیا ۔

رات کو سید صاحب گھر لوٹے تو ہنس ہنس کر بی بی سے سُنایا کہ رقیہ نے کیسے نواز خاں کے بیٹے کو گڈا سمجھ کر اُسے خرید لینا چاہا ۔ ماں نے ہاتھ کھینچ کر بیٹی کو گلے لگا لیا اور پیشانی چومتے ہوئے بولی ۔

"چھی، میں تو اپنی رانی گڑیا کے لئے شہزادہ چُن کر لاؤں گی ۔ وہ تو نکمّا کھلونے والوں کا بیٹا ہے"

عورت کی محبت، تو جھونپڑی کا دیا ہوتی ہے جو ایک ہی جگہ جلتے جلتے سدا کے لئے خاموش ہو جاتا ہے، ہرجائی چاند کی طرح جگہ جگہ اپنی روشنی نہیں پھیلاتا ۔ رقیہ کے ننھے دل میں پیار کا دیپ ایسے جلا کہ پھر کوئی اس کی

آنکھوں کی جوت نہ بن سکا۔ بچپن کو پھلانگ کر جوانی کی حدوں میں آئی۔ جگہ جگہ سے رشتے نکلتے آئے مگر وہ گونگا گڈا، جس نے بھرے بازار میں دل لوٹ لیا تھا، آج بھی دل کا سوداگر بنا ہوا تھا۔ ایک دن بھی تو ایسا نہ گذرا جب اس کی یاد دل کو مسوس نہ گئی ہو۔ محبّت کی اس تلوار کو دودھاری صرف ایک ملاقات نے بنا دیا۔ گاؤں میں میلاد تھا۔ سید صاحب کی گھوڑے گاڑی کا شہرہ گئی ہوئی تھی۔ گاؤں کے بڑے آدمی تھے، سرا ونچا کرکے چلنے والے۔ کسی کے سامنے اپنی بانی کیسے جھکنے دیتے۔ میلاد کی دعوت گھر والیوں کو آئی تو بجائے اس کے کہ دو گھڑی کے لئے کسی کی گاڑی یا چھکڑا منگوا لیتے، پیدل ہی پیدل بھجوانا طے کر لیا۔

جوانی اور بڑھاپا کبھی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اور پھر اندھیرے کا ساتھ۔ مغرب کے بعد جب گاؤں کے ایک موڑ پر ماں پیچھے رہ گئی اور بیٹی آگے نکل گئی تو نیم کے جھاڑ پر سے دھم سے کوئی سایہ کودا، اور رقیہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔

یوں، جیسے جنم جنم کا ساتھ اور پہچان تھی۔ بغیر کسی تعارف اور تمہید کے وہ بولتا گیا۔

" رقیہ! برسوں سے صرف ایک بات، صرف ایک ہی بات سُنانے کے لئے ترس رہا ہوں کہ جس گڈے کو تم پیسے دے کر خریدنا چاہتی تھیں وہ بنا پیسوں کے ہی ہمیشہ کے لئے تمھارے ہاتھ بک گیا ہے۔ اس کھلونے کو کبھی توڑ نہ دینا۔ یہ بات اس لئے سُنا رہا ہوں کہ ...." پھندا سا اس کے گلے میں آن پڑا، بڑی مشکل سے وہ جملہ پورا کر سکا۔

" یہ بات اس لئے جتا رہا ہوں کہ بعض کھلونے بڑے نازک ہوتے ہیں۔"

ملگجے آجالے میں وہ رقیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا" بھول نہ جانا۔ پھر ملیں گے۔ آں ؟ اچھا ؟" اور وہ اس کے سر پر جُھکا، چم چم بالوں کا ایک اچٹتا ہوا سا بوسہ لیا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔

مگر وہ پھر کبھی نہ مل سکے!

حبیب خاں بھول گیا تھا کہ وہ معمولی سے کاشتکار کا بیٹا تھا۔ جو کاشتکار بھی تھا، جاتراؤں میں کھلونوں کی دکان لگانے والے باپ کا بیٹا بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر پٹھان تھا۔ جب کہ منظور میاں سید صاحب تھے جن کا خاندان اونچا تھا، ناک اونچی تھی، حویلی بھی اونچی تھی، وہ ان کے سامنے کتنا حقیر اور نیچا تھا۔

حبیب نے بڑی شرمساری سے ماں سے کہا اور پھر ماں نے باپ سے سُنایا کہ حبیب کی شادی اگر رقیہ سے نہ ہوئی تو وہ مر جائے گا۔

نواز خاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کس نے لگایا ہے؟ اور لگائے بھی کیسے! بیٹے کی ضد سے مجبور تھے۔ انجام جانتے بوجھتے بھی پیغام سید صاحب کے گھر بھجوا دیا۔

قیامت سے پہلے ہی قیامت آگئی۔

سید صاحب کا تبہاد یکھنے کے قابل تھا" کیا سمجھ کر نواز نے یہ ہمت کی؟" غصے کے مارے پھٹے جا رہے تھے۔

" بیری ہوگی تو گھر میں پتھر تو آئیں گے ہی۔" بڑے بوڑھوں نے غصہ ٹھنڈا کرنے کو گھسی پٹی باتیں دہرانی شروع کیں۔ مگر سید صاحب کے جلال کا کیا پوچھنا۔ نواز خاں کو ان کی اصلیت جتانے کی خاطر للو دھیڑ سے لکھوایا کہ " اپنا منہ دھو رکھیں۔ ہونہہ! اپنی اوقات ہی بھول بیٹھے۔" اور اسی غصے میں یہ بھی لکھوا دیا کہ

"اب سے حویلی پر پھٹکیں بھی نہیں، نہ اپنا منحوس چہرہ مجھے دکھائیں۔"
پیا موں کی رقیہ کو کون تھی۔ غصّے غصّے میں ہی شادی طے ہو گئی۔ سید نے سیدوں میں ہی بیٹی اٹھا دی۔ رقیہ کے دل کا چاند کسی اور کے بام و در پر چمکنے لگا۔ مگر وہ جو ایک دیپ تھا اور جو اپنے حبیب کے نام سے جلتا تھا، جلتا ہی رہا۔ جلتا ہی رہا۔ پھر اس دیپ سے ایک دیپ اور روشن ہوا۔ اور دیپ کے جلتے ہی وہ دیپ سدا کے لئے بجھ گیا۔

رقیہ کے دولھا عزیز میاں تھے، بڑے تیہے کے آدمی۔ جب اُڑتی اُڑتی سی خبر انھوں نے سُنی تھی کہ رقیہ بی کا کچھ ساز باز حبیب سے تھا تبھی سے ان کے دل میں گرہ پڑ گئی تھی۔ اور پھر انھوں نے رقیہ کو جلانے، طعنے لینے دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ جب شاہدہ پیدا ہوئی تو ماں کے بعد اسے کوئی دیکھنے والا بھی نہ رہا تو نانا نانی اپنے ہاں اٹھا لائے۔ عزیز میاں کو سسرالیوں اور سسرال سے دلبستگی نہ ہوئی۔ اُسی ماں کی اولاد تھی شاہدہ۔ ساس سسرے لینے کو آئے تو بیٹی حوالے کر دی۔

رقیہ کی تو ساری منزلیں طے ہو گئی تھیں۔ مگر نواز خاں کا گھر بھی قبرستان ہی کا روپ بن گیا۔ حبیب خاں جوان جہاں آدمی، ایسا کڑیل کہ شیر سے پنجہ ملائے یسو کھ کر کانٹا رہ گیا۔ حکیم نے جان کا خطرہ تو بتایا ہی، اگر غم کا مداوا نہ ملا تو دق ہو جانے کا خطرہ بتایا۔ نواز خاں غریب آدمی تھے، بس دال روٹی سے خوش تھے۔ بیٹے کی بپتا دیکھی نہ جاتی۔ ساری جمع پونجی علاج، دوا درمن پر خرچ ہو گئی۔ بھرا پُرا گھر سید صاحب کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ کہتے تو کیا؟ کرتے تو کیا؟ مگر دل میں سید صاحب کے گھرانے سے ایسی نفرت بیٹھی کہ کُتّے کو

روٹی ڈالنے کے روادار تھے۔ مگر ان کی شکل زہر لگتی۔

مگر ماں کے آنسوؤں اور باپ کی خوشامدوں نے جبیب کا دل پگھلا دیا۔ اور گھر میں بہو آگئی تھی۔ زندگی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ جبیب کے دل کا زخم مندمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ مگر پوتے کی پیدائش نے دادی دادا کے سارے غم بھلا دیئے اور اب سارے گھر کی خوشی کا مرکز ننھا سعید تھا۔

(۳)

جانے کھڑکی سے سر نکالے زاہدہ بیگم کب تک کھڑی ہی رہتیں کہ ایک دم ایک آواز تیر کی طرح ان کے کلیجے کے پار ہوگئی۔

" ارے اب کاہے کا عقد! اور کاہے کا جلوہ۔ سنا ہے لڑکی میں کوئی عیب ہے۔ چلو گھر چلیں۔ یونہی دیر ہوگئی "

ان کے پیر جواب دینے لگے اور دھڑ سے پلنگ پر آگریں۔ سید صاحب تصویرِ غم بنے بیٹھے تھے۔ آنگن کا شور اب دگنا ہوگیا تھا۔ بچے والیاں اپنے اپنے بچوں اور سامان کو سمیٹنے میں مشغول ہوگئی تھیں۔

پیسہ خدا ہے۔ سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر آج پیسہ ہوتا تو ممکن تھا کہ سعید کے دادا اور باپ کا منہ بھر دیا جاتا اور یوں ان کی نواسی کے نصیب کھل جاتے۔ مگر ادھر زمینداری کے خاتمے نے کمر کا بل ہی نکال دیا تھا۔ زاہدہ بیگم کے دماغ میں خیالات یوں آ آ کر گر رہے تھے جیسے جلتی شمع پر برساتی پتنگے۔

وہ دیوانوں کی طرح ہاتھ مل مل کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں، باہر باجوں کا شور ختم ہوگیا تھا۔ اور اس شور کی جگہ ہنگامہ پرور آوازوں نے لے لی تھی۔

لگتا تھا باہر جا تترا ابھری ہے ۔ بازو کے کمرے میں جہاں سنڈد سرخ کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی ۔ اب کوئی نہ تھا ۔ اور خالی کونوں اور دیواروں سے شدو کی سسکیاں ٹکرا ٹکرا کر ایک ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں ۔

"ہائے خدا ! میں کیا کروں ؟ اب کیا ہوگا ؟"

ان کے آنسو رکتے نہ تھے ۔ اور سید صاحب تو پتھر بنے بیٹھے تھے ۔

" آپ نے تو نواز خاں کو پرانی دشمنی کے ناطے شادی کی دعوت تک بھی نہ دی ہوگی ۔ ورنہ اگر وہ ہوتے تو میں جا کر ان کے پاؤں پکڑ لیتی کہ ....."

سیّد صاحب تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔ ان کی بجھی بجھی نگاہیں اب ایک دم چنگاریوں کی مانند کود سے اٹھی تھیں ۔ انھوں نے اپنی بیوی کو دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر پلنگ پر بیٹھ گئے ۔ اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا ۔ ایک دم صحن میں گونجتا ہوا شور ختم گیا ۔ باہر سے شہنائی کی تانیں سنائی دینے لگیں اور عورتوں میں شور مچ گیا ۔

" دلہا آگیا ۔ دلہا آگیا ۔"

سیّد صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور زاہدہ بیگم آنگن کو لپک پڑیں ۔

چلمن میں سے انھوں نے دیکھا : بوڑھے نواز خاں سعید کا ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے شہ نشین کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہے ہیں ۔

" برات واپس نہیں ہوگی ۔"

ایک بڑے میاں نے ان کا راستہ روک کر کچھ پوچھا ۔ نواز خاں کراری آواز سے بولے :

" سعید کھیتوں سے واپس آیا تو بتانے لگا کہ شہنائیاں خاموش ہیں ۔

اور براتی بکھرے ہوئے ہیں" ایک دم اُن کا لہجہ بدل گیا۔ "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بجتی ہوئی شہنائیاں یوں خاموش ہو جائیں۔ شریفوں کے دروازوں پر ایک دفعہ شہنائی بجنے لگے تو پھر سسرال کی راہ تک بجتی ہی جاتی ہے سمد صیا نے دلھن نے یہ کیوں سمجھ لیا تھا کہ ان کے اٹھ جانے سے محفل بھی اٹھ جائے گی۔"

زاہدہ بیگم نے اور کچھ نہ سُنا، ان کے پیر جواب دینے لگے۔ وہ زمین پر گرتی ہی تھیں کہ ایک دم انھیں کسی نے سنبھال لیا۔ انھوں نے بند بند آنکھوں سے دیکھا، وہ سید صاحب تھے جن کی کلف دار پگڑی کا طرہ ڈھیلا ہو کر ان کے پیروں میں جھول رہا تھا!



چکور

آنگن میں تخت بچھا ہوا تھا، جس پر اماں بیٹھی تھیں اور سامنے ہی برآمدے میں الطاف گھوڑا بنا ہوا تھا۔ منا اس کی پیٹھ پر سوار.... چھڑی لہرا لہرا کر کہہ رہا تھا۔

چل میرے گھوڑے ٹھک ٹھوں
چل میرے گھوڑے ٹھک ٹھوں

الطاف گویا ڈر کے مارے جلدی جلدی بھاگنا شروع کر دیتا اور منا ہنسی سے بے حال ہو جاتا۔

دلہن کو جب لاؤں گا
پیٹھ پہ تیری بٹھاؤں گا

الطاف چلتے چلتے رک گیا۔ اور منے کو پیٹھ سے اتار کر بولا۔

"ہاں رے ابھی سے دلہن کی فکر؟"

چھڑی ہوا ہی میں لہرا کر رہ گئی تھی۔ منا آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "آئیں چلے گا یا مار کھائے گا؟"

الطاف آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "بس یار، ہم اب تو تھک گئے۔"

مگر تھک جانے پر بھی اُس نے منّے کو گود میں اٹھالیا اور چپک پھیریاں دینے لگا۔
اماں سے یہ سب بمشکل دیکھا گیا۔ روہانسی سی ہو کر بولیں "لاکھ دفعہ کہا بیٹا الطاف گھر بسا لو۔ محلے ٹولوں کے بچوں سے دل بہلاتے پھرتے ہو۔ اگر شادی کر لو تو اللہ خود ہی آنگن تہ بھر دے؟ مگر تم سنتے کہاں ہو؟"
الطاف، سمجھ گیا اماں پر آج پھر نصیحت کا موڈ سوار ہے، منّے کو گود سے اتار کر بولا۔ "جاؤ یار تمھاری امی انتظار کر تی ہوں گی۔"
منّا چھچی گھماتا، ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ اور الطاف وہیں مونڈھے پر ٹِک گیا۔
برسات کی شام تھی۔ گھنے گھنے اودے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوائیں بھیگی بھیگی تھیں۔ اور فضا سرمئی سرمئی سے اندھیرے میں لپٹی لپٹائی۔ اس اندھیرے سے ایک چاند جیسی من موہنی صورت ابھری اور الطاف کے ذہن پر چھا گئی۔ گلابی گلابی گال۔ کالی کالی آنکھیں۔ لمبے لمبے بال، اور وہ مور جیسی متوالی چال! "بھابی" وہ زیر لب مسکرایا۔
"نہیں اماں۔" وہ جیسے چونک کر بولا "میں ابھی سے شادی کے بندھن میں نہیں جکڑوں گا۔ آپ نہیں جانتیں چھابی کتنی پیاری، کتنی گڑیا سی لڑکی ہے اتنی نازوں کی پالی۔ میں ابھی کم از کم دو سال شادی نہیں کروں گا۔ میری تنخواہ بڑھ جائے۔ بس اک دم چٹکی بجاتے ہیں۔ دھبڑ، دھبڑ، دھبڑ۔ دھاں، دھاں، دھاں۔" اور وہ گول گول گھوم کر منہ سے باجا سا بجانے لگا۔
"اور اماں آپ جانتی ہیں میں صابرہ کو کوئی تکلیف نہیں دینا چاہوں گا۔ بھلا اتنی کم تنخواہ میں کیا ہوگا؟ اور پھر آپ کہتی ہیں نا کہ ایک سر کے دو سر ہوئے تو پھر تیسرا سر آتے دیر نہیں لگتی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کے

ذہن میں جوت سی جاگی۔ ننّھا سا سر، دو ننّھے ننّھے ہاتھ۔ چھوٹے چھوٹے پیر، کنہیا جیسا منہ۔ اس نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ کر زور سے دبائے۔

"او اماں یہ تو ہے کہ کھانے والا اپنا رزق ساتھ ہی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی۔"

اماں کے منہ پر آئی ہوئی ہنسی سنجیدگی سے بدل گئی۔" تین سال سے رو رہی ہوں بیٹا گھر سجالے۔ بیٹا گھر بسالے مگر بیٹیا سُنے تب نا؟

ہم مر جائیں تب رچائیو اپنی شادی۔ ہماری قسمت میں ہی پوتے کھلانا نہیں تو ہم بھی کیا کریں۔ دوسروں کی گودیں بھری پُری دیکھ دیکھ کر کلیجا الٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔ بیٹیاں ہیں وہ اپنے گھروں کی۔ نواسا نواسی چار دن کو آئے بھی تو پھر بھی اپنے گھر ہی کے ہوئے۔ ہم تو بیٹا یونہی ترستے بلکتے جئے، یونہی ترستے بلکتے مر جائیں گے۔ ہاں۔"

مُنّا پھر سامنے سے ٹھُمکی کھاتا، ایک ہاتھ سے اپنی چھوٹی بہن کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ وہیں سے چلّا کر بولا۔" الطاف ماموں، الطاف ماموں دیکھئے نامنّی نے نیا فراک پہنا ہے تو آپ کو دکھانے آئی ہے۔"

اماں کا جی جل گیا۔ تیزی سے بولیں۔" کیوں ناحق اودھم مچاتے ہو رے کمبختو۔ اپنے ماں باپ کو دکھاؤ نا جا کر۔"

مُنّے نے سہم کر اماں کو دیکھا اور اُلٹے پیروں بھاگ گیا۔

اماں کو الطاف کی تنخواہ کے بڑھنے گھٹنے سے سروکار نہ تھا۔ پان کے چار چھ پتّے اور تینوں وقت کی روٹی انھیں بس تھی۔ اور یوں بھی گھر میں کھانے والے ہی

کتنے تھے۔ اور الطاف کی تنخواہ تو اچھی خاصی ڈھائی سو سے اوپر ہی تھی مگر اسے تو بس ایک ہی دُھن تھی کہ اتنی آمدنی میں صابرہ جیسی لڑکی کا گزر نہیں ہو سکے گا۔

اماں آپ کو معلوم بھی ہے چھابی کے ڈیڈی کے ہاں ریفریجریٹر ہے۔ اگر اپنے ہاں نہ ہوا تو بھلا چھابی کیا سوچے گی۔"

"کیا سوچے گی؟" اماں تنک کر بولتیں۔ "ہم کوئی رئیس زادے تو ہیں نہیں۔ پھر دی کیوں بیٹی۔"

پھر اک دم الطاف کو خیال آجاتا کہ کتنے دنوں سے اس نے یہ محبت اپنے دل میں پال رکھی ہے۔ اگر چھابی اڑ کے نہ بیٹھ جاتی تو بھلا اس کے ڈیڈی اس جیسے لڑکے کو اپنی بیٹی دے دیتے؟ بھلا کیا چھابی کو ایک سے ایک، اچھے سے اچھے پیغاموں کی کمی تھی؟

" اور اماں چھابی جس کمرے میں رہے گی وہاں چھت پر بجلی کا پنکھا ہوگا ہی۔ اور ہاں اماں اب میں فون بھی لگوا لوں گا۔ بس دفتر سے خالی وقت میں بیٹھ کر اپنی چھابی کو فون ٹھونکتا رہوں گا۔ اِدھر گھنٹی بجے گی اور وہ دوڑ کر ریسیور منہ سے لگائے گی اور بڑی پیاری آواز سے کہے گی۔"

"یس ڈارلنگ"

اماں کو غصّہ تو بڑا آتا مگر خاموش رہ جاتیں۔" اب یہ بھی کوئی بات ہوئی کیا لوگ بیویاں لانے سے پہلے یوں ہی گھر کو نمائش گاہ بنا دیتے ہیں۔ ایسا ہو تو دنیا میں شادیاں ہی نہ ہوں۔ ایسے ہی تو دماغ ساتویں آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔ کوئی طریقہ ہوا مُوا یہ بھی۔ ہم نے تو ایسی باتیں بال سفید ہو گئے، اگر دیکھیں نہ سُنیں۔"

اماں غصے ہو جاتیں تو انھیں منانے کا ایک ہی طریقہ الطاف کو یاد تھا۔ پیچھے سے آکر گلے میں بانہیں ڈال کر پھر گود میں لیٹ جاتا اور پھر اماں بھی اسے لپٹا لیتیں۔

شام کو الطاف دفتر سے لوٹا تو موٹر سائیکل کھڑی کر کے چپکے سے اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اماں دو دن سے شدید قسم کے غصے میں تھیں۔ منے اور ننھی نے ان کا دل جلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوتا کیا ہے؟ وہی روز روز کے قصے الطاف اتوار ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔ دونوں آئے اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اس کے کمرے کی چیزوں کو یوں الٹ پلٹ کیا۔ گویا پولیس والے خانہ تلاشی لے کر گئے ہوں۔ چاکلیٹ چھین جھپٹ کر کھائے، اور پھر آنکھ مچولی کا دور ختم ہوا تو الطاف نے منے کو گھٹنوں پر بٹھا لیا اور جھلا جھلا کر کہنے لگا۔

بی، اے۔ ایم، اے پاس کرے گا
جج بن کر اجلاس کرے گا

بس اماں کو بہت ہی او بدا کر غصہ آگیا۔ جھنجھلا کر بولیں "منا تیرا کون لگتا ہے رے کہ اسے جج بنائے گا؟"

الطاف ہنسنے لگا "اری اماں آخر کو بچہ ہے۔ اس کے ذہن میں کم از کم بیٹھ تو جائے کہ جج بننا اچھی بات ہے"

اماں منہ سے تو کچھ نہ بولیں بس مٹو نہٹو بن کر بیٹھ رہیں۔ الطاف نے گود میں سر رکھ دیا تب بھی نہ بولیں۔ پھر اس نے منہ اٹھا کر پوچھا۔

"اماں ابھی تک بھی غصہ نہیں اترا؟"

"تجھے ہماری کیا فکر! تیرا کلیجہ تو محلے بورے کے بچوں سے ٹھنڈا ہے!"

الطاف کا منہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اچھل کر اٹھ بیٹھا "اچھا یہ بات!

لو اسی شرط پر شادی !"

اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "سچ ؟"۔

" اماں "۔ الطاف بوڑھی باہوں کے گھیرے میں سمٹ گیا۔" میری تنخواہ چار سو ہوگئی ہے اماں۔ اور سُنئے، اب مجھے حکومت کی طرف سے ایک بنگلہ بھی ملے گا۔"

اماں نے خوشی خوشی، چٹ چٹ الطاف کی بلائیں توڑیں اور الطاف کی آنکھوں میں چاند کی چاندنیاں بکھر گئیں۔ چاند میں سے ننھا سا چاند اُبھر رہا تھا۔ گول مٹول، پیارا پیارا جس نے اپنی کومل باہیں الطاف کی طرف پھیلا رکھی تھیں۔ الطاف کے منہ سے نکل پڑا۔

بی، اے۔ ایم، اے پاس کرے گا
جج بن کے اجلاس کرے گا

چھابی بڑی خوب صورت تھی۔ بہت ہی پیاری، کلی جیسی نازک۔ چاند جیسی موہنی، دلہن بنی تو چار چاند لگ گئے۔ شرماتی لجاتی۔ سُرخ سرخ سی ریشمی گٹھری الطاف نے گھونگھٹ ہٹا کر منہ دیکھا اور ہنس کر اپنی آنکھیں میچ لیں۔

"اپنی بینائی کون خراب کرے ؟"

چھابی مسکرائی اور شرم سے دوہری ہوگئی۔

الطاف کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ گھر کی حالت ہی بدل گئی۔ مُنا اور گڑیا اب بھی آتے مگر چھابی کی موجودگی میں الطاف ان سے بات کرنے کی بھی فرصت نہ پاتا۔ کھیلنا تو دور ہی رہا۔ اماں کے بوڑھے چہرے پر لالی سی کھل اٹھی ۔

بہو بیٹے کو خوش دیکھ کر اُن کا اپنا خون بڑھتا۔ الطاف کا کمرہ جو بیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ گھنٹے تو بند ہی رہتا۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں اور کھُسر پھُسر اور جب چھابی باہر نکلتی تو ایسی گلابی گلابی لہکتی لہکتی نکلتی جیسے شاخ پر کھلے تازہ پھول سے ہوا نے خوب سرکشی کی ہو۔ انہی دنوں کی تو اماں کی آنکھیں متلاشی تھیں۔

اماں نے بیٹیوں بھانجیوں کی مدد لے کر چڑھادے کے سارے جوڑے خود ہی تیار کیے تھے۔ چھوٹے بڑے آڑے ٹیڑھے ٹکڑے، رنگین کترنیں، سیون میں سے بچتیں تو اماں اپنے گھٹنے کے نیچے جمع کرتی جاتیں۔ ایک دن نھی نے ایک لال رنگ کا چھوٹا سا ریشمی ٹکڑا مانگا تو اماں نے ڈپٹ دیا تھا۔ "نہیں دوں گی۔"

"دے بھی دیجیے اماں۔ اب بھلا اس ٹکڑے میں کیا رکھا ہے؟" الطاف حیرانی سے بولا۔

بس نہیں دیتی میں پھیر، تو کیا کرے گا پوچھ کر؟" اور سب بہنوں اور اماں کے چہرے ہنسی سے کھِل گئے مگر الطاف کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

اب شادی کے دو تین مہینوں بعد الطاف نے دیکھا کہ اماں وہی سارے نیلے پیلے ٹکڑے سمیٹے بیٹھی ہیں۔ اور ننھے مُنے کرتے، ٹوپیاں اور جھبلے سی رہی ہیں۔ الطاف کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہوں تو یہ بات تھی؟"

وہ جلدی سے کمرے میں گھس پڑا اور چھابی کو گدگدا کر بولا "چھابی کچھ دیکھا؟"

"کیا" چھابی حیران ہو کر بولی۔ "نہیں تو میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا؟"

الطاف کے چہرے سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ کھلکھلا کر بولا۔ "امی چھوٹے چھوٹے کپڑے سی رہی ہیں۔"

"کیوں؟" چھابی سچ مچ معصومیت سے بولی ۔

"پگلی ۔" وہ اس کے گال کو انگلی سے چھو کر بولا ۔ "ننھے مہمان کے لئے ۔ اور کیوں؟" چھابی کا منہ تپ گیا ۔ ہونٹوں کے کنارے کانپ اٹھے ۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔" وہ جھینپ کر بولی ۔

الطاف اس کے سامنے پلنگ پر اوندھا لیٹ گیا ۔ "چھابی مجھے بچے بڑے پیارے لگتے ہیں جب اپنی شادی نہیں ہوئی تھی نا ۔ تو میں روزانہ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا ۔ ان کا اودھم مچانا ۔ ان کا ضد کرنا ۔ ان کا توتلی باتیں کرنا ان کا ہنسنا ، ان کا رونا مجھے یہ سب کچھ ، سب کچھ بڑا اچھا لگتا ہے ۔ اچھا لگتا ہے نا؟"

وہ چھابی کی آنکھوں میں جھانک کر بولا ۔ "اور ایک بات بتاؤں ۔ ایک دن میں شاپنگ کے لئے گیا تھا ۔ تو میں ایک ننھا منا بش شرٹ خرید کر لے آیا ہوا یوں کہ میں گیا تو تھا خود کے لئے کپڑا خریدنے ۔ مگر وہ بش شرٹ مجھے کچھ اتنا پیارا لگا کہ بس دل چاہا کہ لے ہی لوں ۔ سوچا منے کو پہنا دوں گا ۔ مگر جب گھر پہنچا تو نیت بدل گئی ۔ سوچا اپنے ہی منے کے لئے کیوں نہ رکھ لوں ؟ پھر مجھے اپنی چھابی کی موہنی شکل یاد آگئی اور پھر میں نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی ۔ یہ اونچا قد یہ گھونگھر والے بال ، یہ کھڑی ناک ، سانولا رنگ اور اپنی چھابی تو پھر ہے ہی چاند کی چاندنی ۔ بس اس حسین جوڑے کی پیداوار کے کیا کہنے ۔ بڑا پیارا ہوگا نا اپنا بیٹا ؟"

چھابی ہنسی سے دوہری ہوئی جارہی تھی ۔

"ہائے اللہ آپ بھی کیا کیا سوچتے ہیں ۔"

الطاف اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ "اچھا یہ بات! تو کیا تم نہیں سوچتی ہوگی؟"۔
چھابی جھینپ کر بولی۔ "توبہ ہے"۔
الطاف لپک کر اٹھا اور اپنے سوٹ کیس میں سے ایک چھوٹا سا گلابی نیلے پیلے پھولوں کا بشش شرٹ نکال لایا۔
"دیکھنا چھابی میں نے اسے اتنا چھپا کے رکھا ہے، میں ڈرتا تھا امی یہ نہ کہہ دیں کہ کیسا بے شرم ہے۔ دیکھو تو ابھی سے اپنی اولاد کے لئے جمع جتھا کر رہا ہے"۔
چھابی نے بہت ہی شرما کر جھکی جھکی آنکھوں سے بشش شرٹ کو دیکھا۔ نیلے پیلے، گلابی گلابی، لال لال پھول ہی پھول۔
چھابی کے اپنے جیون میں بھی پھول ہی پھول کھل اُٹھے۔

شادی کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور یہ چھ ماہ ایسے پر لگا کر اڑے کہ کبھی بات کا ہوش نہ رہا۔ ہنستے کھیلتے گاتے مسکراتے۔ چھابی تھی اور الطاف۔ اور بس ان کی رنگین مزے دار اور کبھی ختم نہ ہونے والی میٹھی میٹھی باتیں۔
ایک دن منّا اور ننھی آئے ہوئے تھے۔ الطاف ان کے پاس بیٹھا "چیاؤں میاؤں بلّی کھاؤں" کھیل رہا تھا۔ مگر بار بار دور بیٹھی چھابی کی طرف دیکھتا جاتا۔ منّا روہانسا ہو کر شکایتاً بولا۔
"جب سے ماموں کی شادی ہوئی ہے ہمارے ساتھ کھیلنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب بھی ان کا سارا دھیان ممانی کی طرف ہی لگا ہوا ہے"۔
اس بیباک حقیقت گوئی پر الطاف کچھ سٹپٹا سا گیا۔ چھابی پلو میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ پھر منّے سے بولی:۔

"بالکل ٹھیک بات ہے مُنّے۔ اب ان کا بائیکاٹ کردو"

"اچھا منّے" الطاف اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا۔"ہم تو تمھارے ساتھ اب کھیل نہیں سکتے کیونکہ ہمیں ایک گڑیا مل گئی ہے۔ ہاں اس بات کا ہم وعدہ کرتے ہیں جلد ہی تمہارے دل بہلانے کو ایک ایک گڑیا تمھیں بھی دیں گے ؟"

مُنّا کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا۔ مگر چھابی سمجھ گئی۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر بولی۔"ہائے اللہ کیسے بے شرم ہیں۔ بچوں سے ایسی بات کرتے لاج نہیں آتی"

اماں کے پوپلے منہ میں ہنسی سماتی نہ تھی۔ چھابی نے دو دن سے کھانا کھایا تھا نہ چائے پی تھی۔ بس اوندھی لیٹی ابکائیوں پر ابکائیاں لئے جاتی تھی۔ الطاف دفتر جانے کے لئے تیار ہونے لگا تو اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا۔

"آج تو دل چاہتا ہے آفس ہی نہ جاؤں"

"کیوں بھلا؟" چھابی ہنس کر بولی۔

"بس یونہی، اور کیا!"

"پھر بھی" چھابی ناز سے مسکرا کر بولی۔"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"

الطاف ہنس پڑا۔

"ہے نا؟!" چھابی بھی ہنسنے لگی۔ الطاف ٹائی کی گرہ تنگ کرتے ہوئے بولا۔

"چھابی یہ ہے تو بڑی خوبصورت سی بات۔ مگر دیکھنا میری جان، میں یہ نہیں چاہوں گا کہ میری ننھی منی سی گڑیا کو کوئی تکلیف پہنچے۔ ارے ابھی تو عمر پڑی ہے رانی۔"

"کیا مطلب؟" چھابی کچھ سمجھ نہ سکی۔

"مطلب؟ ارے بھئی یہی مطلب کہ ابھی سے اتنی جلدی کیا ہے بچے کی؟

یہ ملائم گال، یہ دبیز باہیں، یہ سجیلا بدن، یہ حسن تباہ نہ ہو جائے گا۔ جب ڈالی میں پھل آنے شروع ہو جائیں گے تو؟"

چھالی تیزی سے بولی۔ "تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کی وجہ سے کوئی عورت یہ چاہے گی کہ وہاں نہ بنے؟"

الطاف قہقہہ لگا کر بولا۔ "اور تو جو اس دن کہتی تھی کہ آپ بڑے بے صبر ہیں۔ اب بتانا ذرا؟"

چھالی کے کان شرم سے لال پڑ گئے۔ "ہائے اللہ آپ تو بس زبان پکڑ لیتے ہیں!"

چھالی کو صفرے کی پرانی شکایت تھی۔ دو تین دنوں میں طبیعت پھر پہلے جیسی ہو گئی۔ مگر اس مختصر سی بیماری میں اس پر یہ بات خوب کھل گئی کہ ان دونوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی کچھ بڑھ کر ہی اماں کو بھی بچے کی آرزو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے چہرے سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔

شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ چھالی دوبارہ میکے گئی تو زاہدہ بھی آئی ہوئی تھی۔ زاہدہ کی شادی چھالی کی شادی کے دو ماہ بعد ہوئی تھی اور اب وہ زچگی کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔ ایک رات ابھی سب سوئے ہی تھے کہ زاہدہ نے پاس سوئی ہوئی چھالی کو جگا دیا۔

"آپی۔ آپی سنیے تو۔"

چھالی نے ہاں ہوں کی اور کروٹ لے کر پھر سو گئی۔ اب کے زاہدہ نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ کہا۔

"ہائے آپی سنتی ہی نہیں۔"

چھابی گھبرا کر اٹھ بیٹھی "کیوں کیا ہوا زاہدہ؟"

"پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے آپی۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی پیٹ کو کاٹے ڈال رہا ہے۔"

چھابی نے گھبرا کر کہا۔ "نواب کیا ہوگا؟"

زاہدہ مطمئن آواز میں بولی۔ "امّی کو جگا دیجئے نا۔ وہی سب کچھ کرلیں گی"

رات دن بن گئی اور پورے گھر میں بلوہ مچ گئی۔ ماما نے جلدی جلدی سوّیاں ابالیں۔ زاہدہ ناں ناں کرتی ہی رہی مگر امّی نے اس کے منہ میں دو چار نوالے ٹھونس ہی دیئے۔ خالہ بیگم نے جگ مگ کرتی ہری ساڑی اڑھا دی۔ مانگ میں افشاں بھر، ہونٹوں پر مسّی کی دھڑی جما دی اور دعا دی۔

"جیسی ہری بھری جا رہی ہے ویسے ہی آئیو" راتوں رات زاہدہ کو موٹر میں ڈال ہسپتال لے جایا گیا۔ بڑی مشکلوں سے کرائے کا کمرہ مل سکا۔ چھابی اور امّی اس کے ساتھ ہی رہیں۔ امّی بار بار وظیفہ کرتیں منّتیں مانگتیں۔

"مولیٰ تیری دہائی۔ پہلوٹی کا جاپا ہے چین آرام سے گودی بھریو"

"اللہ تیری خیر، بھری پری گھر سے آئی ہے ویسی ہی جائے"

چھابی سُن جیسی بیٹھی رہی۔ نہ خوشی نہ غمی۔ ایک نامعلوم سا احساس اس کا دل دکھلائے دیتا تھا۔ کرسی پر پڑے پڑے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ہی صبح اس کی آنکھ کھلی تو نرس زاہدہ کا ٹمپریچر لے کر جا رہی تھی۔ چھابی گڑبڑا کر اٹھی اور لپک کر زاہدہ کے پاس پہنچ گئی۔ ننھی منی گڑیا سی بیٹی اُس کے پہلو میں پڑی ہوئی تھی۔ اور وہ درد کے ساتھ ہلکے ہلکے مسکرا رہی تھی۔ مگر بڑی ہی خوشیوں بھری مسکراہٹ اس کے گال تکلیف سے تمتمائے ہوئے ضرور تھے۔ مگر اس تکلیف کے باوجود بھی

اس کے چہرے پر چھائی خوشی کا اندازہ لگا لینا چھایا کے لئے مشکل نہ تھا۔
چلّہ نہا کر زاہدہ سسرال جانے لگی تو گود بھرائی کی رسم ہوئی۔ ماں، خالاؤں، بہنوں نے دعائیں دیں اور ننھی کو خوب پیار کیا۔ چھایا نے ننھی کو گود میں لیا تو زاہدہ ہنس کر بولی۔ "اب آپ بھی ایک کھلونے کا انتظام کر لیجئے آپی۔ دل بہلا رہے گا۔"
اور اس نے ہنس کر اپنے دولھے کی طرف دیکھا۔
چھایا نے آنکھیں اٹھا کر دونوں کو دیکھا تو اُسے ایک دم الطاف یاد آ گیا۔
اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ایک لمحے کو اُسے خیال آیا" اگر مجھے کبھی بھی ایسا کھلونا نہ ملا تو ؟؟؟ اس تو کے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی۔ اس "تو" کے آگے زندگی کا تصور ہی مشکل تھا۔

ایک دن اماں نے چھایا کو ایک تعویذ لا کر دیا۔ چھایا نے اُسے لے تو لیا مگر حیرت سے بولی۔
"اس کا کیا کروں گی ہیں ؟"
اماں کچھ گھبرا سی گئیں۔ پھر سنبھل کر بولیں۔" اے بٹیا اس کو باندھے رکھو۔ بُرے خواب نہیں دکھائی دیں گے۔"
اماں تو چلی گئیں۔ مگر چھایا بڑی دیر تک ان خوابوں کے بارے میں سوچتی رہی ـــــ رنگین ـــــ سنہری ـــــ رنگ دار چمکدار خواب جو اُس نے اور الطاف نے دیکھے ضرور مگر پورے نہ ہوئے۔
"اماں کون سے بُرے خوابوں کا ذکر کرتی ہیں۔" اس نے بھرے دل اور گیلی آنکھوں سے سوچا۔" میں نے تو سدا ہی رنگین خواب دیکھے ہیں۔ رنگین جیسے قوسِ قزح۔"

اسے خود سے زیادہ ترس اماں پر آتا اور اماں سے بڑھ کر الطاف پر، اُسے بچّے کا کتنا چاؤ ہے؟ اور پھر اُسے ان ننھے منّے کرتوں اور اُس رنگین بش شرٹ کا خیال آجاتا جو الطاف نے آج سے نہیں چھ سال سے خرید کر رکھا تھا۔

شادی کو پانچ سال گذر گئے تھے۔ "اللہ کو میری گود بھرنی ہوتی تو بھر نہ دیتا؟"

چھایا کے سپنوں میں ننھے منّے ہاتھ۔ چھوٹے چھوٹے پاؤں رس گھولتے رہے۔ سب سے بڑھ کر اُسے ننھی منّی ہتھیلیوں اور گلاب کے پھولوں ایسے کومل تلوؤں کا خیال آتا جو دن رات اُس کے خوابوں کو سجائے رکھتے۔

الطاف کو نیا بنگلہ مل گیا تھا اور اس نے ایک چھوٹی سی موٹر بھی خرید لی تھی۔

ایک دن الطاف آفس سے ذرا جلدی لوٹ آیا اور چھایا سے بولا۔

"میں ذرا نہا کر آتا ہوں۔ تم بھی تیار ہو جاؤ۔"

"کیوں؟" چھایا حیرت سے بولی۔ "کہاں جانا ہے؟"

"ارے شہر میں نمائش لگی ہے تمھیں معلوم نہیں۔ ذرا گھوم آئیں گے۔"

"پیدل چلیں گے؟" چھایا رُک رُک کر بولی۔

"اور موٹر کو سر پر رکھ لیں گے؟" الطاف قہقہہ لگا کر بولا۔ "دیکھو دیر مت لگانا۔" اور وہ ہاتھ گاؤن کاندھے پر ڈال گنگناتا چلا گیا۔

جب سے الطاف نے موٹر خریدی تھی۔ چھایا اس میں بیٹھتے کانپتی تھی۔ موٹر کی چھت سے الطاف نے ایک ننھا منّا کا نور کا گڈّا لٹکا رکھا تھا جو دھکا کھا کر زور سے "امّی" کہتا۔ پھر جھولنا شروع کر دیتا۔

چھایا کو "امّی" کا وہ لفظ تیر کی طرح دل میں چبھتا محسوس ہوتا کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ الطاف کو بچّے کا کتنا شدید ارمان تھا۔

چھابی اداس اداس سی پھرتی رہی اور الطاف اسے کہتا رہا: "کچھ تو خرید و چھابی"
ایک دکان پر الطاف نے اسے مجبور کر ہی دیا کہ کچھ تو ضرور لے۔ چھابی بے دلی سے ہنس کر بولی۔ "کیا لوں سبھی کچھ تو ہے "
"پھر بھی کچھ نہ کچھ تو لینا ہی ہوگا۔ آخر نمائش روز روز تو نہیں لگتی۔"
ایک دکان پر ایک بچہ کھلونے کے لئے بری طرح مچل رہا تھا۔ اس کی ماں نے زوردار طمانچہ اس کے منہ پر مارا۔
چھابی تیزی سے آگے بڑھ گئی اور پلٹ پلٹ کر اس غریب عورت کو دیکھتی رہی جو غریب ہو کر بھی ساری دنیا کی دولت اپنے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے تھی۔
اچانک ایک دکان پر چھابی ٹھٹک گئی۔ شو کیس میں سامنے ہی ننھے ننھے موزے اور دستانے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے بہت ہی دکھے دل سے دیکھا۔ دل کے کسی کونے میں دبکی تمنا پوری طرح جاگ اٹھی۔
"ان ننھی ننھی ہتھیلیوں اور مخمل ایسے نازک تلوؤں کے لئے گرم دستانے اور موزے تو ہونے ہی چاہئیں۔"
اس نے دکاندار سے بھاؤ پوچھا۔
"اصلی ولایتی مال ہے میم صاحب۔ ان دستانوں کی قیمت صرف ساڑھے سات روپے اور یہ موزے آٹھ روپے چودہ آنے۔"
" اتنے مہنگے؟" چھابی حیرت سے بولی۔
" ارے میم صاحب! آپ انہیں مہنگا کہتی ہیں۔ چودہ پندرہ روپے بھی کوئی چیز ہیں بچوں کے لئے۔ اپنے دل کے ٹکڑوں کے لئے پندرہ روپے تو کیا زندگی بھی کوئی چیز نہیں۔"
چھابی بوکھلا اٹھی اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سن سکتی تھی۔ اس کی ممتا جاگ

اُٹھی۔ دل کے کونے میں سویا سویا پیار جاگ اٹھا۔ بچّے کے لئے، اپنے بچّے کے لئے۔ اپنے ان دیکھے بچّے کے لئے۔ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا جس کا ابھی تصور بھی نہ تھا۔ مگر جس کے ہونٹ تصور ہی تصور میں اسے "ماں ماں" کہہ کر پکارتے تھے۔

اس کے ہونٹوں کے کنارے کانپنے لگے اور اس نے جھٹ ہاتھ بڑھا کے وہ دستانے اور موزے اپنے سینے سے لگا لئے۔

چھابی نے لاکھ اپنے دل سے یہ خیال ہٹانا چاہا مگر وہ اس حقیقت پر پردہ نہ ڈال سکی کہ الطاف کی نظریں ذرا کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہیں۔ کہاں وہ دن کہ محبت بھری باتیں دن رات ختم ہونے میں نہ آتیں۔ کہاں یہ دن کہ بات کرنے کے لئے ڈھونڈے سے موضوع ہی نہ ملتا۔

"کیا یہ میرا اپنا قصور ہے؟ کیا میں ایسا نہیں سوچ سکتی کہ یہ سب الطاف کا قصور ہے؟ مگر سچ تو یہ ہے کہ قسمت میں یہی محرومی تھی۔"

وہ آنکھوں میں آنسو لئے بہت دیر تک اداس بیٹھی رہی۔ پڑوس میں ایک وکیل صاحب رہتے تھے جن کے ڈھیر سارے بچّے تھے۔ الطاف کی جلد ہی سارے بچّوں سے دوستی ہو گئی۔ پانچ سوا پانچ کے انداز میں جب وہ آفس سے لوٹتا تو موٹر کی آواز سنتے ہی سب کے سب دوڑ پڑتے اور الطاف کی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیتے۔

چھابی کبھی اس منظر کی تاب نہ لا سکتی۔ کبھی کبھار کوشش کر کے وہ اپنے بے جان جسم کو کھڑکی تک لے بھی آتی تو آنسوؤں کی چلمن اس منظر کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کر دیتے۔

امّاں کی شفقت بھری نظریں اب قہر بنتی جا رہی تھیں۔ دبی دبی زبان میں انہوں نے

دہ ایک طعنے بھی دیئے، وہ زبان تک نہ ہلا سکی۔ تنہائی میں جب اس کے کمرے میں کوئی نہ ہوتا۔ وہ دھیرے سے سوٹ کیس کھولتی اور نرم نرم بش شرٹ کو اپنی آنکھوں سے ملتی رہتی۔ "الطاف نے کتنے ارمانوں سے اسے خریدا ہوگا۔ یہ آستینیں اتنی چھوٹی ہو کر بھی کتنی بڑی ہیں۔ منّے کی کہنیاں تو ضرور ہی ڈھک جائیں گی اور یہ ہے تو اتنا ذرا سا۔ مگر منّے کے سارے وجود کو ڈھک دے گا۔ مگر۔ مگر منّا ہے کہاں؟"

اس کی ماممتا بے کل ہو اٹھی۔ اس کے ہاتھ ننھے ننھے ہاتھوں کو کھوجتے۔ اس کے ہونٹ کانپتے ہی رہ جاتے کہ ان ننھے منّے ملائم سے ہونٹوں کو چوم سکے جن میں دودھ کی خوشبو رچی ہوئی ہو۔"

چھابی اور الطاف کی محبت خاندان بھر میں ضرب المثل بن چکی تھی۔ مگر اب دونوں کے بیچ نفرت کی ایک دیوار غیر محسوس طریقے پر کھڑی ہوتی جا رہی تھی۔

الطاف کی بہن شہناز اپنی سسرال سے آئی تو اس کی نند ذکیہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ صورت بُری نہ تھی مگر چھابی کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتی۔ رات گئے تک سب باتیں کرتے رہتے اور چھابی رہ رہ کے اپنے دل میں کسک سی محسوس کرتی۔ الطاف ذکیہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کی ہر بات پر قہقہے لگاتا۔ ذکیہ پان لگا رہی ہوتی تو بہت مہذب بن کر کہتا۔

" اچھا ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ کو کچھ نہیں آتا۔"

ذکیہ بچّوں کے لئے کچھ سی رہی ہوتی تو کہتا۔" آپ کی انگلیاں تو سلائیوں پر خوب چلتی ہیں، فرصت رہے تو ایک سوئٹر ہمیں بھی بُن دیجئے گا۔"

چھابی کو یاد آتا کہ سرمئی رنگ کا سوئٹر اس نے ابھی پرسوں ہی تو سلائیوں سے اتارا ہے۔

شہناز کی ایک بڑی پیاری سی بچی تھی۔ گول مٹول گوری گوری دو تین سال کی اور گود کا بچہ دو تین ماہ کا تھا۔ الطاف بچی کو گود میں لیتا۔ چھلاتا، بھینچ بھینچ کر چک پھیریاں دیتا۔ چھابی دل ہی دل میں ہڑکتی مگر کچھ کر نہ پاتی۔ الطاف کبھی دبی زبان سے اور کبھی کھلم کھلا اپنی محرومی کا ذکر کرتا۔ "اماں کو بچے کی کتنی آرزو ہے"۔

چھابی چاہے کسی کام میں مصروف ہوتی یہ خیال اس کے ذہن سے نہ ہٹتا کہ اس کی گود سونی ہے۔ دوسروں کے بچوں کو پیار کرنے کی اس کے دل کو کبھی چاہت نہ ہوئی۔

ایک دن سردی بہت پڑ رہی تھی۔ شہناز کا بیٹا کمبل میں لپٹا پڑا تھا مگر پھر بھی کانپ رہا تھا۔ الطاف جھٹ اٹھا اور سوٹ کیس کھول کر دستانے اور موزے نکال لایا۔ اور اسے پہنا دیئے۔ چھابی کا دل اندر ہی اندر کانپتا رہا۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ ذکیہ درجنوں موزے اور سوئٹر تو بنتی رہتی ہے کیا ابھی کے خریدے ہوئے موزے پہنانے ضروری تھے۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اگر اس کے منع کرنے پر الطاف نے کہیں یہ کہہ دیا۔ "بانجھ تو ہو، جمع جتھہ کی کیا ضرورت ہے تو کیا وہ اس تیر کو برداشت کر سکے گی؟

"اماں کہتی ہیں دوسری شادی کر لو بھیا۔ گھر سونا سونا لگتا ہے بنا بچوں کے۔"
شہناز کی آواز سنائی دی۔

"سوچیں گے۔" الطاف کی سپاٹ اور بے رس آواز آئی۔

چھابی گھبرا گئی۔ زندگی کے بارے میں اس انداز سے چھابی نے کبھی نہ سوچا تھا۔ "الطاف کسی اور کا ہو جائے گا" وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہو جائے گا۔ کیا سچ مچ؟!؟ "میرے خدا!" وہ تکیے پر اوندھے منہ گر پڑی۔ "میرے خدا، میرے

مالک، کیا وہ ننھی ننھی بانہیں کبھی میرے گلے کا ہار نہ ہوں گی؟ کیا وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ کبھی میرے سینے سے نہ کھیلیں گے۔ کیا وہ ملائم ملائم ہونٹ کبھی مجھے ماں کہہ کر نہ پکاریں گے ایسا نہ کرنا خدایا۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ اس سے تو اچھا ہے مجھے خود ہی موت دے دے۔"

چھایا رات گئے تک روتی رہی۔ تکیے کے کچے رنگ کے پھولوں نے اپنا رنگ چھوڑ دیا۔ اس کے اپنے جیون کے پھول بھی اپنا رنگ چھوڑ رہے تھے۔

"میں خدا کی ذات سے نا امید نہیں ہوں۔" چھایا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

الطاف نے اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھا۔ "بارہ برس بہت طویل مدت ہے چھایا!"

چھایا اس کے پیروں پر گر پڑی۔ "آپ نہیں جانتے لوگوں کو بارہ بلکہ بیس برس کے بعد بھی بچے ہوتے ہیں۔ آپ میری زندگی ہیں۔ آپ سے ہٹ کر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔ بچے کے بغیر میری ممتا آسودہ رہ سکتی ہے۔ مگر محبوب کے بغیر میری زندگی۔! میری محبت۔ میرا جیون سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ اماں کہہ رہی تھیں آپ......"

چھایا نے آنسو برساتی آنکھیں اٹھا کر الطاف کو دیکھا۔ بارہ برس اتنی طویل مدت۔ مگر چھایا وہی تھی۔ بالکل وہی، وہی رنگ، وہی روپ۔ آنکھوں میں وہی ستارے۔ بالوں میں وہی گھٹائیں۔ ہونٹوں میں وہی رس۔ گالوں میں وہی گلاب مگر قدرے پھیکے۔ زرد گلاب بھی تو اپنا ایک حسن رکھتے ہیں۔ الطاف ایک لمحے کو کانپ سا گیا اور پھر سنبھل گیا۔

"تم سے جس نے بھی کہا۔ جو بھی کہا، غلط کہا ہے چھایا۔"

اور تھوڑے دلا دیتے ۔

الطاف کے رویّے میں تبدیلی ہوئی ضرور مگر آتی کہ محبت کی جگہ رحم نے لے لی۔ کبھی کبھی وہ چھابی کو ایسی نگاہوں سے دیکھتا کہ چھابی جھنجھلا جاتی "مجھے رحم کی نہیں محبت کی ضرورت ہے "

اماں نے اب کھلم کھلا طعنے دینے بند کر دیئے تھے۔ زندگی میں پھر رنگ آ رہا تھا۔ قسمت اس پر مہربان ہو رہی تھی۔

ایک دن خوشی خوشی الطاف گھر لوٹا۔ کئی زمانوں بعد وہ چھابی سے اتنی خوشی خوشی بات کر رہا تھا۔

" چھابی میرا گریڈ بڑھنے والا ہے۔ دلّی سے انٹرویو کال آیا ہے۔ میں کہتا تھا نا ریلوے میں میرے لئے بہت چانس ہیں۔"

چھابی ایک لمحے کو مسکرائی۔ مگر اسے درد نے آ گھیرا۔" اتنا پیسہ، اتنی دولت۔ مگر کھانے والا کوئی تو ہو" اس کا جی الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا۔

چھابی کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ لیٹی ہی رہتی۔ کھانا دانا سب بند تھا۔ الطاف جب دلّی جانے لگا تو رہ رہ کے کچھ سوچتا۔ چھابی کو ہدایت کرتا" صحت کے بارے میں لاپروائی مت برتنا۔ کھانا نہیں کھایا جاتا تو پھل ہی کھا لیا کرو۔"

چلتے چلتے الطاف کہہ گیا۔" دوا وغیرہ کھاتی رہنا۔" چھابی کو اس جملے سے محبت کی بجائے رحم کی بُو آئی۔ اس نے دل کے درد کو چھپا کے کہا۔

" معدے کی پرانی شکایت ہے۔ آپ ہی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

الطاف چلا گیا۔ پانچ چھ دنوں بعد اس کا خط اماں کے نام آیا۔ بالکل رسمی سا خط۔ "میں اچھا ہوں۔ انٹرویو ابھی نہیں ہوا۔ گھر کی بہت یاد آتی ہے۔"

ہر تیسرے چوتھے دن الطاف کے خط آتے۔ مضمون وہی یکسانیت لئے ہوئے۔

ایک دن چھابی کی طبیعت صبح سے خراب تھی۔ اسے رہ رہ کے چکر آتے۔ اور دل ڈوبتا محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا تھا دم گھٹ کے رہ جائیگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور ادھر ابکائیوں نے الگ نڈھال کر دیا تھا۔ چھابی نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی موٹر نکلوائی اور ہاسپٹل پہنچ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے خوب غور سے دیکھا اور چند سوالات کئے۔

عمر کتنی ہے۔ شادی کب ہوئی تھی۔ طبیعت کب سے خراب ہے۔ پھر ذرا ٹھہر کر بولی "آپ ذرا یہاں لیٹیے۔ میں ابھی آپ کا معائنہ کروں گی۔"

چھابی ڈاکٹر کے کہنے پر بے دلی سے میز پر لیٹ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے پیٹ کو خوب دیکھا بھالا۔ پھر ہنس کر کہنے لگی۔ "آپ کو تین ماہ کا حمل ہے۔"

چھابی میز پر ہی اُچک کر بیٹھ گئی۔ پہلے تو اُسے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ پھر اک دم ہکلانے لگی۔

"سچ..... واقعی..... کیا..... یہ حقیقت ہے۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں..... سچ سچ..... ڈاکٹر کیا سچ مچ میں ماں بننے والی ہوں۔ آپنے مجھ سے مذاق تو نہیں کیا ہے..... کیا سچ مچ....."

ڈاکٹر مسکرا کر بولی۔ "جی ہاں بالکل سچ ہے۔ آپ یقیناً ایک ننھے منّے کی ماں بن رہی ہیں۔"

"اوہ ڈاکٹر!" چھابی لیڈی ڈاکٹر سے لپٹ گئی ٹپ ٹپ ٹپ آنسو ڈاکٹر کے کوٹ پر گرنے لگے۔

وہ جلد سے جلد یہ خبر اماں اور الطاف کو سنا دینا چاہتی تھی۔ مگر یہ موٹر کتنی دھیرے دھیرے

چل رہی ہے۔

بارہ برس کے بن باس کے بعد آخر کار آج اس کے جیون میں بہار لوٹ رہی تھی۔ اس کے تصوّر میں آج نئے ڈھنگ سے، نئے رنگ سے چمکدار رنگیلے سپنے جھلمل جھلمل ناچ رہے تھے۔ بار بار ایک ننّھا مُنّا، گیلا گیلا سا وجود اس کے سراپے میں رینگ جاتا۔ اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے اس کی آنکھیں بند کرکے پوچھتا:

"میں کون ہوں، بوجھو تو؟"

"تو میرا لال ہے۔ میرا جیون۔ میری زندگی ہے۔ تیرے بنا جیون کے یہ بارہ سال اندھیری رات سے مشابہ تھے۔ میری آنکھوں کے تارے، راج دلارے۔"

اس کی آنکھوں کے آگے بہاریں جُھوم جُھوم اٹھیں۔

گھر پہنچ کر وہ امّاں سے لپٹ گئی شرم کے مارے اس کے منہ سے الفاظ نہ نکلتے تھے۔ جب وہ شرماکر پوری بات کہہ سکی تو امّاں نے کانپتے ہاتھوں سے خط پکڑا دیا۔

"صابرہ!

میں تم سے بہانہ کرکے آیا تھا۔ انٹرویو وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ اصل میں ہم سب نے کچھ اور ہی طے کر رکھا تھا۔ اگر امّاں کو ساتھ لے آتا تو بات تم پر ظاہر ہو جاتی اور بھانڈا پھوٹ جاتا۔ تمھاری صورت یاد آتی ہے تو اب بھی رحم آتا ہے مگر زندگی کے بارہ سالوں کے بعد اب اور کتنا انتظار ہو سکتا تھا؟ میں نے ذکیہ سے شادی کر لی ہے۔ طلاق نامہ ساتھ ہی مرسل ہے۔"

باپ اور بیٹا

"ابا میاں۔ پلیز اب تیار ہو بھی چکیئے" شمیم نے بے حد پیار سے پکار کر کہا۔

"بس بیٹا ایک منٹ"

"یہ ایک منٹ" صبح سے اب تک بیتا ہی نہ تھا، اور اب تین بج رہے تھے، سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں سے شہر جاتے ہوئے راستے میں ایک لمبا سا جنگل بھی پڑتا تھا شمیم چاہتا تھا کہ اندھیرا پڑنے سے پہلے ہی اپنے ٹھکانے پہنچ جائے لیکن ابّا میاں تھے کہ ان کے کام ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے کیا کم بکھیڑے اپنے پیچھے لگا رکھے تھے۔ بھینس بکری، کتّا، بلّی، اور پھر چھوٹا موٹا ایک پولٹری فارم ۔۔۔ جاتے جاتے آخر انہیں ان سبھی کا کچھ نہ کچھ بندوبست تو کرنا ہی تھا۔

"ابا میاں رات ہو گئی تو رنی تنہائی میں گھبرائے گی، پلیز ابّا میاں" شمیم

نے ایک اور ہانک لگائی۔

"بس بیٹا ایک منٹ"۔ اور ابّا میاں مسلسل جتے ہی رہے مرادآبادی گلاس، لوٹا، بدھنا، حقہ، بانس کی ٹوکری اور جانے کیا کیا الّم غلّم ابّا میاں کے آگے ڈھیر تھا۔ شمیم زیرِ لب مسکرائے جا رہا تھا۔ بے چارے سوئیٹ سے ابّا میاں۔ ابھی ان کو پتہ ہی نہ تھا کہ یہ سب سامان کس قدر بجز ضروری اور غیر اہم رہ جائے گا۔ جب وہ اس کے شاندار بنگلے میں سیٹل ہو جائیں گے۔ اسی دم ابّا میاں مڑے اور ذرا ادبدھے کے ساتھ شمیم سے بولے۔

"بیٹا یہ چارپائی نہ رکھ لوں"؟

حیرت سے شمیم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ چارپائی! ابّا میاں؟ یہ بان کی کھرّی چارپائی۔؟ ارے ابّا میاں آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ میں نے تو آپ کے لئے فوم ربر کا بے حد نرم اور شاندار اور ایسا خوبصورت بیڈ تیار کروایا ہے کہ آپ اس پر لیٹتے ہی خوابوں کے جزیروں میں پہنچ جائیں گے...

...وہ شاعری پر اتر آیا۔

"اچھا۔ وہ ذرا سوگوار سی مسکراہٹ سے بولے۔" تو جیسا کہے ویسا ہی کروں گا"۔

"ہاں ابّا میاں۔ بالکل ویسا ہی جیسا میں کہوں۔ اس لئے ابّا میاں کہ زندگی بھر میں نے آپ کو تکلیفیں ہی دی ہیں۔ اور سدا آپ پر بوجھ بنا رہا۔ میری ہی وجہ سے آپ نے زندگی میں کبھی سکھ کا سانس تک نہ لیا۔ اب اللہ نے موقع دیا ہے تو میں بھی دل بھر کر اپنے ارمان نکالوں گا۔ ابّا میاں آپ کو اتنا سکھ دوں گا، اتنا آرام دوں گا، اتنا آرام دوں گا"۔ اس نے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ پھیلا دئے کہ

آپ زندگی بھر کی ساری کلفتیں بھول جائیں گے۔"

ابا میاں نے اپنا بچے کا سا بھولا بھالا منہ اٹھا کر اس کی باتیں سنیں اور ایک دم ان کا گلا رندھ گیا۔ "نہ بیٹا یوں نہ کہہ۔ کوئی اولاد ماں باپ پر بوجھ نہیں ہوتی اولاد تو بیٹا نصیبے والوں کو ہی ملتی ہے اور پھر تجھ جیسی سعادت مند اولاد۔" وہ آنسو پونچھنے کے بہانے مڑ گئے۔ "ذرا مائی خیراں کو دیکھ آؤں......

مائی خیراں ایک کونے میں منہ دئے رو رہی تھیں بوڑھے چہرے پر ملگجے آنسو جھریوں میں سے آڑے ترچھے ہو کر بہہ رہے تھے۔ جب سے شمیم ابا میاں کو لینے آیا تھا ان کی آنکھ سے آنسو نہ ٹوٹا تھا۔ کوئی پچیس سالوں سے جب سے کہ شمیم کی اماں مری تھیں۔ مائی خیراں ہی نے شمیم کی ماں کے تمام فرائض انجام دئے تھے ــــ پیٹ میں نو مہینے رکھنے کی ایک ذمہ داری ہی اُن سے چھوٹ گئی تھی ورنہ وہ سچ مچ ہی شمیم کی ماں ہی ہو گئی تھیں۔ شمیم کی امی کے زمانے سے وہ روٹی ڈالنے اور برتن دھونے آتی تھیں لیکن ان کی اچانک موت نے جیسے سارے کام ہی ان کے سر لا ڈالے۔ نوکر اور مالک کا رشتہ ان میں اور کلیم میاں میں ہمیشہ برقرار رہا۔ میاں جی کہہ کر ہی انہوں نے سدا ابا میاں کو مخاطب کیا اور نظر جھکا کر بات بھی کی لیکن یہ صرف ابا میاں جانتے تھے کہ ان جھکی ہوئی نگاہوں کے آگے انہیں تو سر جھکا دینا چاہئیے ــــ شاید وہ نہ ہوتیں تو شمیم اس مقام پر نہ پہنچ پاتا۔ تھا ہی کیا۔ لے دے کے دو چھوٹے چھوٹے کھیت ہی تو آمدنی کا ذریعہ تھے۔ لیکن انہوں نے خواب سدا محلوں کے دیکھے تھے۔ ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ اور اقتدار کی اعلیٰ کرسی پر براجمان دیکھیں گے۔ گاؤں میں صرف چوتھی کلاس تک تعلیم ہو سکتی تھی۔ پانچویں سے

انہوں نے شمیم کو شہر بھیج دیا۔ فصل خراب ہوتی یا اچھی، وہ کسی نہ کسی طرح اس کے اخراجات کی پابجائی کرتے رہے۔ کبھی انہوں نے شمیم کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے پہنائے اور ضرورتِ زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا خیال رکھا۔ جب کبھی شمیم چھٹیوں میں گھر آتا اَبّا میاں کے لئے جیسے بے موسم ہی بہار آجاتی۔ مائی خیراں بھی اتنے دنوں کے لئے جیسے اپنے گھر بار کو بھول سی جاتی۔ لیکن اب کی بار شمیم آیا تو وہ بات ہی نہ تھی۔ بیچ میں اتنے سارے سال کیسے گذر گئے تھے کہ پتہ تک نہ چلا تھا۔ انہیں اَبّا میاں کی زبانی سب حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ یہ بھی اَبّا میاں نے ہی بتایا تھا کہ شمیم درجہ بدرجہ بڑھتے بڑھتے اُس مقام تک پہنچ گیا تھا جس کے صرف خواب ہی دیکھے جا سکتے ہیں آئی۔ اے۔ ایس کے عہدے پر شمیم کیا پہنچا کہ اچھے اچھوں کی آنکھیں اس کی راہوں میں بچھ بچھ گئیں اور ایک بار، ابھی تھوڑے دنوں پہلے شمیم اَبّا میاں کو شہر لے گیا تھا، اپنی شادی کے لئے۔ شہر کے سب سے مشہور اور امیر ترین ڈاکٹر کی اکلوتی لڑکی ناہید رفعت سے جس کا بیاہ ٹھہرا تھا جنہوں نے جہیز میں لمبی سی گاڑی کے ساتھ ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ ہر ہر چیز دی تھی۔ اَبّا میاں اس لئے خوش نہیں تھے کہ ان کے بیٹے کو بے حد روپیہ اور ضرورتِ زندگی کی ہر اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بیٹھے بٹھائے ہی مل گئی تھی۔ وہ تو یوں خوش تھے کہ شمیم خوش تھا اور رفی تھی اتنی پیاری کہ کوئی بھی شوہر اسے پاکر اپنی خوش قسمتی پر ناز کر سکتا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ بے پناہ روپے پیسے نے بھی اسے غرور کا داغ نہ لگنے دیا تھا۔ نوکروں کی پلٹن ہونے کے باوجود وہ شمیم کا ہر کام اپنے

ہاتھوں کرنے میں بڑائی سمجھتی ۔۔ جب شادی بیاہ کے مرحلوں سے فراغت پاکر ابا میاں گاؤں لوٹ رہے تھے تو نئی دلہن ہونے کے باوجود شرماتے شرماتے اس نے سسر سے کہا بھی کہ ابا میاں اب تو آپ ہمارے ہی ساتھ رہنے لگئے نا ۔۔ وہاں اکیلے رہ کر آپ کیا کریں گے ۔؟" تو ابا میاں ہنس کر ٹال گئے تھے ۔۔ وہ اپنی اس معصوم سی بہو سے کیا بتاتے کہ وہاں وہ اکیلے نہیں ہیں ۔۔ وہاں ان کے وہ کھیت ہیں جنہوں نے ان کا اور شمیم کا جیون بدل دیا ہے ۔ وہاں ان کے پالتو جانور ہیں ۔ ان کا آبائی چھوٹا سا گھر ہے جس کا ٹوٹا پھوٹا سامان بھی اس قدر عزیز ہے ، پھر مائی خیراں ہے ، اس کا میاں جو ان کا عزیز دوست ہے ۔ مائی خیراں کے بچے ۔۔ ایک دنیا وہاں ان کے لئے منتظر رہتی ہے ۔

اور وہ جب گاؤں لوٹ کر آئے تو ایک ایک چھوٹی سی چھوٹی بات انہوں نے خوشی خوشی سب کو بتائی ۔ اور اس غم کو بھی انہوں نے نہیں چھپایا کہ شمیم نے اپنی شادی میں مائی خیراں کو نہ بلا کر انہیں کتنا دکھ دیا ہے بھلے ہی ان کے شوہر کو نہ بھی بلاتا ، لیکن مائی خیراں کے تو ان دونوں پر کتنے احسان تھے ۔ لیکن مائی خیراں پر اس بات کا ذرہ برابر بھی ملال یا غم نہ تھا ۔ وہ تو بے حد خوش تھیں کہ چلو شمیم میاں کا گھر بار بس گیا ۔ زندگی میں اسی ارمان کے لئے تو لوگ کتنے دکھ سہہ جاتے ہیں ۔ بس غم انہیں یہ تھا کہ شمیم میاں کی نوکری شہر میں لگی ہوئی تھی اور بڑھاپے میں بھی کیا میاں جی اولاد سے دور ہی رہیں گے ؟! انسان اسی آس پر تو ہر تکلیف جھیل جاتا ہے کہ بڑھاپا سکھ سے گذرے ۔ سامنے بہو بیٹے کی پیار بھری زندگی ہو ۔ پوتے پوتیوں کی کلکاریاں اور معصوم لڑائی جھگڑے ہوں ۔۔ لیکن شاید یہ سب کچھ ابا میاں کا مقدر نہ تھا ۔

لیکن یہ مائی خیراں کا اپنا بھولپن تھا جو وہ یہ سوچ بیٹھی تھیں، ادھر شمیم ایک لمحے کو بھی یہ بات نہ بھولا تھا کہ ابا میاں تنہا زندگی کیسے گذار پائیں گے۔ اس سے پہلے وہ دو بار اور بھی گاؤں آیا تھا۔ ایک بار آیا تو یہ دیکھ کر اس کا جی دکھ کر رہ گیا کہ ابّا میاں نے بلا ضرورت ہی مرغیاں پال رکھی ہیں۔ اس نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

ابّا میاں ـــ میرے خیال سے آپ کو روپے پیسے کی تو اب کوئی تکلیف ہی نہیں ہے۔ یہ آپ نے اپنی جان کو بکھیڑے کیوں لگا رکھے ہیں؟ وہ ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "ارے بیٹا خالی وقت پڑے پڑے کس طرح کاٹوں۔ چلو مرغیاں ہی پال لیں"

شمیم نے بڑے غم سے انہیں دیکھا۔ وہ بڑبڑا سے گئے ارے بیٹا تو اس طرح اداس کیوں ہو گیا۔ پہلے مجھے بڑی فکر لگی رہتی تھی کہ شمیم بیٹے کے لیے یہ کرنا ہے۔ شمیم بیٹے کے لیے وہ کرنا ہے۔ سارا وقت ایسے ہی گذر جاتا تھا، اب ..... وہ چپ سے ہو گئے .... وقت کاٹے نہیں کٹتا۔"

"تو ابّا جان آپ میرے ساتھ شہر چلئے نا ـــ مائی خیراں نے زندگی بھر ہم دونوں کے لیے جو کچھ کیا اس کا بدلہ تو خیر کسی طرح ادا ہو ہی نہیں سکتا لیکن آپ اپنے چھوٹے موٹے کھیت انہیں دے کر کسی طرح خوشی تو حاصل کر سکتے ہیں نا ـــ؟ آپ خود سوچئے کیا مجھے اچھا لگتا ہو گا کہ زندگی بھر جس باپ کو اپنی وجہ سے تکالیف دیں، بڑھاپے میں بھی سکھ نہیں دے سکتا؟"

میں شہر چلا جاؤں ـــ؟ ابّا میاں بے حد حیرت سے بولے۔

"کیوں کیا آپ مجھ سے زیادہ کسی اور کو چاہ سکتے ہیں" شمیم ذرا برا مان

کر بولا۔

"نہیں بیٹا تجھ سے زیادہ پیارا مجھے کون ہوگا۔ لیکن مجھے یہ سوچنے
بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ میں اپنے گاؤں کو چھوڑ کر چلا جاؤں "
شمیم ایسا بھی کچھ جذبات سے عاری نہ تھا کہ اّبا میاں کے احساسات کو
سمجھ ہی نہ پاتا۔ لیکن وہ چپ نہ رہ سکا۔ اس سے اگلے چکر میں بھی وہ یہی
سب دہرا گیا۔ پھر ایک بار ریکی بھی آئی۔ ابّا میاں پھر بھی راضی نہ ہوئے۔
ادھر دل بہلانے کو انہوں نے طوطے سے لے کر بلّی، بکری، کتا اور جنے کیا کیا الا
بلا پال رکھا تھا۔ اس سے پہلے چکر میں شمیم آیا تو کار دور ہی کھڑی کر کے وہ
چپکے سے گھر میں چلا آیا۔ دیکھے تو سہی ابا میاں خالی وقتوں میں کرتے کیا ہیں۔ کچھ
بھی نہیں گھر کے پچھواڑے بڑے انہماک سے وہ کیاریاں بنا رہے تھے۔ اور
پاس کھڑے کتے سے باتیں کئے جا رہے تھے۔

" اب اس میں جو ٹماٹر لگیں گے نا موتی یہ اتنے بڑے بڑے ہوں گے۔ ایک
ٹوکرے میں جمع کر کے پھر ہم شہر بھجوائیں گے شمیم بٹیا کے لیے۔ ایں۔ یہ
ہے نا، اور کدّو تو شمیم کھاتا ہی نہیں۔ پھلیاں البتہ اسے بہت بھاتی ہیں.....
شمیم روہانسا ہو گیا۔ پیچھے سے جا کر اس نے ابّا میاں کے گلے میں بانہیں
ڈال دیں۔ ابا میاں آپ کو میری قسم اگر آپ میرے ساتھ شہر نہ چلے .....
اور پھر قسم کے آگے ابّا میاں کا کوئی بس نہ چلا .....

سب سامان کار کی ڈکی میں لد چکا تھا۔ اّبا میاں بڑی خالی خالی نظروں
سے کھڑے گھر بار کا جائزہ لے رہے تھے۔ شمیم نے گھر کی چابی مائی خیراں کے
ہاتھ میں پکڑا دی۔

"مائی اب یہ سب اپنا ہی سمجھو اور خدا کے لیے رو نہیں۔"

مائی خیراں کچھ نہ بولیں۔ روئیں بھی نہیں۔ ابّا میاں اپنے گھر بار کو بڑی بے بس نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے کہ کار دھول کا بادل اڑاتی کچی سڑک پر دوڑ گئی۔ کار کے جاتے ہی مائی خیراں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ـــــ

لوگ اسی لیے تو اولاد کی آس کرتے ہیں۔ ابا میاں اب کے گاؤں سے آئے تو سبھی کچھ بدلا بدلا سا پایا۔ اس سے پہلے وہ صرف مہمان کی حیثیت سے آتے تھے اب کے شمیم انہیں یوں لایا تھا کہ واپسی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اسی لیے باغ کی طرف کونے کا ہوادار کمرہ ابا میاں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ایک خدمت گار صرف ابا میاں کی خدمت کے لیے مخصوص تھا۔ گاؤں میں صبح سویرے منہ دھو کر ابا میاں خود اپنے ہاتھوں دہی بلو کر لسّی کا بڑا گلاس پیتے تھے۔ یہاں صبح ہی صبح خدمت گار چائے کی ٹرے لیے حاضر رہتا۔ حقہ ساتھ آیا تو تھا۔ لیکن شمیم نے ایک سے ایک بڑھیا ٹین سگریٹوں سے بھرے ہوئے ابّا میاں کے لیے لا کر سجا دئے تھے۔ اِدھر ایک منٹ کی کمی بیشی کے بغیر ناشتہ تلے ہوئے انڈے۔ سنکے ہوئے مکھن لگے ہوئے ٹوسٹ کے ساتھ مل جاتا۔ کوکو اولٹین، کافی الگ۔ جیسا شمیم کا عہدہ اعلیٰ تھا ویسا ہی رکھ رکھاؤ بھی تھا۔ ایک بجتے ہی ڈنگ ڈونگ بل بجتی اور خدمتگار ابّا میاں کو ڈائننگ ہال میں پہنچا دیتا شمیم بھی "لنچ آور" میں گھر آیا ہوتا وہ باپ کے آگے بچھ بچھ جاتا۔ ابّا میاں بے چاروں نے زندگی بھر لہسن کی چٹنی کچی پیازیں، ہری مرچیں، موٹی روٹیوں کے ساتھ لسّی کے گھونٹوں سے اندر کی تھیں۔ شمیم انہیں سوپ پیش کرتا۔ ایک سے ایک مرغن کھانے، پھر چار بجے کی چائے۔ پھر ذرا ٹھنڈا وقت ہوتا تو باور

شوفر، صاحب" کے حکم پر "بڑے صاحب" کو شہر گھمانے سیر کرانے لے جاتا۔ شمیم نے نوٹوں سے بھرا ایک پرس ابا میاں کی جیب میں رکھ دیا تھا۔ ممکن ہے شہر میں کوئی چیز پسند آجائے اور وہ بیسہ ہونے کے کارن ترس کر رہ جائیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ابا میاں کی سی بزرگ شخصیت کو کبھی اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی شرمندگی اٹھانی پڑے! رات کا کھانا بھی اسی اہتمام سے ہوتا۔ رات کو سوتے وقت دودھ اور ڈرنکنگ چاکلیٹ سے بھرا لمبا سا گلاس میز پر ان کا منتظر ہوتا۔ آفس جاتے وقت، اور لوٹ کر آنے کے بعد، ہر بار شمیم کا معمول تھا۔ بے حد محبت سے آکر پوچھتا۔

"ابا میاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے"؟

ابا میاں معصوم سی گول گول آنکھوں سے بیٹے کو دیکھتے اور ہڑبڑا سے جاتے۔ "تکلیف"۔؟ ارے کاہے کی تکلیف بیٹا۔ تم نے تو مجھے بادشاہوں کا سا راج عطا کر دیا ہے"۔

شمیم کا سینہ محبت اور فخر سے پھول جاتا۔ زندگی میں اس کی بدولت ابا میاں نے جو جو تکالیف اٹھائی تھیں بالآخر اس کا ازالہ اس نے کر ہی دیا تھا۔!

لیکن اِن تمام باتوں کے ساتھ ساتھ شمیم کو ایک دکھ بھی تھا۔ پہلے وہ جب کبھی گاؤں جاتا تھا، دیکھتا تھا کہ ابا میاں بوڑھے ہونے کے باوجود چہکتے ہنستے پھرتے ہیں۔ ہنسی مذاق، دل لگی دل کھول کر اونچے اونچے قہقہے ـــ یہاں آکر جیسے وہ ہنسنا ہی بھول گئے تھے۔ ممکن ہے انھیں رفی سے کوئی شکایت ہو۔ لیکن اتنا تو وہ بھی دیکھتا تھا کہ رفی ان کا اتنا ہی

خیال رکھتی تھی جتنا کوئی بیٹی اپنے باپ کا رکھ سکتی ہے۔ اکرم شمیم کو اپنی غفلت کا احساس ہوا "ارے ممکن ہے ابا میاں کو کوئی بیماری ہو اور کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میں نے آج تک ان کا میڈیکل چیک اپ تک نہیں کروایا" ۔ فوراً ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر کو بلایا گیا ۔ زبان، آنکھیں، ناخون ہونٹوں کی رنگت کا معائنہ ہوا، بلڈ پریشر چیک کیا گیا بخار لیا گیا اور بستر کے بازو ایک چھوٹی سی ٹیبل پر دواؤں کا انبار لگ گیا۔ آتے جاتے وہ نرس کو ہدایت کرتا۔

ابا میاں کا خیال رکھنا۔ ایسا نہ ہو وہ دوا پینا بھول جائیں" پندرہ روپے روزانہ کی نرس دن میں کئی کئی مرتبہ ان کا منہ زبردستی کھول کر کڑوی، کسیلی دوائیں بھرتی ۔ شمیم کو بڑا دکھ تھا کہ کبھی رات کو وہ ابا میاں کے کمرے کے پاس سے گذرتا تو دیکھتا کہ اپنے انتہائی نرم آرام دہ اور فوم ربر کے بستر پر بھی وہ کچھ بے چین بے چین سے ہیں ۔" اے خدا میں ابا میاں کو کس طرح آرام دوں ۔" وہ بڑے دکھ کے ساتھ سوچتا۔

اس دن کلب میں ڈنر پارٹی تھی۔ شمیم اور رنی نرس سے ہدایت کر گئے تھے کہ ابا میاں کا پورا خیال رکھے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی اتفاقاً نرس کو کہیں سے کال آیا۔ فون ریسیو کر کے وہ قدرے گھبرائی ہوئی سی ابا میاں کے پاس آئی اور بولی۔

"میرے بچے کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے صاحب۔ اگر آپ کی طبیعت بہتر محسوس ہو رہی ہو تو میں ۱۔ ۲ گھنٹوں کے لیے گھر ہو آؤں"۔

ابا میاں نے بڑی محبت اور خوشی سے اسے اجازت دے دی تھوڑی دیر بعد ابا میاں نے اپنے خاص خدمت گار کو بلا کر اسے پیسے دے کر حکم دیا

کہ شہر سے فلاں فلاں دوا خرید لائے۔ خدمت گار کے جاتے ہی انہوں نے چوروں کے سے انداز میں اِدھر اُدھر جھانکا۔ پھاٹک پر۔۔ بان پہرہ دے رہا تھا۔ کچن میں خانساماں کے گنگنا گنگنا کر پکانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پرلی طرف مالن، دھوبن اور برتن دھونے والیوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ ابا میاں نے بڑی خوشی سے یہ بات نوٹ کی کہ اتفاقاً ان کے کمرے کی جو کھڑکی باغ میں کھلتی ہے اس میں سلاخیں نہیں ہیں اور یہ کہ باغ میں کود کر جنگلہ الانگ کر مزے سے فرار ہوا جا سکتا ہے۔۔ آنکھیں بند کر کے اور اللہ کا نام لے کر انہوں نے باغ میں چھلانگ لگا دی۔

صاحب اور میم صاحب کی واپسی پر بنگلے میں کھلبلی مچ گئی۔۔ یہاں وہاں، اِدھر اُدھر، اندر باہر، کہیں بڑے صاحب ہوتے تو ملتے! ہر ہر نوکر سے باز پرس کی گئی۔ نرس کو ڈانٹا ڈپٹا گیا۔ لیکن بڑے صاحب کا کوئی پتہ نہ چلا۔۔ رنی تو روہانسی ہو رہی تھی۔

"پولیس میں رپورٹ نہ کر دیں شمیم۔"

اک دم شمیم کچھ سوچ کر بولا "ڈرائیور گاڑی نکالو۔۔ اور تیزی سے پلٹ کر بولا۔۔ آؤ رنی گاؤں چلیں۔"

گاؤں سے شہر کا فاصلہ ہی ایسا کتنا تھا۔ گھر سے کافی دوری پر گاڑی رکوا کر شمیم نے رنی کا ہاتھ تھاما اور آہستگی سے گھر کی جانب چلا۔۔ دور سے شمیم نے دیکھا کہ ابا میاں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے، اونچے اونچے قہقہے لگا رہے ہیں۔ ہاتھ میں حقے کی نے تھام رکھی ہے۔ سامنے ہی تام چینی کی رکابی میں کھائی مرچیں اور پیاز کے چھلکے پڑے ہوئے ہیں گویا ابھی ابھی خاصہ تناول فرمایا

گیا ہو کانسی کا گلاس اوندھا پڑا ہوا تھا جس میں سے لسّی کے چند قطرے زمین پر گرے پڑے ہوئے تھے۔ شمیم نے سنا۔

"اوہ مائی خیراں تجھے معلوم ہے کہ دوپہریں شمیم مجھے کیا کھلاتا تھا؟ برتنوں کی دھوون جیسا شوربہ، جس کو وہ سوپ کہتا تھا۔ ہاہاہا۔ اور رات کو سوتے وقت چاکلیٹ — جیسے میں بچہ تھا..... اور صبح ہی صبح ملک الموت کی طرح بیرا میرے لیے چائے لے کر کھڑا رہتا تھا۔ ہاہاہا..... نہ کوئی کام نہ دھام بس پڑے رہو توبہ۔

مائی خیراں، ان کے شوہر ان کے بچے بڑی حیرت سے ساری باتیں منہ کھولے سن رہے تھے۔ کتا، بلی ان کے قدموں میں لوٹ رہے تھے۔ مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ طوطا — "میاں جی آداب عرض ہے" کی رٹ لگائے تھا اور میاں جی ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے —

جو مزہ کھری بان کی چارپائی میں ہے وہ جھاگ ایسے نرم گدوں میں کہاں سے آئے بھلا — کم بخت جسم ڈوب کر رہ جاتا ہے کہ کروٹ تک بدلنا نہ آئے"۔

اور وہ مزے سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر کھری بان پر لیٹ گئے۔

شمیم نے نرمی سے رفی کا ہاتھ تھاما اور کار میں آکر بیٹھ گیا۔ کچی سڑک پر دھول اڑاتی گاڑی شہر کی طرف دوڑ گئی۔

جیسے دریا

میں رونا چاہتی ہوں ——

میں رونا چاہتی ہوں، لیکن آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہوائی ڈاک سے ملنے والا یہ نیلا لفافہ میرے ہاتھوں میں کانپ رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے باریک کاغذ پر لکھا ہوا یہ خط اس لفافے میں سے نکال کر پڑھا ہے اور میں جیسے سن ہو کر رہ گئی ہوں —— اس لفافے کے اندر ایک چیک بھی رکھا ہوا ہے۔ اتنی بڑی رقم کا چیک کہ کسی کے نصیب بدل جائیں۔ لیکن میں سوچ رہی ہوں اس چیک اور ان ہزاروں روپوں کو پاکر بھی میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ میرے دل پر بجائے خوشی کے یہ بوجھ کیسا ہے —— ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط کانپ رہا ہے۔

"بٹیا بی بی، دوپہر کے لیے کیا پکے گا؟" رسول بابا مجھ سے کچھ پوچھ رہے

ہیں ۔ میں گھبرا کر سر اٹھاتی ہوں ۔

میں ان سے کیسے نظر ملاؤں ؟

" جو بھی آپ مناسب سمجھیں بابا ـــــ" میں فوراً اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہوں ۔

" نہیں نہیں ـــــ میں بابا سے آنکھیں چار نہیں کر سکتی ۔" میں اپنے آپ کو سناتی ہوں ۔

بابا ایک معصوم سی مسکراہٹ چہرے پر لیے پلٹ کر کچن کی طرف جا رہے ہیں ۔

" بٹیا تو مجھی پر ٹال دیتی ہیں ۔ لو بھئی اب میں کیا پکواؤں ؟ چلو ٹھیک ہے بابا لوگ کے لیے پھیکا آلو گوشت، فیرنی ..... صاحب کے اور بٹیا کے لیے ....

ان کی آواز، ان کے قدموں کی چاپ کے ساتھ دور جا کر ڈوب جاتی ہے اور مجھے پہلے کا ـــــ بہت سال پہلے کا ایک دن یاد آجاتا ہے ......

بے پناہ سردیوں کے دن تھے ۔ صبح کے کوئی دس بج رہے تھے ۔ ہم لوگ ہیٹر سے دہکتے ہوئے گرم گرم ڈائننگ ہال میں ناشتہ کر رہے بیٹھے تھے ۔ ٹیبل، کھانے کی طرح طرح کی چیزوں سے لدا ہوا تھا ۔ چائے دانی میں چائے اور پر کولیٹر میں گرما گرم کافی ڈھلی رکھی تھی ۔

اسی دم آیا ڈائننگ ہال میں داخل ہوئی اور ذرا ڈرتے ڈرتے بولی ۔" میم صاحب باہر کوئی بھکاری کھڑا ہے ۔"

" بھکاری کھڑا ہے تو ہم سے بتانے کا مطلب ؟ "

وہ کچھ جھلا کر بولے "کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔"

"جی ـــ جی ...." آپا کچھ ہچکچاتی ہوئی بولی "وہ کہتا ہے مجھے خیرات کی ضرورت نہیں ہے۔"

خیرات کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ غصے سے بولے "پھر یہاں تشریف لانے کا مقصد"۔؟

"افوہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا غصے کیوں ہو جاتے ہیں۔" میں انہیں کچھ منانے کے کچھ ڈانٹنے کے انداز میں بولی ۔ جاؤ آپا تم اس سے پوچھو تو وہ چاہتا کیا ہے"۔

وہ ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے ان کا دھیان بٹانے کی خاطر خشک میوے کی پلیٹ ان کے آگے رکھ دی

آپا تھوڑی دیر بعد نمودار ہوئی اور بولی "میم صاب وہ تو عجیب ڈھیٹ سا آدمی ہے۔ کہتا ہے میں بی بی سے خود بات کروں گا۔

انہوں نے غصے سے آپا کی طرف دیکھا۔ لیکن ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی میں آپا کو حکم دے چکی تھی "اسے یہاں لے آؤ۔"

ڈھیلے ڈھالے میلے کپڑے، سفید بالوں سے بھرا سر، ملگجی داڑھی سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں، بڑی بڑی آنکھیں، جن میں بیچارگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ بے حد کانپتی اور لرزتی آواز میں اس نے بغیر کسی کو مخاطب کئے ہوئے کہا ۔

"اسلام علیکم"۔

سلام کا جواب دے کر میں نے بے حد نرمی سے سوال کیا "تمہیں

کیا چاہیئے بابا؟
"ٹھکانہ۔" انہوں نے بہت مختصر سا جواب دیا۔
ہم نے کوئی لنگر خانہ تو نہیں کھول رکھا ہے۔" وہ بے حد تلخی سے بولے۔ "ٹھکانہ، ہونہہ"!
وقت بری چیز ہے بیٹا۔ ورنہ آپ یوں نہ دھتکارتے۔" وہ مڑے ہلکی آواز میں خدا حافظ کہہ کر جانے ہی کو تھے کہ میں جلدی سے بولی۔
"بابا سنو تو ــــــ"!
بابا نے اور "انہوں" نے ایک ساتھ مجھے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک کے چہرے پر آنے والی خوشیوں کا تاثر، دوسرے کے چہرے پر غصے کی چھاپ!
"بابا کیا تم باغ کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔"؟
"بٹیا، وقت نے ہر کام کا عادی بنا دیا ہے۔ مالی، دھوبی، باورچی میں سب کچھ بن سکتا ہوں۔ بس دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لئے ایک ٹھکانہ چاہیئے۔"
"اب تک کہاں رہتے رہے"؟ انہوں نے بیچ میں ایک سوال اور کر ڈالا۔
افوہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسے غیر ضروری سوال کیوں کرتے ہیں۔ بھلے سے وہ کہیں بھی رہے ہوں، ہم سے مطلب "؟ میں ذرا دھیرے سے بولی۔
"بھئی تم سمجھتی نہیں ہو۔" وہ اب کی بار انگلش میں بولے "اس قسم کے لوگ سخت خطرناک ہوتے ہیں۔ عموماً ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہوتے

ہیں۔ ہمدردی حاصل کر کے گھر لٹوا دیتے ہیں۔ تم اپنے بھولپن سے کبھی نہ کبھی دھوکا کھاؤ گی۔"

بڑی فصیح اور شستہ انگلش میں بابا نے دھیرے سے کہا: "آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ہاتھ جوڑے ہوئے، بے چارگی کی تصویر بنے ہوئے! "اُن" کے چہرے پر خفگی اور ندامت کا ملاجلا تاثر تھا۔ ڈائننگ ہال سے باہر جاتے ہوئے وہ بول گئے۔

"شوبی یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔"

اس گھر کا تو ہر معاملہ ہی میرا اپنا ہے، اور ظاہر ہے یہ حسن و خوبی میں ہر ایک کو ہی کامیابی سے سلجھا لیتی ہوں۔ میں نے سوچا اور طے کر لیا کہ اس مظلوم روح کو بہرحال مجھے سکھ دینا ہی ہے۔ میں جلدی سے اٹھی۔ اندر والے کمرے میں آ کر "اُن" کی الماری کھول کر میں نے دھوبی کے ہاں کا دھلا صاف کرتا پاجامہ نکالا اور ایک تولیہ لے کر برآمدے میں آ گئی، جہاں بابا سکڑے سمٹے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"لو بابا، تم پہلے جا کر نہا کر یہ کپڑے بدل ڈالو۔ اس کے بعد ناشتہ کر لو۔ ۔ ۔ ۔" ذرا رک میں نے پوچھا: "ویسے تمہارا نام کیا ہے بابا"؟

"محمد رسول" انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

میں اک دم ٹھٹھک سی گئی۔ سہمے ہوئے انداز میں بولی: "دیکھو بابا تمہارا نام تو اس عظیم اور پاک شخصیت کا نام ہے کہ جسے یہ گناہ گار زبانیں ادا کرنے کی اہلیت اور ہمت تک نہیں رکھتیں۔ ہم اگر تمہیں صرف بابا ہی کہیں تو؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا بیٹیا۔ انسان کے اعمال اس کے اپنے ساتھ ہوں،

بس ۔ ۔ ۔ غسل خانہ کدھر ہے بیٹا ؟"

آپا، بابا کو لکس کی ایک ٹکیہ دے دو اور سرونٹس کوارٹرز کی آخری ڈالی کوٹھری صاف کرا دو ۔"

" صورت سے تو بے چارے بڑے نیک معلوم ہو رہے ہیں ۔ نام بھی کتنا مبارک اور مقدس ہے ۔ محمد رسول ۔" میں بچوں کی سی خوشی سے بولی " لیکن ہم انہیں ان کے نام سے نہیں پکاریں گے ۔ بے عزتی ہوتی ہے نا ۔ ؟ اور دیسے بچپن میں ہمیں مولوی صاحب نے بتایا بھی یہی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک دم وہ ہنس پڑے " شوبی تم دو بچوں کی ماں ہو کر ابھی تک کتنی چائلڈش ہو " !

اوہ ! میں تنک گئی " آپ بھی بس عجیب و غریب آدمی ہیں ۔ یا تو غصے رہیں گے یا بس مذاق کئے جائیں گے ۔"

ارے بھائی میں غصہ وصہ کبھی نہیں رہتا ، اصل میں تم میں اتنا بچپنہ بھرا ہوا ہے کہ مجھے ہر بار تمہیں گائیڈ کرنا پڑتا ہے ، سمجھانا پڑتا ہے اور تم سمجھتی ہو کہ میں غصیلا ہوں ۔"

" چھوڑیئے اس غصے پتے کی بات کو ۔ اس وقت میں بہت خوش ہوں "

" میں بھی تو سنوں ، آخر کیوں " ؟

" ارے بس یونہی ——— شاید یہ بابا کے آجانے کی وجہ ہو ۔"

" تم نے تو آگے ہی نوکروں کی فوج لگا رکھی ہے ۔ بابا کے آجانے سے کیا نئی بات ہو گئی ۔" ؟

آپ سمجھتے تو ہیں نہیں ۔ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ گھر میں اچھے اچھے

ناموں والے مکین ہوں تو بڑی برکت رہتی ہے۔"

وہ خوش دلی سے مسکرائے "اچھا میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے فضل سے اس گھر میں کون سی برکت نہیں ہے؟ روپیہ پیسہ عزت نوکر چاکر، گاڑیاں، فون، فرج، عیش و آسائش کی ہر چیز پیاری سی ایک گڑیا ایک ننھا منا گڈا، اور ایک ۔ ۔ ۔ ۔" وہ شرارت سے مسکرائے "اس جنت میں ایک پاکیزہ حور"

"افوہ بس لگے بنانے" اور میں ان کے شریر تیور دیکھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔

بابا کے نہا کر آنے تک میں نے برانڈے میں ایک چٹائی بچھوا کر ان کے لئے ناشتہ لگوا دیا۔ گرم گرم چائے، سنکے ہوئے ٹوسٹ، مکھن، جام، ہیرے آملیٹ، پراٹھے اور حالانکہ اس وقت فیرنی کی کوئی تک نہ تھی لیکن چونکہ فرج میں موجود تھی اس لئے ایک طشتری میں وہ بھی۔

بابا نہا کر آئے تو بالکل بدل گئے۔ سفید پاجامے اور کرتے میں خاصے معزز معلوم ہو رہے تھے۔ سر کے ملگجے بال اور میلی داڑھی نکھر کر جھاگ کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ گرم گرم پانی سے ان کی چھپی ہوئی گوری رنگت سرخ ہو گئی تھی۔

"بابا تم سب سے پہلے کچھ کھالو" میں بڑے پیار سے بولی۔

سفید دسترخوان پر اتنی ساری چیزیں دیکھ کر وہ ذرا خائف سے ہو گئے ٹھٹھک کر بولے "یہ ۔ ۔ ۔ یہ ۔ ۔ ۔"

"ہاں بابا" میں محبت سے بولی "یہ میں تمہارے ہی لئے لگوایا ہے۔ کھاؤ نا"

"بٹیا ۔۔۔" وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولے "آپ ۔۔۔۔ آپ روز ایسے ہی کھایا کرتی ہیں"؟

"ہاں، ہاں ۔۔۔ کیوں؟" میں حیرت سے بولی۔

"اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ مجھے بھی یہی سب کچھ ملا کرے گا"؟

میں ہنس پڑی "ارے بابا، خدا نے اگر دیا ہے تو تمہیں کیوں نہیں دوں گی۔ تمہیں پتہ ہے بابا غریبوں کو کھلانے سے خدا چوگنا دیتا ہے۔ میں تو اپنے سبھی نوکروں کو وہی دیتی ہوں جو میں خود کھاتی ہوں"۔

انہوں نے بڑے غم اور بے چارگی بھرے لہجے میں پوچھا "بٹیا، آپ مجھے نکالیں گی تو نہیں"؟

پتہ نہیں کہاں سے گرم گرم آنسو میری آنکھوں اور حلق میں اُبل آئے۔ میں بڑی مشکل سے بولی۔

"بابا تم نے مجھے بٹیا کہا ہے نا ۔۔۔ کبھی کسی بیٹی نے آج تک اپنے باپ کو دھتکارا ہے"؟

"نہیں بٹیا ایسی بات نہیں مگر ۔۔۔۔ سرکار کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں"۔

"ارے بابا ۔۔۔۔" میں قائل کرنے کے انداز میں بولی، جیسے ان سے بڑی پرانی بے تکلفی ہو ۔۔۔ "تمہیں معلوم نہیں وہ دل کے بڑے اچھے ہیں۔ دل میں کوئی بات تو رکھتے ہی نہیں۔ مگر بابا آج کل کا زمانہ اچھا نہیں ہے نا، تو وہ مجھے ذرا سمجھاتے رہتے ہیں۔ ارے بابا ۔۔۔" میں بات ادھوری چھوڑ کر چلائی "تم ناشتہ تو کر لو پہلے ۔۔۔"

بابا دسترخوان کے کنارے بیٹھے۔ ہاتھ اٹھا کر، آنکھیں بند کر کے دعا مانگی۔

ــــــ اے رب العالمین تو مجھے ان نعمتوں سے اب کبھی محروم مت کرنا"
ان کی پلکیں آنسوؤں کا بوجھ سنبھالنے میں ناکام ہوگئیں۔
میں نے دو کھیے دل سے اسی دم طے کرلیا کہ یہ شخص اگر مجھے دھوکہ دے
تب بھی میں اسے کبھی نہیں نکالوں گی ـــ کبھی نہیں ـــ چاہے کتنا ہی بڑا
گناہ کرے۔!

اور میں اپنے عہد پر قائم رہی
دھوکا کھانے کے باوجود۔!

چند ہی دنوں میں بابا ہمارے گھر میں یوں رل مل گئے کہ پتہ نہ چلتا کہ یہ
ہمارے خاندان کے ایک فرد نہیں ہیں۔ میرے دونوں بچے بھی ان سے یوں
مانوس ہو گئے جیسے وہ ان کے سگے نانا یا دادا ہوں۔ گڑیا تو سمجھ دار تھی لیکن چھوٹا
جو ابھی سال بھر کا بھی نہیں تھا، آپا کو چھوڑ کر انہی کا ہو رہا۔ بمشکل ایک ماہ ہوا
ہوگا کہ سارے گھر میں بابا کی عملداری ہوگئی ـــ نوکر تو نوکر، ہم دونوں بھی بابا
کے زیر اثر آ گئے۔ باغ ہے تو بابا کی نگرانی میں، کچن ہے تو بابا کی تحویل میں کیا
پکے گا کیا نہیں، سب بابا کروائیں گے۔ کسی کی دعوت ہے تو سارا انتظام بابا
کروا رہے ہیں۔ ہم کہیں جا رہے ہیں تو سارا گھر بابا سنبھال رہے ہیں۔ اور تو اور
ریاض (میرا دیور) جو ہمیشہ گھر میں اکھڑا اکھڑا سا لیے دیئے رہتا، وہ بھی بابا کا گرویدہ
ہوگیا۔ ریاض کو میں نے بہت کم ہنستے بولتے دیکھا تھا۔ میں بیاہ کر آئی تو سسرال
میں صرف ساس تھیں۔ خسر پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ اماں کے دو ہی لڑکے
تھے۔ یہ اور ریاض۔ ان کی ساری زندگی ان کے اپنے ہاتھوں بنائی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی پرانی باتوں کا ذکر نکلتا تو یہ بڑے فخر سے کہتے کہ میں سیلف میڈ مین (self made man) ہوں۔ شادی کے دو برس بعد اماں دل کے دورے میں ختم ہو گئیں تو ریاض بالکل تنہا رہ گیا۔ کیونکہ یہ ریاض سے کوئی خاص خوش نہ تھے ہمیشہ کہا کرتے کہ اس لڑکے میں اسٹرگل اور جدوجہد کی اسپرٹ ہی نہیں ہے۔ اس عمر میں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد ویسے وہ بے چارہ کئی جگہ کوشش کر رہا تھا۔ لیکن قسمت کے دروازے ابھی تک اس پر نہ کھلے تھے۔ میں اپنے طور پر ان سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ نوکری نہیں لگتی نہ سہی، آپ بھی تو بڑے بھائی ہیں، آپ پر بھی اس کا کچھ حق ہے۔ اپنے پاس سے دس پانچ ہزار روپیہ لگا کر اسے کوئی چھوٹا موٹا بزنس ہی شروع کر وا دیجئے۔ یہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے۔

اس طرح دوسروں کی مدد ملتے رہنے کا چسکا پڑ جائے تو انسان کاہل اور آرام پسند ہو جاتا ہے۔ ترقی اور جدوجہد کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

ویسے مجھے اپنے طور پر ریاض سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن اپنے بھیا کے ڈر کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی دبا دبا رہتا تھا۔ حالانکہ میں نے اس سے بے تکلفی کی فضا ہمیشہ قائم رکھی تھی۔ ویسے مجھے اس پر کچھ عجیب سا ترس آیا رہتا۔ ایسے میں جب بابا کی شکل میں ایک دوست سامل گیا تو مجھے بڑا سکون ملا۔

ایک دن یونہی میں نے انہیں ستانے کی خاطر کہا۔

"آپ تو بابا سے کس قدر بدگمان تھے۔ اور حالانکہ بے چارے اتنے سوئیٹ بڑے میاں نکلے"۔

انہوں نے کچھ نہ کہا ـــ کہتے بھی کیا ہنس کر سر جھکا لیا۔ کچھ ندامت سی.

پھر سے پر سکوت چھا گئی۔

لیکن اس واقعے کے دوسرے ہی دن میرا سر جھک کر رہ گیا۔ خدایا، زندگی بھر کے لیے ــــــ

اس دن ہم ایک پارٹی میں مدعو تھے۔ میں نے بھرپور سنگار کیا تھا۔ شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کے ہاں پارٹی تھی۔ ایسے موقعوں پر آن بان کے ساتھ کچھ مقابلے کا بھی سوال آجاتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے بہترین کپڑے سب سے اعلیٰ زیور اور سب سے قیمتی گہنے پہنے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، رات گئے جب ہم پارٹی سے لوٹے تھے تو میں نے اپنے زمرد جڑے کنگن سامنے یونہی ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دیئے تھے۔ سوچا تھا اتنی رات گئے کہاں سیف کھولتی پھروں۔ جڑاؤ گلوبند، جھمکے، انگوٹھیاں وغیرہ تو الماری میں رکھ دیئے تھے۔ کنگن اتارنا ہی بھول گئی اور جب اتارنا یاد آیا تو وہ بولے، "ابھی مت اتارو۔ اتنے خوب صورت ہاتھ لگ رہے ہیں، تھوڑی دیر میں اور دیکھ لوں تو ــــــ"

عورت کو ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ملتی رہیں تو اس کی جوانی سدا بہار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ویسے بھی وہ کنگن انہیں بہت پسند تھے اور انہی نے پورے چھ ہزار میں میرے لیے شادی کی پہلی سالگرہ پر خرید کر تحفہ دیئے تھے۔ میں نے کنگن ہاتھوں ہی میں رہنے دیئے۔ رات گئے جب میں نے مسہری پر لیٹے لیٹے سرہانے کی لائٹ آف کرنے کو ہاتھ بڑھایا تو مجھے کنگن جھلکتے دکھائی دیئے۔ ــــ ارے، کہیں نیند میں، سوتے میں ایک دو زمرد جھڑ گئے تو خواہ مخواہ اتنے پیارے کنگن برباد ہو جائیں گے۔ میں نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کا اور بائیں ہاتھ سے

دائیں ہاتھ کا کنگن اتارا اور دونوں وہیں آئینے کے سامنے رکھ دیئے ــــ اور بھول گئی ۔

صبح ناشتے کے بعد، ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے میں آئی تو اچانک جیسے کوئی بھولی بات یاد آجائے ۔ میں نے آئینے کے سامنے دیکھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہر شیڈ کی لپ اسٹک کی ایک قطار، پوڈر کریم کے ڈبے ۔ کنگھے، کلپ، ہیئر پن ہیرا سپرے، سینٹ کی چھوٹی بڑی شیشیاں ۔ مگر کنگن نہیں تھے ۔

"کنگن آپ نے اٹھائے ہیں"؟ میں نے مڑ کر ان سے پوچھا ۔ جو میرے پیچھے کمرے میں داخل ہو رہے تھے ۔

"نہیں تو" وہ گھبرا سے گئے ۔

"پھر کنگن کیا ہو گئے ــــ"؟ میں نے جلدی جلدی ہر چیز کھول کر دیکھ ڈالی ۔ کہیں بھی کنگن کا نام و نشان نہ تھا ۔ یہاں سے وہاں تک ڈھنڈائی پڑ گئی نوکروں کو بلوایا گیا ۔ سب نوکر حاضر تھے ۔ برسوں پرانے نوکر تھے کسی پر شبہ کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا، لیکن پوچھنا تو ضروری تھا ہی ۔ بابا کی باری آئی تو پتہ چلا کہ وہ کوٹھی میں موجود ہی نہیں ہیں ۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ۔ اس لیے نہیں کہ نامراد (مردود) کنگن چوری ہو گئے بلکہ اس لیے کہ وہ اعتماد اور یقین میں نے کھو دیا جو مجھے بابا کی ذات پر تھا ۔ دل کہتا تھا یقین نہ کروں لیکن رہ رہ کر ان کی نگاہیں اور ان میں بھری چبھن بے کل کر دیتی تھی ۔

شام پڑے بابا لوٹے تو میرے دھڑکتے دل کو قرار آگیا ۔ اگر یہ چوری کر کے بھاگے ہوتے تو پلٹ کر کیوں آتے ؟ میرا دل خوشی سے بھر سا گیا ۔

"رسول بابا ــــ ادھر آؤ ــــ" انہوں نے سختی سے ہونٹ

بھینچ کر انہیں پکارا تھا۔

"جی سرکار ـــــ" وہ ہمیشہ کی طرح محبت کی تصویر بنے پکے آئے۔

کتنی ہی دیر تک نوکر اور آقا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ آخر بابا نے سر جھکا لیا۔

"بابا ـــ" انہوں نے زبان کھولی۔ "شوبی تمہیں اتنا چاہتی ہے کہ میں تمہیں پولیس میں دینا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم اپنے منہ سے یہ اقرار کر لو کہ تم نے ہمارے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

بابا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ "میں اتنا برا نہیں ہوں سرکار ـــ بٹیا کے کنگن میں نے نہیں لیے۔"

انہوں نے زہر خند قہقہہ لگایا ـــ "میں نے اپنی زبان سے کنگن کا نام لیا ہی نہیں، تو تم کیسے سمجھ گئے کہ بات کنگن کی ہو رہی ہے؟ اس کا مطلب صاف سیدھا یہی نکلتا ہے کہ تم نے ہی کنگن چرائے ہیں۔"

بابا کچھ نہ کہہ پائے ـــ وہ ایسے کانپ رہے تھے جیسے تیز ہوا سے آگے کمزور درخت جھول جھول جاتا ہے۔

اک دم وہ ان کے پیروں پر گر پڑے اور گڑگڑا گڑگڑا کر کہنے لگے۔

"یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری چوری ہے سرکار۔ یقین کیجئے ان ہاتھوں نے کبھی کسی کی ادنیٰ سی چیز کو بھی نہیں چھوا، لیکن آج . . . . ." آواز آنسوؤں کی شدت سے ٹوٹ ٹوٹ کر رہ جاتی تھی۔ مگر وہ گڑگڑائے جا رہے تھے۔ "مجھے جیل کی ہوا نہ کھلائیے سرکار۔ میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔"

"لیکن بابا ـــ" میں رندھے گلے سے بولی۔ "تمہیں چوری کرنے کی ضرورت

کیا پڑی تھی۔ تم مجھ سے مانگ لیتے۔ کنگن تم نے کیوں اٹھائے؟"

"بٹیا ۔۔۔ وہ سسک کر بولے " ماں تا اور محبت کی پکار بری ہوتی ہے جینے نہیں دیتی"

" مگر بابا" میں حیرت سے بولی" آج سے پہلے تو تم نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں، میرا کوئی نہیں۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ تمہاری کوئی اولاد بھی ہے"

"ہاں بٹیا ۔۔۔ نہیں کہا میری ایک اولاد وطن میں ہے، اسی کی خاطر میں نے یہ ندامت مول لی ہے۔ وہ ان کی طرف بڑے دکھ بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے بولے " سرکار جا ہے جو سلوک کیجئے میں نے کنگن بیچ کر روپے اپنی اکلوتی اولاد کو بھیج دیئے ہیں۔ " اور وہ ان کے پیروں میں گر پڑے۔

وہ مجھ سے پیچھے ہٹ گئے۔

" مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ شوبی کا واسطہ نہ ہوتا تو تمہیں ایک منٹ اس گھر میں نہ ٹکنے دیتا۔ تم جیسے ذلیل آدمی کی صرف ایک ہی سزا میں سوچ سکتا ہوں" پھر وہ باری باری ہر نوکر سے بچوں سے، ریاض سے، مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے " آج سے اس پنچ آدمی کو ہر شخص چور بابا کہہ کر پکارے تاکہ اسے اپنا یہ گناہ ہر لمحہ یاد رہے ۔۔۔" اور وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بچے تو بچے ہی ٹھہرے، ویسے چھوٹا تو ابھی بولنا سیکھ رہا تھا۔ لیکن آقا کا حکم نوکر کیسے ٹالتے۔ کوٹھی میں بسنے والا ہر شخص جو بابا کو پہلے رسول بابا، یا بابا کہہ کر پکارتا تھا، اب "چور بابا" کہنے لگا۔ صرف میں ایک ایسی تھی جو نہ بابا بولتی تھی نہ چور بابا۔ میں نے ان سے بات کرنی ہی چھوڑ دی۔ وہ بات کرتے تو جواب ضرور دے دیتی۔ لیکن

مجھد کبھی ان سے بات کرنے کوجی نہ اٹھا۔ وہ تھکے تھکے سے، مرے مرے نینوں سے جھکے جھکے اب بھی ساری کوٹھی کا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ لیکن سب کی نگاہوں سے وہ گر چکے تھے۔ ہم کہیں جاتے تو یہ خاص طور سے بابا کو سنانے کی خاطر اونچی آواز سے بولتے۔

"الماری اور سیف کو اچھی طرح بند کر لو، چوروں اچکوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔"

بابا کچھ نہ بولتے۔ بچوں سے ان کی محبت بدستور قائم رہی۔ بچے معصوم فرشتہ وہ بھی ان کے گرویدہ رہے۔ دونوں کا اکثر وقت بابا کی کوٹھری میں ہی گذرتا ہے۔

ان سارے دنوں میں حالات کافی بدلے۔ ریاض کو ایک نوکری کا انٹرویو کال آیا اور وہ دہلی چلا گیا۔ ان پر خدا اور مہربان ہوا جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا کامیابی نے قدم چومے۔ مٹی کو بھی ہاتھ لگایا تو سونا ہو گئی ـــــ بابا اور بوڑھے اور نانا ہو گئے ـــــ ہمارے گھر ایک اور ننھے سے گڈے نے جنم لیا۔ زندگی مکمل ترین اور خوب سے خوب صورت ترین بن گئی۔ لوگ کہتے ہیں اللہ نے دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں بنائی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی رکھ دی ہے۔ میں سوچا کرتی میری زندگی میں کیا کمی ہے۔؟

اور آج اتنے سال گذرنے پر میں سوچ رہی ہوں۔ میری زندگی میں کوئی تو کھٹک ہے۔ احساس گناہ کا ناگ رہ رہ کر دل کو ڈسے لیتا ہے۔ میں کیا کروں؟ اس گناہ کے داغ کو کیسے دھوؤں۔؟

میں خط ہاتھ میں لئے ہوئے دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی ان کے کمرے تک آئی ہوں۔ خط میں نے ان کے ہاتھوں میں تھما دیا ہے اور خود نڈھال ہو گئی

صوفے میں گر گئی ہوں ۔ انہوں نے خط پڑھ کر سامنے ٹیبل پر ڈال دیا ہے۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ بہت نادم اور دکھی نظر آرہے ہیں ۔

ہم دونوں کی نگاہیں ایک بار ملتی ہیں ۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر کہہ نہیں پاتی ۔ نیلا کاغذ ہوا سے پھڑپھڑا رہا ہے اور سارے الفاظ جیسے مجھے رہ رہ کے رونے پر اکسا رہے ہیں ۔ اس سیدھے سادے سے خط میں لکھا ہے :

میری اچھی بھابھی !

کئی سال بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں ۔ میں آپ کو بھولا نہیں تھا۔ آپ سی شفیق بھابھی کو میں بھول بھی کیسے سکتا ہوں ۔ آپ کی محبت ہمیشہ میرے دل اور زندگی پر چھائی رہی ۔ بھیا کے مقابلے آپ مجھے کتنا چاہتی تھیں، ایسی بھابھی کو کوئی بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا ۔

بھابھی اتنے برسوں بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں تو سوجھتا نہیں کہ کہاں سے ابتدا کروں اور کہاں پہ انتہا! پر آج آپ کے سامنے دل کا بوجھ بھی اتارنا ہے ۔ بھابھی، مجھے آپ سے کہتے ہوئے عجیب سی ندامت ہو رہی ہے جھجک آرہی ہے ۔ لیکن سوچتا ہوں آپ سے بھی نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا اور دل کا بوجھ کیسے ٹلے گا ـــــ بھابھی، آپ کو بتاؤں مجھے دہلی سے انٹرویو کال وغیرہ کچھ بھی نہیں آیا تھا ۔ میں یونہی بہانے سے گھر سے نکل پڑا ۔ دہلی ضرور آیا مگر اس طرح کہ آپ کے کنگن چرا کے بیچے، روپیہ نقد کیا ۔ دہلی آکر پاسپورٹ کے لئے کوشش کی اور بڑی مصیبتوں کے بعد کینڈا پہنچ گیا ۔ کرائے کے لئے رقم کا بندوبست میں صرف اسی طرح کر سکتا تھا بھابھی کہ چوری کروں ۔ نئے ملازم رسول بابا کی آمد نے میری اسکیم میں رنگ بھر دیا ۔ ظاہر ہے ان کے سوا کسی پر

آپ لوگوں کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ کنگن چرانے کے بعد اگر میں جاتا تو مشکوک ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے کنگن بیچ کر روپیہ اپنے پاس رکھ لیا تھا اور کافی دن بعد وہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہوا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اس سلسلے میں میں بول بابا سے جتنا شرمندہ اور جتنا ممنون ہوں اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ لیکن بھابھی دنیا میں زندہ رہنے اور کامیاب بننے کے لیے مجھ جیسے لوگ سوائے بے ایمانی کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں ـــــ آج یہاں آئے مجھے پانچ چھ سال ہو گئے ہیں۔ ان برسوں میں میں نے بے پناہ ڈالر کمائے ہیں۔ ایک خوبصورت گھر خرید لیا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو میرے پاس نہ ہو۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میں نے بابا کو جو زندگی دی ہے وہ زخم میرے وجود سے نہیں جا سکتا۔ پتہ نہیں بابا آپ کے پاس ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر ہوں تو میں ان سے معافی تک مانگنے کی، اپنے اندر نہیں پاتا۔

اس کہانی کا کلائمکس یہ ہے بھابھی کہ اپنی نام نہاد دہلی کی روانگی کے وقت جب میں سب سے مل ملا کر بابا سے ملنے گیا اور ان سے کہا کہ بابا مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں ایک بڑی ذلت بھری زندگی بخشی ہے۔ میں نے کنگن چرا کر الزام تمہارے سر لگوایا ہے، تو بھابھی پتہ ہے اس فرشتے نے کیا جواب دیا تھا؟۔ انہوں نے کہا تھا ـــــ "بیٹا جب تم کنگن اٹھا کر گھبرائے گھبرائے بھاگ رہے تھے میں نے دیکھ لیا تھا۔ لیکن تم اپنی زندگی شروع کرنے جا رہے تھے، میں اپنی زندگی ختم کر چکا تھا۔ ایک بنتی ہوئی زندگی کو میں کیسے بگاڑ دیتا" گویا وہ شروع سے ہی میرے راز کے شریک تھے۔ اگر ان کی عظمت اور شرافت دیکھئے کہ یہ کلنک بھی خوشی اپنے ماتھے پر لگا لیا۔

بھابھی مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ پیسہ ان تمام کلفتوں کا بدل نہیں ہوسکتا، لیکن پھر بھی اگر بابا ابھی تک آپ کے پاس ہوں تو ان روپیوں میں سے پانچ ہزار روپے آپ بابا کو میری طرف سے ضرور دے دیجئے اور ان سے کہہ دیجئے ان کے ایک نابکار بیٹے نے انہیں یہ حقیر نذرانہ بھجوایا ہے۔ اب کیا کہوں بھابھی سمجھ میں نہیں آتا ــــ"!

آپ کا ــــ ریاض

ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے خط کانپ رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں بابا کو بلا کر سنائی مانگوں، لیکن میری آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز حلق ہی میں گھٹی جارہی ہے۔ میں رونا چاہتی ہوں لیکن آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے ہیں۔

میں سوچ رہی ہوں، بابا کو پکار بھی لوں تو ان سے کیا کہوں گی۔؟



تحفہ

نرم نرم ہاتھوں سے کسی نے میرا سُرخ گھونگھٹ اٹھایا اور میرے کانوں سے ایک بوجھل بوجھل دُکھی دُکھی آواز ٹکرائی "باجی آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہیں؟" میں نے اپنی تپتی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ گڑیا سامنے بیٹھی آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم کی اس قدر گہری چھاپ تھی کہ میرا دل کٹنے لگا۔ میں نے پھر اپنی آنکھیں موندلیں اور سر جھکالیا۔ "باجی اب آپ ہمیں دیکھنا بھی نہیں چاہتیں؟" میں نے تڑپ کر گھونگھٹ پھینک دیا اور اُسے گود میں بھر کر بولی۔ "گڑیا ایسی کیسی بات تونے کہی۔ میں تم لوگوں کو نہ دیکھنا چاہوں گی تو اور کسے دیکھنا چاہوں گی؟"

گڑیا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو قطرے نکلے اور میرے سینہ پر گر پڑے سُرخ کُرتے کو بھگوتے ہوئے وہ آنسو میرے دل میں جا کر چھِد گئے۔ میں نے دُکھ سے گڑیا کو دیکھا۔ سُسرال کی عورتیں آجا رہی تھیں۔ گڑیا نے میرا گرا ہوا گھونگھٹ اٹھایا اور پھر سے میرے چہرے پر ڈال دیا۔ میں نے گھونگھٹ کی آڑ سے دیکھا۔ گڑیا وہیں بیٹھی تھی۔ سہمی سہمی سی، غمگین غمگین سی۔ سولہ سترہ برس کی نوجوان گڑیا میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ننھی سی لڑکی بن گئی۔ روتی بسورتی ہوا کا ہلکا سا جھکورا آیا اور گھونگھٹ الٹ گیا۔ اب ماضی میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

برسات کے دن تھے گھٹائیں جو چھاتیں تو نکلنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ سدا ئیں سیاہ اور ڈراونی ہوتی تھیں۔ اس رات بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ اور دھواں دھار مینہ برس رہا تھا۔ اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ اتنی رات گئے کون آیا ہوگا۔ سب نے گھبرا کر ایکدوسرے کو دیکھنا شروع کیا۔ ابو برساتی اوڑھے چھتری لگائے پورچ میں پہنچ گئے۔ جاکر دروازہ کھولا تو تار والے کو دروازے پر پایا۔ لرزتے ہاتھوں سے انھوں نے تار ہاتھ میں تھاما اور جھپکرا گئے۔ پھر وہ سنبھلے اور اپنے تلے قدم اٹھاتے اٹھاتے گھر میں داخل ہوئے۔ امی وہیں دروازے پر لگی کسی بری خبر کی منتظر تھیں۔ اتنی سردی میں بھی پیشانی پر نمی کے قطرے چمکتے دیکھ کر وہ سمجھ گئیں کہ کیا ہو سکتا ہے۔ ابو نے دھیرے سے تار وہیں کرسی پر ڈال دیا اور دکھ بھری آواز میں بولے۔ "شمع بجھ گئی۔"

برسات کی رات کا لطف اُٹھانے کے لئے میں نے اپنے کمرے میں موم کی شمع جلا رکھی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے وہ کانپ کر بجھ گئی۔ میں گھبرا اٹھی۔ ابو کہہ رہے تھے۔

"اور اسے بجھنا ہی تھا کب تک جلتی رہتی؟"

امی ساکت و جامد کھڑی تھیں۔ وہ خوابیدہ انداز سے بولیں "اندھیری رات اور دور اُجالا نہ ہو اور آخری شمع بھی بجھ جائے تو پھر کیا ہو سکتا ہے۔"

ابو برساتی پھینکتے ہوئے امی کی طرف لپکے اور بیکل ہو کر بولے۔ "خدا کی مرضی یہی تھی۔ حواس سنبھالو۔ بیچ کررونا۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہ کرو۔"

پھر وہ جھکے اور کان کے قریب منہ لے جاکر بولے "زہرہ! تمہاری بہن مر گئی ہے۔ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں۔ اکیلا شوہر ہے یہ سب بسورتے چہرے

تمہیں نظر نہیں آتے کیا تمہاری آنکھوں میں ان سب کے لئے ایک آنسو بھی نہیں چمکے گا
اتنی چلا کر رو دیں۔

ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تاروں میں لٹکتے بلب جھولنے لگے۔ اور سائے لمبے آڑے ترچھے ہو کر کانپنے لگے۔ اس رات کی صبح برسات کی رات کی طرح تاریک تھی۔ میں نے سرہانے کی میز پر جو موم بتی جلا رکھی تھی۔ وہاں پروانوں اور شمع کے آنسوؤں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ رات کو جو سائے آڑے ترچھے ہو کر جھول رہے تھے۔ اب ساکت ہو گئے تھے۔ کمرے میں بی بی مریم نے اپنے بچے کو آج کچھ زیادہ ہی محبت سے اپنے سینے سے چمٹا رکھا تھا یا پھر میں نے ہی ایسا محسوس کیا۔ میری آنکھوں نے رات بھر جھولتے ہوئے سایوں کا نظارہ کیا تھا۔ اور اب وہ سرخ ہو کر سوج گئی تھیں ابو دھیرے سے میرے کمرے میں داخل ہوئے ان کے ربر کے جوتے کی ہلکی سی سی درپ رپ نے مجھے احساس دلایا۔ وہ میری مسہری کی طرف آرہے ہیں۔ وہ میری پیٹھ کے پاس آکر رک گئے۔ پھر میں نے اپنی گردن پر ان کے گرم اور محبت بھرے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔

"تم سمجھدار ہو بیٹی۔" بہت دیر بعد انہوں نے اتنا ہی کہا۔ میں نے جھکی ہوئی ترستی ہوئی نگاہیں اٹھا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ پھر مڑ کر کہہ رہے تھے۔ "زہرا بے جان ہے تم جانتی ہو زہرا کو شمع سے کس قدر محبت تھی۔"

"شمع سے کون محبت نہیں کرتا ابو۔" میں دھیرے سے بولی۔

"مگر شمع پھر بھی بجھ جاتی ہے بیٹیا۔ کیونکہ اسے ایک نہ ایک دن بجھنا ہی ہوتا ہے وہ تمہاری خالہ تھی۔ تمہاری ماں کی بہن تھی۔ میری بھی کوئی نہ کوئی ضرور لگتی تھی کیا مجھے غم نہیں ہے۔ یا میں اتنا بے حس ہو چکا ہوں؟"

میں نے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا۔ "یہ میری تمہاری ماں کی،

ہم سب کی بدنصیبی تھی ۔ جو شمع جیسی لڑکی ایسے ہاتھوں میں جا پڑی، موت نے اُسے ہم سے چھین لیا ۔ مگر اب بھی وہ تمہارے پاس رہ سکتی ہے ۔" ابّو نے پھر کچھ اور نہیں کہا اور الٹے پیروں واپس نکل گئے ۔

آسمان ابھی ابھی برس کر صاف ہوا تھا ۔ اکّے دُکّے ابر کے ٹکڑے ابھی تیر رہے تھے ۔ ٹھہرے ہوئے پانی کو تتر بتر اڑاتی کار پورٹیکو میں داخل ہوئی ۔ ہواؤں کا سنّاٹا اور بھی بوجھل بوجھل سا ہو گیا ۔ میں نے آنکھیں اٹھائیں تو سامنے ابو کھڑے تھے ۔ ان کے آگے پیچھے چار ننھے منّے سہمے سہمے وجود ۔ ابّو ماحول کا سنّاٹا توڑنے کو ذرا مسکرائے اور بشاشت سے بولے ۔

" شمع کا اجالا "

انھوں نے چاروں کو دیکھا ۔ " یہ گڑیا، یہ راجہ، یہ شبو اور یہ پنکی ۔" انھوں نے چھوٹے سے پنکی کو گود میں اچھالا ۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے

" ان کے ساتھ رہنا یہ تمہاری باجی ہیں "

چاروں نے پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھنا شروع کیا ۔ ابو نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور پیار سے بولے ۔

"ناجی یہ نہ سمجھو کہ تم غمگین رہو گی تو یہ بھی مدتوں ملول رہیں گے ۔ یہ تمہارے ہیں ۔ تم یہ ہرگز نہ چاہو گی کہ یہ معصوم چہرے روتے بسورتے دکھائی دیں ۔"

میں نے باری باری سب کے چہروں کو دیکھا ۔

چھوٹی سی گڑیا جیسی گڑیا ۔ سہما سہما راجہ ۔ پھول کی طرح معصوم اور نازک شبو ۔ اور گول مٹول پنکی ۔ یہ سب میرے رحم و کرم پر میرے سہارے پر ہیں ۔

میں ہنسوں تو یہ بھی ہنسیں۔ میں روؤں تو یہ بھی روئیں کیا خالہ امی کی روح میرے آنسو بہانے سے خوش ہو گی۔ کیا وہ یہ نہ چاہیں گی کہ ان کے پیچھے بھی ان کے بچے مسکراتے ہی رہیں۔ میں ساڑی کا پلو سنبھال کر اٹھی اور گڑیا کے گال کو چوم کر مسکرا کر بولی

"صبح ناشتہ کیا تھا؟"

اس کی سہمی سہمی غمگین آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور وہ دھیرے دھیرے مسکرائی اور بولی "ایک سلائس۔"

"اور تم نے؟" میں راجہ سے مخاطب ہو گئی

"امی اسپتال میں ہیں۔ ناشتہ لگاتا کون؟"

یہ ننھے منے فرشتے ابھی تک اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اب ان کے سر پر ماں کا سایہ نہیں رہا۔ اب ان کا دنیا میں کون ہے۔ اتی کے کمزور اعضا اور بیساکھیاں میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئیں کیا وہ یہ ذمہ داری اٹھا سکتی ہیں؟ نہیں اٹھا سکیں گی۔ "ناجی یہ تمہارے ہیں" ایک آواز کہیں قریب سے کانوں میں لہرائی۔ "ناجی یہ تمہارے ہیں۔ ناجی یہ تمہارے ہیں۔" میں ننھی منی سولہ برس کی ماں۔ یہ میرے بچے ہیں، ہاں میں ان کی ہوں اور یہ میرے ہیں"۔ میں نے گڑیا کا فراک پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ راجہ کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب کیا۔ شبو اور ببلی کو ایک ساتھ چمٹا کر پوچھا

"میں کون ہوں تمہاری۔"

"باجی" وہ ایک ساتھ چلائے

میری آنکھوں میں جو رات سے اب تک خشک تھیں موٹے موٹے آنسو اتر آئے۔

میں نے ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہیں کی، ہنستی روتی میں پیار سے بولی :- "آؤ آؤ ڈرائینگ ہال میں چلیں ناشتہ تیار ہو گا۔"

امی کو مسلسل بیماریوں نے اس قابل نہ رکھ چھوڑا تھا کہ وہ گھر کے کام کاج کی دیکھ ریکھ کر سکیں۔ میرے بعد وہ کوئی بچہ بھی پیدا نہ کر سکیں۔ ایک دن چکر کھا کر زینہ پر سے گریں تو اپنا پیر بھی کھو بیٹھیں۔ دن رات وہ ایک جگہ بیٹھی یا لیٹی رہتیں۔ نوکروں کے ذمہ سارے گھر کا انتظام تھا۔ مگر اب گھر کی آبادی میں ایک دم سے اضافہ ہو گیا تھا اور چار ننھے منے بچے ہڑ دھوم مچاتے رہتے ان کے لئے تو باقاعدہ ایک نگراں کی ضرورت تھی۔ وہ سب ناجی کے بن گئے۔ تو ناجی کو بھی ان کی بن جانا پڑا۔ صبح ابھی باغ میں چڑیاں چہچہانا شروع بھی نہ ہوتیں کہ ناجی نیند سے بیدار ہو جاتی۔ سلپنگ سوٹ پر وہ گاؤن چڑھاتی ہوئی ایک ایک کے پلنگ کے پاس جاتی۔

"شبو صبح ہو گئی۔ نیکی اٹھو سویرا ہو گیا۔ گڑیا کنونیٹ کا وقت ہو رہا ہے راجہ دیکھو دھوپ نکل رہی ہے۔"

سب آنکھیں ملتے مسکراتے اُٹھ بیٹھتے اور باجی باجی کرتے اس کے آس پاس گھومنا شروع کر دیتے۔ ناجی جو اب تک اس گھر میں سمجھ دار ہونے کے باوجود بچہ سمجھ کر پرورش ہوتی آئی تھی اب خود کو بڑی ذمہ دار اور سنجیدہ محسوس کرتی ــــ نوکروں کی موجودگی کو وہ یکسر فراموش کر دیتی اور خود ہی ایک ایک کا منہ دھلاتی کپڑے بدلتی اور اپنے ہاتھوں تیل ڈالکر کنگھی کرتی، کام کرنے میں اس کے لہریے دار بالوں کے چھوٹے چھوٹے چھلے بار بار پیشانی پر آگرتے اور وہ انھیں پیچھے کرتی جاتی۔ انگریز عورتوں کی طرح بڑے بڑے پھولوں کا گاؤن پہنے۔ وہ

ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چکر لگاتی اور مستعدی سے کام انجام دیتی کبھو ایک آدھ بار خود سے بال گھما کر پیچھے پھینکتی اور بولتی۔ "میں اب اپنے بال کاٹ لوں گی؟ بچے سہم کر اسے دیکھتے تو ہنس کر بولتی۔

"ہاں یہ بار بار منہ پر آکر گرتے ہیں اور تم لوگوں کا کام کرنے میں مشکل ہو جاتی ہے ٹھا ٹھیں تیار کرکے ۔ کانونیٹ بھجوائی اور پھر بعد میں دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی غسل خانے میں پہنچ جاتی ۔ نہا دھو کر باہر آئی تو تب تک اس کے اپنے اسکول کا وقت ہو جاتا ۔

میری زندگی اب تک تنہا تنہا، ویران ویران، اکیلی اکیلی سی تھی ۔ مگر ان چاروں کی آمد نے مجھے بھی زندگی سے قریب کر دیا ۔ شام کو اسکول سے لوٹتے لوٹتے میں ان چاروں کو بھی کانونیٹ سے اٹھا لاتی اور میری زندگی کا چکر چلنا شروع ہو جاتا ۔ خالہ امی کے شوہر کوئی بھلے آدمی نہ تھے ۔ دل بھر کر انھیں جلایا اور جب وہ چار بچوں کو چھوڑ کر چل بسیں تب بھی ان کے منہ سے نہ نکلا کہ "وکیل صاحب آپ میرے بچوں کو کہاں لے کر جاتے ہیں آخر ۔"

خالہ امی، امی کی ایک ہی بہن تھیں ۔ لاڈلی اور چہیتی ۔ ان کی موت نے ان کے دکھوں میں اضافہ کر دیا ۔ ابّو باہر کے آدمی، امی بیمار، بچوں کا کون تھا سوائے ناجی کے ۔ ناجی کے دکھ سکھ ان کے اپنے دکھ سکھ تھے ۔ ناجی ان کی مسکراہٹوں اور غموں کو اپنا جان کر خوش ہوتی اور کڑھتی رہتی ۔

اسی دن سالانہ امتحان کی رپورٹ آئی اور ناجی اتنی ساری ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کے باوجود اول آئی تو چاروں جھومتے جھامتے گاتے اس کے پاس آئے اور بولے ۔

" باجی آپ پاس ہوئی ہیں تو ہم آپ کو تحفہ دیں گے۔"

باجی مسکرائی اور کھل کر بولی۔

"کیا تمہارا ایسا کہہ دینا ہی کسی تحفہ سے کم ہے۔؟"

گڑیا تنک کر بولی۔" باجی تو ہمیشہ ہماری بات کاٹ دیتی ہے۔"

باجی حیران رہ گئی اور پھر ہنسنے لگی۔ "ارے تو تجھ سے چھوٹی ہو کر مجھے

تو، کہتی ہے"۔ راجہ آگے بڑھ کر بولا "اسے تو میں نے یہ بات سکھائی ہے"

باجی بناوٹ سے ہنس کر اور کچھ چڑ کر بولی " تو نے، تو نے راجہ، بھلا کیوں؟"

راجہ بے باکی سے ہنس کر بولا" باجی ہم خدا کو پیار کرتے ہیں اور اس کی عزت

بھی کرتے ہیں عبادت بھی اگر تو کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اس سے بھلا کیا فرق

پڑتا ہے۔؟ یہ تو محبت کی بات ہے۔"

باجی اس کا کان مروڑ کر بولی ۔" اچھا اچھا ۔ مگر میں تو خدا نہیں

مجھے تو آپ ہی کہا کرو۔ میں تم سے بڑی ہوں، بھلا مہمان آئیں جائیں تو کیا

کہیں گے کہ باجی کو دیکھو انہیں ذرا سی بھی تمیز نہ سکھائی۔"

گڑیا لوٹ کر بولی " تحفہ کی بات تو الگ رہی ۔ یہ نئی بات بیچ میں نکل آئی"

"تحفہ آئے گا کہاں سے مگر" شبّو نے یاد دلایا۔

" اچھا تو رجو تو چپکے چپکے سب کو گمراہ کر رہا ہے۔" اچھا ٹھہر ذرا —

تیری شادی کردوں گی۔" باجی ہنستی مسکراتی راجہ سے مخاطب ہو گئی۔

" تم ہو گی جب ہو گی ابھی تو میں سب کا بڑا ہوں اور جو چاہوں وہ کر

سکتا ہوں"۔ اس نے شان کے ساتھ اپنی ٹائی کھینچی اور گڑیا کو زیادہ

چڑا کر بولا ۔" میں تیرا بڑا ہوں جھک کر سلام کر"

گڑیا کو تو اس بات سے آگ لگ جاتی تھی۔ جل کر بولی "بس لام وہ کریں جو تمھارا کھاتے ہوں" دونوں لڑتے لڑتے آگے پیچھے بھاگنے لگے۔ تو میں بھی اُٹھ کر ان کے پیچھے بھاگی ــــ

"ارے ارے یہ تم میرا نام بدنام کر رہے ہو۔ کیا میں نے تم لوگوں کو بس لڑنا ہی سکھایا ہے؟" ــــ راجہ باہر بھاگ گیا اور گڑیا شرمندہ سی ہو کر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ میں نے سلائیاں ہاتھوں میں تھام کر گڑیا کی طرف دیکھا۔ "دیکھ گڑیا تو لڑکی بن کر پیدا ہوئی ہے۔ گھر کے کام کاج نہ سیکھے گی تو شادی کون کرے گا تجھ سے؟"

گڑیا نے اون کا گلابی گولہ اٹھا کر اپنی گود میں دھرا اور بولی "سیکھ تو رہی ہوں باجی، دیکھئے میں نے کوٹی میں کتنا حسین ڈیزائن ڈالا ہے؟"

میں نے جُھک کر پھندوں پر نگاہ کی۔ پھر اپنی بُنائی سنبھالتی ہوئی بولی ــــ "اور تو نے کیا کیا پکانا سیکھا ہے اب تک"

"مگر باجی" وہ ہاتھ روک کر بولی "میری کس سے شادی ہو رہی ہے"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "ارے تجھے ابھی سے شادی کی دھن لگی ہوئی ہے؟ ہو جائے گی کسی سے بھی"

"پھر آپ مجھے سدا کہتی جو رہتی ہیں۔ میں سمجھی میرا دولہا بس تیار ہی ہے"

وہ بجد سنجیدگی سے بولی۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ راجہ جو ستبو اور پنکی کے ساتھ وکٹ گاڑے کرکٹ کی مشق کر رہا تھا بال اچھالتا ہوا میرے پاس آ گیا اور گڑیا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تیرے لئے دولہا ڈھونڈ لاؤں؟"

گڑیا چڑ گئی۔" دیکھا باجی! ان سے کس نے کہا تھا ٹانگ اڑانے کو؟"
میں ہنس کر اُسے دیکھنے لگی تو وہ فخر سے بولا۔ "اور ناجی تیرا دولھا بھی میں اپنی پسند سے ہی لاؤں گا۔ میری پسند پر اعتماد ہے نا تجھے؟"
میں چلّا کر بولی۔" راجہ ایسی تو تکار نہیں کیا کرتے کتنی بار تجھے کہا کہ میں بڑی ہوں۔"
زن سے اس نے بال پھینکا اوپر ہی اوپر گھومتا ہوا وہ کھٹ سے میرے کندھے پر آ لگا وہ سراسیمہ ہو کر میرے پاس آیا اور بولا۔ "ناجی میں نے جان کر تو نہیں مارا تو غصّہ تو نہیں ہو گئی نا مجھ سے؟"
میں نے ہنس کر اسے دیکھا اور لپٹا کر چوم لیا۔" میں تیری ٹیچر سے کہوں گی کہ اسے قصور کرے نہ کرے روزانہ دو جوتے مار دیا کیجئے۔"
دن کس قدر جلد گزرتے ہیں۔ بگلوں کے پَروں کے مانند جو ابھی یہاں تھے اور ابھی وہاں۔ ابھی ابھی آپ نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تھا تو وہ آپ کے سر پہ تھے اور ابھی وہ نگاہوں کی زد سے بھی نکل گئے ہیں۔ اس دن میں نے روز کی طرح شبّو، بنگی، گڑیا اور راجہ کو اٹھایا تو راجہ نے نیند بھری آنکھوں سے شرارت کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ صبح ہی صبح وہ بے تکی ہانکنے لگا۔
" ارے ناجی تو چوڑیاں نہیں پہنتی؟"
میں ہاتھ جھٹک کر بولی۔ ارے چھوڑ نہیں پہنتی تو تیرا کیا بگاڑ لیتی ہوں۔" مگر اسی لمحہ مجھے احساس ہوا کہ میرا ہاتھ اب کسی ہلکی پھلکی گرفت میں نہیں ہے، زچ ہو کر میں بولی۔" راج دیکھ تو مجھ سے طاقت نہ آزما۔ غصّے میں آ جاؤں تو تجھے اٹھا کر پٹک ہی دوں۔ ہاں۔"
وہ ہنس کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔" وہ بعد کی بات ہے۔ میں تجھ سے پوچھ رہا تھا چوڑیاں

کیوں نہیں پہنتی ؟"

میں نے اپنے سونے ٹھونٹے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور ایک دم میرے دل میں احساس جاگا کہ ذمہ داری انسان کو کس قدر بوڑھا اور بے حس بنا دیتی ہے ابھی تک میری الماری میں ہری نیلی پیلی ساڑیوں کے ڈھیر تھے، چوڑیوں کے انبار تھے، مگر میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا۔ سونے ہاتھ، سونے کان، سونا گلا، اور سرمئی رنگ کی سادہ ساڑھی کہنیوں تک آستینوں والا بند گلے کا بلاوز اور بکھرے بکھرے بال، گاؤن کو میں اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر بولی، کل ہی تو اتاری تھیں تو نے دیکھی نہ ہوں گی۔"

"میں نے نہیں دیکھیں یا تو نے نہیں پہنیں۔؟" وہ اچانک بستر پر ایڑیوں کے بیٹھ گیا۔ اور میری انگلیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "موٹر میں بیٹھ کر ہم سڑک سے جاتے ہیں تو عورتیں ملتی ہیں۔ لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں ایسے اچھے اچھے کپڑے۔ اتنے اچھے زیور کہ کیا کہوں ناجی، تو بھی تو آخر لڑکی ہے (ناجی یہ تمہارے ہیں) پہنتی کیوں نہیں، کیا بوڑھی ہو گئی ہے تو؟"

میں جاگ کر بولی "تم سب میرے ہو نا؟"

وہ تنک کر بولا "میں کب کہہ رہا ہوں کہ ہم تیرے نہیں، مگر میرا سوال تو دوسرا ہی تھا۔"

"اچھا اچھا" میں پیار سے لپٹا کر بولی "تو بڑا ہو کر لائے گا تو بہت کچھ پہنوں گی۔"

بچے اب بڑے ہو گئے تھے اور اسی رفتار سے میری ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو چلا تھا۔ میری تمام تر کوشش تھی، کہ بچے کسی بات سے پیچھے نہ رہ جائیں اور دنیا والوں کو یہ موقع نہ مل جائے کہ دیکھا، بن ماں

کا حشر کانوینٹ سے بچے ہوئے وقت میں شبّو اور گڑیا کو گھرداری سکھاتی۔ بنائی سلائی، کھانا پکانا، اور دونوں لڑکوں کی تعلیم کی طرف توجہ دینی پڑتی تھی۔ شبّو کو جغرافیہ بالکل ناپسند تھا۔ کبھی پیار دلار کبھی گھڑکی، جھڑکی سے پڑھانا پڑتا۔ ننکی صاحب کانوینٹ سے غائب رہنے کی روزانہ کوشش کرتے۔ پھر میں گھر پر بچوں کا اردو بھی پڑھاتی، راجہ کچھ کا کچھ الٹ پلٹ سمجھ بیٹھتا۔ اور پھر بڑے بھائی کی قیادت میں سبھی کی عقل الٹی چلنے لگتی۔ پڑھاتے پڑھاتے جھنجھلا جاتی۔ میرے اپنے کام، ان کی ذمہ داریاں اور پھر کالج کا بار، تو میرا دماغ چکرانے لگ جاتا مجھے لگتا میں بالکل بوڑھی ہو کر رہ گئی ہوں۔

اس دن جب ٹی ٹی اسپتال میں کوئی بڑا سا جلسہ تھا۔ ابو کے ساتھ مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ میں تیار ہو کر نکلی تو ابو ذرا حیرت سے بولے۔ "ناجی بیٹیا یہ تم ہ" وہ اتنا کہہ کر رہ گئے۔

میں نے حیرت سے اپنے آپ کو دیکھا۔ ابھی ابھی تو میں خود کا آئینہ میں جائزہ لے کر آئی تھی، گندمی رنگت لہریئے دار بالوں کا گردن سے کافی اونچائی پر جوڑا۔ لمبی پلکوں والی آنکھیں، جو سرمہ کاجل سے بے نیاز تھیں، اونچا سا قد اور سفید ساڑی۔ سفید ہی بلاوز میں اپنی چال ڈھال سے سچ مچ بڑی جچ رہی تھی۔ ابو کے اس طرح اچانک رک جانے پر میں خود حیرت سے بولی۔

"کیا ہوا ابو؟"

"بیٹی تم یوں بدل کیسے گئی ہو۔ جانتی ہو اس سے پہلے میں نے تمہیں جب بھی دیکھا جھلمل لباس اور جلملاتے زیور میں ہی دیکھا۔ تم نے یہ جوگ کب سے لیا" وہ ذرا مسکرائے۔

اتو نے یوں احساس دلانے پر میں نے اچانک یہ محسوس کیا کہ مجھ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آگئی ہے۔ مگر اسی لمحے سب بچے باہر نکل آئے اور میں انھیں تھپتھپاتی ہوئی گاڑی میں چڑھ گئی۔

پھر یہ ہوا کہ ابو بھی ایک دم بیمار پڑ گئے۔ امی بھی سدا کی مریض، چار، چار بچوں کا بار، اور گھر بار کی ذمہ داری۔ میرا بی۔اے کا آخری سال تھا۔ مگر میں نے یہی مناسب جانا کہ گھر بیٹھ جاؤں۔ کالج جاتے ہوئے اتنے سارے کام ہرگز ممکن نہیں میں نے سوچا اور اس پر عمل بھی کیا۔

ایک دن دو دن اور تین دن گزر گئے، چوتھے دن راجہ میرے پاس آیا۔ اور شرارت سے گھٹنوں کے بل جھک کر بولا۔ "ناجی بچوں کو سکھاتے سکھاتے خود ہی کالج کو بنک مارنے لگی نا۔؟"

میں نے سفید اون میں سرخ اون کے پھول بنتے بنتے سر اٹھایا، پھر بے نیازی سے بولی۔

"میں نے کالج جانا چھوڑ دیا ہے۔؟"

وہ تیزی سے اُٹھ بیٹھا، اور بگڑ کر بولا "مگر کیوں؟ یہ تو تیرا آخری سال تھا نا ناجی؟"

اب کے میں نے بھی ہاتھ روک لئے۔" میرے سامنے بی اے سے بھی بڑا فائنل تھا!" وہ چڑ گیا۔ کچھ اداس ہو گیا۔ پھر رُکتے جھجکتے بولا " تو نے یہ سب کچھ ہمارے ہی لئے کیا ہے نا، ؟"

میں ہنس کر بولی "کسی کے لئے بھی نہیں کیا ہے اپنے دل کے لئے کیا ہے، راجہ۔ تو خواہ مخواہ دل دکھا رہا ہے۔"

اس نے پتلون کی جیب میں ٹھونستے ہوئے ہاتھ نکال لئے اور دکھ سے بولا۔ "ناجی، جی چاہتا ہے آسمان بن کر تجھ پر تن جاؤں اور تجھے بالکل زیر کر لوں زمین بنا دوں پھر دیکھوں تو کیسے میرا کہنا نہیں مانتی۔"

میں ہنس کر بولی۔ "باپ رے آسمان؟ اور اب کیا تو آسمان سے کم ہے۔"

ان دنوں وہ اس قدر اونچا ہو گیا تھا کہ بات کرتے میں مجھے سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ ذرا سا جھکا، پھر خواہ مخواہ مسکرانے کی کوشش میں سچ مچ رو پڑا۔ پتہ نہیں اس رات کیوں مجھے اس قدر رونا آیا۔ میرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا دل کا سارا درد آنکھوں میں سمٹ آیا۔ اور پگھل کر بہتا ہی رہا۔ مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا تھا کسی نے جبر نہیں کیا تھا۔ یہ زندگی میں نے اپنے ہاتھوں بنائی تھی اب رد کیوں رہی تھی میں؟ ایک دم سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ آخر کار میں ایک عورت ہی تو تھی نا۔۔۔؟ میرے آس پاس نیچے ہی بچے تھے۔ راجہ جو سب سے بڑا تھا وہ بھی چار سال چھوٹا۔ ایک عورت کیا چاہتی ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور خود ہی جواب پا لیا۔ عورت ایک ساتھی چاہتی ہے۔ جو اس سے محبت کرے۔ جو ہر بات میں اس سے اونچا ہو۔ بڑا عظیم ہو جسے وہ پیار بھی کر سکے پوج بھی سکے۔ مجھے یہ جان کر ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ دل کی آواز سن کر مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا۔ "ناجی بی بی تم ایک محبوب چاہتی ہو۔ بہرحال تم ایک حوا ہو اور تمہیں آدم کی تلاش ہے۔"

دن اس قدر بے رنگ کے پھل رہے تھے۔ پہلے جن کاموں کو انہماک سے کیا کرتی تھی اب کس قدر بے دلی سے انجام دینے لگی تھی مگر میں نے اپنے فرض میں کبھی کوتاہی نہیں آنے دی۔ بچوں پر یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ زندگی سے میری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ بظاہر اسی انہماک سے مشغول رہتی۔

اس دن میں حسب معمول بنائی میں الجھی ہوئی تھی کہ چاروں دھم دھمات ہوئے آ پہنچے۔ ان کی عمریں کس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ مگر ویسے ہی بچے سے تھے۔ اور یونہی لاابالی جیسے پتہ نہ ہو کہ دن کس قدر بدل گئے ہیں۔ راجہ آیا اور جھک کر میرے ہاتھوں میں الجھے اون کو دیکھنے لگا۔

"کیا بن رہی ہے ناجی۔؟ جب تو ..." پتہ نہیں وہ آگے اور کیا کہتا مگر ایک دم میرے ہاتھ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور حیرت سے بولا۔

"ارے ناجی.... ! یہ اپنے ہاتھ کی پشت دیکھی کبھی۔"

"کیا ہوا؟" میں لاپروائی سے بولی۔

"تیرے ہاتھوں کی رگیں ابھرنے لگی ہیں جیسے بوڑھوں کی ہوتی ہیں نا۔؟

میں اس قدر زور سے چونکی کہ سارا جسم ہل گیا۔ راجہ نے مجھے غور سے دیکھا تو میں بات ٹالنے کو ٹکی پر چڑھ گئی، جو مسلسل گیند اچھالے جا رہا تھا

" میں بوڑھی ہو رہی ہوں" میں نے دھیرے سے کہا۔ "اب میں شادی کرنا چاہتی ہوں"

اب اس کے چونکنے کی باری تھی۔ وہ اچھل کر بولا۔

" شادی کرنا چاہتی ہیں آپ ؟"

یقیناً اسے چونکنا چاہیئے تھا کیونکہ میں نے آج تک اس کے سامنے ایسی بات نہ کہی تھی۔

" ہاں!" میں تھکے تھکے انداز سے کرسی کی پشت سے لپٹ گئی

" اب میں بہت تھک گئی ہوں راجہ، چاہتی ہوں کہ مجھے کوئی سہارا دیدے۔"

"میری آنکھوں کے سامنے غیر ارادی طور پر ارشد گھوم گیا۔ جوان دنوں روزانہ ابو سے کام سیکھنے آتا تھا۔

راجہ خوش ہو کر بولا "کرے، مگر دیکھ تیرا دولہا میں ڈھونڈوں گا۔"
میں اپنی صفائی کے طور پہ بولی "راجہ تو بچہ ہے شاید ان باتوں کو نہ سمجھے
مگر شاید کبھی تو نے دیکھا ہو کہ پھول پہ کالا بھونرا کیسے منڈلاتا ہے۔ مگر مجھے تجھ سے
یہ سب کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔ راجہ۔ مگر یہ باتیں اگر میں ہی کہتی
تو ایسا انجان ہی جاتا۔؟"

اور یہ بات کس قدر غیر محسوس طریقے پر رونما ہوئی۔ چائے کی پیالی دونوں
ہاتھوں میں تھامے سر کی جنبش سے پردہ ہٹاتی ہوئی دیوان خانے میں داخل ہوئی
تو پردہ پیالی میں الجھا اور پیالی زمین پر اور چاء سب کپڑوں پہ اور میں خود ارشد
کی بانہوں میں۔

"ناجی سنبھل کر چلا کرو۔ وہ تو خیر ہوئی کہ تم جلیں نہیں، اگر جل جاتیں تو....؟"
"تو کیا ہوتا؟" میں نے بے بسی سے پوچھا۔
ارشد نے کچھ نہیں کہا۔ ٹوٹی ہوئی پیالی کی کرچیاں چنتے چنتے بس اتنا
ہی تو کہا تھا

"ناجی سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ کیا سبھی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں کھول
کر سمجھایا جائے۔"

"ناجی سمجھا کرو۔ کوشش کیا کرو"۔ ناجی، ناجی کانوں کے پاس اس قدر
زور زور سے کون چیخ رہا تھا۔"

اور پھر برسات کے دن تھے۔ وہی سیاہ راتیں۔ وہی صاف
شفاف دن۔ ہواؤں میں وہی بوجھل پن، سناٹا کبھی ٹوٹتا تو بس مشین
کی گھرر گھرر سے۔ باہر بیٹھا درزی دن بھر کھٹ کھٹ مشین چلائے جاتا... بچے تو دینٹ

چلے جاتے اور پھر میں پرانے دنوں کی طرح سوچا کرتی ۔ ہری ساڑی پر کون سا بلاؤز جچے گا ۔ گردن سے اونچائی پر جوڑا باندھوں گی تو یہ لمبے آویزے برے تو نہیں لگیں گے ۔

بچے خوش تھے کہ گھر میں شادی ہوگی ، باجے بجیں گے ، انھوں نے اپنے ہوش و حواس کے عالم میں کبھی شادی کا ہنگامہ نہ دیکھا تھا ۔ کبھی کبھار مجھے خیال آتا کہ کیسی دنیا چھوڑ کر میں جا رہی ہوں ۔ کیا میں ماضی کو بھلا سکوں گی ؟ بچوں میں میرا جی نہ لگے گا ۔ میرے دل کے ٹکڑے ہونے لگتے تو میں یہ کہہ کر خود کو بہلا لیتی کہ آخر سبھی لڑکیاں گھر چھوڑ کر جاتی ہیں ۔ کیا میں اکیلی ہی جا رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔

راجہ نے سب کو کسا یا کہ باجی نے سب سے پہلے اپنی وہ تحفہ دینے والی اسکیم کو یوں ختم کر دیا تھا ۔ مگر اب تو اس کی نہ مانیں گے ۔ اس لئے سب اکیلا ایک تحفہ دینے کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ گڑیا دن بھر مُنائی کرتی رہتی ۔ ششبو الگ مصروف نکی الگ مشغول ۔ اور راجہ دن بھر غائب ۔ میں نے بار بار سب کو منع کیا کہ محبت الگ چیز ہے اور تحفے تحائف الگ ۔ مگر میری مانتا کون ۔ میرے دلہن بننے کا وقت آ گیا ۔ اور میں بن بھی گئی ۔ اور آج سارے پرانے رشتے ٹوٹ رہے تھے ۔ میں آنکھیں بند کئے پلکیں جھکائے بیٹھی تھی ۔ گڑیا نے گھونگھٹ اٹھایا اور رندھے گلے سے بولی ۔

"باجی آپ ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہیں ؟"

میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا غم کی گہری چھاپ اس کے چہرے پر نظر آ رہی تھی ۔ میں نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں ۔

وہ سہمے سہمے بولی " باجی ! اب آپ ہمیں دیکھنا بھی نہ چاہیں گی ؟"

میں نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ اس نے اپنی کچوں جیسی آنکھ

جھلا بھلائیں اور بولی "باجی ہم نے بڑے ہال میں آپ کا جہیز سجایا ہے۔ چل کر دیکھئے نا۔"

جاتے جاتے میں کس کس کا دل توڑتی۔ دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی میں جہیز والے کمرے میں پہنچ گئی، ڈھیر سارے جہیز کو چھوڑ کر ایک کونے میں تحفوں کے لئے میزیں سجائی ہوئی تھیں۔ شبّو نے میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔

"باجی"! وہ بھرائے گلے سے بولی

میں نے اسے لپٹا لیا۔ وہ روتی ہنستی مجھے اپنی میز تک لے گئی اور پھر بولی "میں نے آپ کے اور ارشد بھائی کے لئے یہ تحفہ چنا ہے۔"

میز پہ تاج محل رکھا ہوا تھا، جس میں بلب جگمگا رہے تھے۔ میری آنکھیں بھر گئیں۔ گڑیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "باجی میں نے آپ کے منے کے لئے یہ سوئٹر موزے اور ٹوپی کا یہ سٹ بنایا ہے۔"

ہلکے ہرے رنگ کا اون اور ننھے منے موزے، ٹوپی، سوئٹر، میرا جی اندر سے پھول کی مانند کھل گیا۔ چہرے پہ ہنسی آئی اور ایک دم آنسو نکل پڑے۔

پنکی نے میرا سرخ پلو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ "باجی میں نے اسکول میں یہ کام سیکھا تھا۔"

"آپ کے ننھے کے لئے سواری۔" لکڑی کا گھوڑا ہرا رنگ کیا ہوا۔ ذرا دھکے سے آگے پیچھے جھولنے لگتا۔

اور بھی دوسری میزوں پر تحفوں کے ڈھیر تھے۔ مگر کونے والی آخری میز خالی تھی

"راجہ نے مجھے کیا دیا؟"

میرا بجھا بجھا سا دل رونے لگا۔ کیا راجہ کا فرض نہ تھا کہ بھولوں کی طرح

وہ بھی مجھے کوئی تحفہ دیتا — آخر یہ تو سوچتا کہ میں نے اپنی جوانی اپنی زندگی کے بہترین دن کس طرح ان لوگوں کی نذر کئے۔ کیا میری قربانیاں، میری محبت ایک تحفے کی بھی حقدار نہ تھی۔ کیا وہ چاہتا تو اپنے جیب خرچ سے میرے لئے ہلکا پھلکا تحفہ نہ خرید سکتا تھا۔؟

"راجہ کہاں ہے؟"

میں نے بھرائی آواز سے پوچھا۔

تھوڑی دیر میں تینوں راجہ کو گھسیٹتے ہوئے لے آئے

اس کے بال بکھرے تھے چہرہ سرخ اور آنکھیں موٹی موٹی۔ وہ آیا تو میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور رندھے ہوئے مگر پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"راجہ تو نے مجھے کچھ بھی نہ دیا۔"

اس نے آنکھوں پر دھرے ہوئے اپنے ہاتھ تیزی سے ہٹائے اور میری گردن کے گرد حائل کر دیئے۔ بکھری بکھری سانسوں کے درمیان وہ رکتے رکتے بولا۔

"ناجی۔! میں تجھے کیا دے سکتا تھا؟ میرے پاس تھا ہی کیا۔؟ — جو کچھ تھا وہ تو میں دے ہی چکا۔"

اس نے زور کی سسکی لی اور آنسوؤں کی گونج میں اک مرد بن کر بولا —

"ناجی تو میرا دل نے کر بھی یہی کہتی ہے کہ میں نے تجھے بہن منے کچھ نہیں دیا۔؟"

تیزی آواز

جوتے کھٹ کھٹاتے حنیف میاں گھر میں داخل ہوئے۔ آنگن میں تخت پر جانماز بچھائے مریم عصر کی نماز پڑھنے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو اسے ناگواری سے دیکھا اور بڑبڑائے۔

"کم بخت جب دیکھو تب لگی ہے عبادت میں۔ ایسا ہی اس کا خدا بڑا دعائیں سننے والا تھا تو پھر بچہ کیوں نہ دے دیا۔"؟

چق اٹھا کر پھر سے مردانے میں چلے گئے۔ جوتے اتار کر زور سے کونے میں پھینکے۔ کوٹ اٹھا کر پلنگ پر اچھال دیا اور خود بھی پلنگ پر آڑے آڑے لیٹ گئے۔ کلائی کی گھڑی یوں آنکھوں کے سامنے کرلی جیسے کسی پیارے کا آپریشن ہو رہا ہو اور پل پل کی خبر رکھی جاتی ہو۔ سیکنڈ کے کانٹے نے تین چکر لگائے۔ مطلب تین منٹ پورے ہو گئے۔ تین منٹ ہوتے ہی پھر اٹھے اور چق اٹھا کر زنانے میں آ گئے۔ دیکھا تو مریم تخت پر بیٹھی چھالیہ کترنے لگی تھی۔ نماز ختم ہو چکی تھی۔

"اگر اب بھی نماز ختم نہ ہوئی ہوتی تو تخت ہی الٹ دیتا۔" مریم نے سہم کر کہا۔

تم جلدی ایسی بات تم کہتے ہو جی۔ خدا کی شان میں یوں کلمۂ کفر نہیں نکالتے۔"
"ہونہہ چل بڑی آئی وعظ سنانے والی"
"ہوئے کافروں کی صحبت میں بیٹھے بیٹھے آپ بھی کافر ہوئے جارہے ہیں۔"
"اونہہ اچھا اچھا" میں کافر ہی سہی تُو تو نمازن ہے۔ مسلمان ہے۔" مریم اب کچھ
منہ سے کچھ نہ بولی۔ منہ پر ہوئے ہوئے تھپڑ مارنے لگی۔
"خدا ان پر رحم کیجو۔ ان کی تو آنکھ بند ہے۔ ان کا گناہ میرے سر ڈال دیجو۔
سوچتے نہیں کس نے پیدا کیا۔ کس نے پالا۔ کس نے رزق دیا ہے۔"
"توبہ، توبہ، توبہ، توبہ۔"

"توبہ توبہ" مریم نے دعا مانگ کر جلدی سے منہ پر ہاتھ پھیرے، کانوں
پر ہاتھ مار کر ہوئے ہوئے توبہ توبہ کہا۔ کرتے کے گلے میں منہ ڈال کر زور سے
سینے پر سانس پھونکی اور جھٹ صحن میں اچھل کر ماں سے بولی۔
"اجی اماں۔ ہم ذرا خالہ بی کنے جا رہے ہیں۔" اماں چولھے کے پاس
روٹیاں سینکتی بیٹھی تھیں۔ دھوئیں سے پٹ پٹاتی آنکھیں کھول کر مریم کربٹی
کو دیکھا اور وہیں سے چلا کر بولیں۔
"اری نامراد۔ گیارہ برس کی لوٹھا ہو گئی۔ کسی کام میں، نہ دھام میں۔
رات دن گلی کے پوتوں کے ساتھ ہی ہاہا ہے۔ اری کلموہی کوئی بر نہ پلے گا
کبھی منحوس ماری شکل بھی دیکھی ہے آئینہ اٹھا کر۔ خالہ بی کنے جا رہے ہیں۔
کیا کرے گی خالہ بی کنے جا کر۔"
مریم نے زمین پر پیر پٹخنے شروع کر دیئے۔" اوں اوں۔ اوں اوں
جب دیکھو تب کہتی ہیں مجھے کام نہیں آتا۔ کام نہیں آتا۔ روٹیاں تو اتنی اچھی

پکاتی ہوں گول گول ذرا بھی ٹیڑھی نہیں ہوتی۔ سالن تو بوا سے اچھے پکا لیتی ہوں۔ چاول ایسے پھریرے پکاتی ہوں۔ اور یہ کرتا تو میں نے خود سیا ہے۔ جب دیکھو تب۔ اوں اوں۔"

"لو غضب خدا کا دیکھو۔ گن نہ ڈھنگ اوپر سے زبان ایسی لمبی" اٹھیں اور چولھے سے جلتی لکڑی اٹھا دھن دھنک ڈالا۔

مریم کو آنا جانا تو سب تھا مگر بیٹی کی شادی کے وقت اس کی صورت بھی تو دیکھی جاتی ہے۔ ایسا تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہوگا کہ محض گن دیکھ کر ہی سسرالی بہو بیاہ کرے جائیں۔ گن ڈھنگ اپنی جگہ۔ نک سک اپنی جگہ۔ ماں کو کیسی بھولی بھی بیٹی اُٹھے تو کیسے اٹھے۔؟ یہ تو ہونے سے رہا کہ خود ہی منہ سے کہتی پھریں۔

"اے بہن میری بیٹی بڑے کام کاج کی ہے۔ صورت نہیں تو کیا ہے۔ اُس کے اوصاف تو دیکھو۔؟"

بدصورت بیٹیوں کے نصیب جیسے ہوتے ہیں ویسے ہی مریم کے بھی ہوئے۔ پہلے تو کوئی پیام ہی نہ آیا۔ آیا تو حنیف میاں کا۔ کہ پہلے ہی سے دو دو بیبیاں کھائے بیٹھے تھے۔ مریم کی عمر بارہ تیرہ برس تھی۔ ان کی تیس سے اوپر۔ اگر دیتے وقت جی کڑھاتے تو پھر مریم بی کا اللہ ہی حافظ تھا۔ آنکھ بند کر کے بیٹی لوٹ دی۔

حنیف میاں کو اٹھائے گھونگھٹ سے اپنی بی بی پسند نہ آئی۔ پہلی بار جب شادی ہوئی تھی تو حنیف میاں کی بیوی ایسی تھیں کہ میدہ چھپا دو اور انھیں نکالو۔ دوسری بی بی بھی قسمت سے اچھی ہی ملیں۔ یہ بھی گوری چٹی تھیں! اتنی گوری کہ ساروں میں یہ بات مشہور تھی۔ کہ ایک بار نفیسہ بیگم باورچی خانے میں پاؤں پسارے بیٹھی تھیں کہ بلی نے آکر پنڈلی کا بوٹا ہی توڑ لیا۔ وہ سمجھی شاید

گوندھا ہوا میدہ رکھا ہے۔ رئیسہ بیگم کے سامنے پہلی بی بی کا خیال انھیں بھول کر بھی نہ آیا۔ اور جب تک پہلی بی بی زندہ رہی واری نیاری ہوتے رہے مگر مرد کی فطرت تو بچے کی فطرت ہوتی ہے۔ نیا کھلونا مل جائے پرانے کو بھول کر بھی یاد نہیں کرتا۔ دونوں بیبیاں کیا تھیں جیسے چاند گھر میں پھرتے چلتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں کوئی کیا جچتی۔؟ اور خود حنیف میاں دفتر میں نوکری کرتے تھے۔ اور ناک ذرا اونچی رکھتے۔ کوٹ پتلون بھی پہنتے۔ اور موج آتی تو شیروانی پر چپت پاجامہ بھی۔ آس پاس کے گھروں میں یہ پہناوا بھی کم ہی کم تھا۔ بڑی اونچی گردن اٹھا کر چلتے۔ کسی کسی مرد کی قسمت ہی ایسی تر پٹ ہوتی ہے کہ لاکھ شادیاں رچاتا جائے اور گھر خالی ہوتا جائے۔ اور یوں بات مشہور ہو جائے تو پھر بے چارہ ہتیا ہی پڑ جاتا ہے۔

"بیوی ہنپتی نہیں۔ منحوس مارا ہے موا۔"

ایسے میں لاکھ کماؤ پوت ہو۔ لوگ بھی بیٹی دینے سے کتراتے ہیں۔ پڑھا لکھا ہو چار پیسے کی جمع جتھا بھی ہو تو کیا ہے۔ زندگی تباہ کرنے سے تو رہے۔ ادھر ان کے بارے میں بھی یہی مشہور ہو چلا تھا کہ "میاں کی بیوی بچتی نہیں۔ ایسے منحوس مارے ہیں" اور ادھر مریم کو کوئی بر ہی نہ پلٹتا تھا۔ ایسے میں ان دونوں کی قسمت کا میل تو ہونا ہی تھا۔ ادھر حنیف میاں کی سبت آئی نہیں کہ ماں باپ نے ہاں کر دی۔ اور ہاں کی نہیں کہنے لگے ہاتھوں شادی بھی رچادی۔ بیچ میں لگائی بجھائی کرنے والے بھی تو کم نہیں ہوتے لاکھ حنیف میاں منحوس مارے تھے پھر بھی کوئی جا لگاتا کہ ایسی ایسی بدصورت لڑکی ہے تو صاف پلٹ جائے۔

مریم کے دل میں اپنی بدصورتی کا احساس اتنا شدید نہ تھا۔ ممکن تھا کہ

حنیف میاں کی بھی اگر یہ پہلی عورت ہوتی تو انھیں بھی نہ ہوتا۔ مگر وہ پہلے ہی دوچار اپنے آنگن میں چھپائے بیٹھے تھے۔

صورت دیکھ کر بجھ گئے۔ اور نفرت کا پایہ اسی دن سے بڑھ گیا۔ مگر ادھر مریم تھی کہ میاں کو دل و جان سے چاہنے لگی۔ بچپن ہی سے بد صورتی کا چرچا سُنتی آئی تھی۔ شادی کی عمر لگی تو ایسی ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ بیچاری گھبرا گھبرا جاتی تھی۔

"کبھی شادی بھی ہوگی میری؟" اپنے آپ میں سوچے جاتی۔ اتنی بڑی عمر بھی نہ ہوئی تھی۔ مگر آس پاس والوں نے اس قدر بولا دیا تھا کہ اس کی ساری زندگی ایک مرد کے تصور سے وابستہ ہوگئی۔ جو کالا ہوتا۔ نکٹا ہوتا۔ جواری ہوتا۔ شرابی ہوتا۔ رنڈی باز ہوتا۔ مگر اس کا اپنا شوہر ہوتا۔ کہ وہ مرد والی کہلاتی۔ بچے والی کہلاتی۔ اور جب سسرال سے اپنے کالے پیلے بچے کو لیکر لوٹتی تو بڑے تمکنت اور غرور سے اسے اپنی مانڈھی پر لٹا کے اس کے منہ میں اپنی چھاتی دے کے ماں سے اپنے میکے کی باتیں پوچھتی۔ آئے گئے کی خبر لیتی۔ اور ماں بھی اپنی بیاہی بیٹی سے کسی اہم کام میں رائے لیتی۔ ورنہ اب تو جو تم بیزار کے سوا کچھ ملتا ہی نہ تھا۔ "شادی ہوگی تو یہ ہوگا کہ کسی بات میں گنائی جاؤں گی"۔

اور پھر یہ ہوا کہ کسی بدصورت کالے کلوٹے، شرابی کبابی مرد کی بجائے حنیف میاں اس کی زندگی میں داخل ہوگئے۔ جہاں ایک حبشی کا تصور تھا اس کی جگہ ایک بانکے اور خوبرو سے شہزادے نے لی۔ مریم کا دل کیسے نہ لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ بن دا موں غلام ہوگئی۔

مرد کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہر اُس چیز کے پیچھے دوڑتا ہے جو اس سے

دُور بھاگے۔ جو آئی آپ اس کے قریب آئے وہ اس کے پیچھے کیا بھاگے گا۔ بلکہ خود ہی منہ موڑ کے بھاگ کھڑا ہوگا۔ مریم کا حشر تو یہ ہوا کہ بھوکے کو ملیدہ مل گیا۔ حنیف میاں ہی تو سب کچھ ہے۔ وہ آنکھ اوجھل ہوئے کہ دنیا کا نہ ہو گیا۔ ہر کام آگے کے آگے کر دیتی۔ دفتر جانے کو اُٹھتے تو داڑھی مونڈنے کو کٹوری میں گرم پانی لاکر رکھ دیتی۔ یہ داڑھی مونڈ کر اٹھتے تو جب تک حمام میں کپڑے لٹکا دیتی۔ نہا کر نکلتے تو دسترخوان لگا دیتی۔ کھا کر اُٹھتے تو دودھ کا پیالہ پکڑا دیتی۔ دودھ پی لینے تو جوتے کے تسمے باندھنے بیٹھ جاتی۔ تسمے باندھ چکتی تو خود ہی لپک کر سائیکل باہر نکال لاتی۔ اور مُسکرا کر پوچھ لیتی۔

"آج دو بجے کھانے کے لئے کیا بھجواؤں؟"

"تیرا سر" وہ چڑ کر بول اٹھتے۔ اس وقت انھیں مریم کی مسکراہٹ زہر لگتی۔ جانے کس نے ان کے پلّے باندھ دیا تھا اُسے۔ سدا مسکرائے سدا کام بنیڑے جاتی۔ کبھی تو ایسا نہ ہوا کہ وہ بھی اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے روٹھی اپنی پڑی ہو۔ اور منانے کی نوبت آئی ہو۔ کبھی تو ایسا نہ ہوا کہ ہاتھا پائی بھی ہوئی ہو۔ مریم کی سمجھ سے تو یہ بھی میاں کی خوشنودی ہی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ مرد چلاور ہوتا ہے۔ دیوانہ۔ چاند کے پیچھے لپکنے والا۔ ہاتھ آئی چیز سے نفرت کرنے والا۔ حنیف میاں کا دل اس کی انہی باتوں سے جل جل جاتا۔ اور مریم وہ تو پہلو انتظار بنی رہتی۔ میاں کے ماتھے پر شکن دیکھی اور اس کی دنیا تیرہ و تار ہوئی وہ یہ خوب سمجھتی تھی کہ میاں جو کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ اس کی بدصورتی کے علاوہ اور کوئی وجہ ہی نہیں۔ وہ چاہتی اپنی بدصورتی کی کمی اپنے کام کاج اپنی خدمت، اپنی محنت، اور اپنی محبت سے پوری کر دے۔

میاں بی بی کی باہمی چپقلش کو اولاد دُور کر دیتی ہے۔ کیسے ہی جھگڑالو اور کٹے کٹے میاں بی بی ہوں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو دونوں آپ ہی آپ مل جاتے ہیں۔ بچے کی پیدائش بچھڑے دلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس کا وجود کسی سورج سے کم نہیں ہوتا۔ جو اندھیرے میں جھما جھم اجالا بکھیر دیتا ہے۔ مگر مریم کے آنگن میں یہ سورج بھی نہ چمکا۔ میاں کی چاہ میں وہ تو ایسی کھوئی تھی کہ کبھی بچے کے پیار کی تمنا جاگی ہی نہیں۔ ہاں مدتوں بعد احساس ہوا کہ بچہ ہو جاتا تو اچھا ہی ہوتا۔ وہ بھی یوں کہ اس پڑوس کی بڑی بوڑھیاں احساس جگانے لگیں۔ اور شام ڈھلے تو وہ بھی دیکھتی تھی کہ کیسے محلے بھر کے باپ اپنی اپنی اولاد کو بیٹھ سر پہ بٹھلائے گھوڑے گدھے بن رہے ہیں۔ کلک رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ اور ایسے میں حنیف میاں دفتر سے آکر پھر دفتر ہی کے کاموں میں مشغول ہوتے یا فرصت رہتی تو مریم کو بن بات گالیاں بکتے رہتے۔ پیار کے دو جملے بھی ان کی زبان سے نہ نکلتے۔ مگر مریم کبھی محسوس ہی نہ کرتی۔ مرد کا تصور اس کے پاس ایسا ہی تھا جیسا خدا کا۔ کہ سُنے نہ سُنے سُنائے جاؤ۔ پوجا قبول کرے نہ کرے پوجے جاؤ۔ بچپن ہی سے تو جھڑ جھڑ سنتی آئی تھی۔ سائے سے دھوپ میں آتی تو ذرا تپش محسوس کرتی۔ یہاں تو سدا سے ہی دھوپ ہی دھوپ تھی —— اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ سایہ کیا ہوتا ہے۔ پیار کیا ہوتا ہے۔ محبت کیا ہوتی ہے۔ کوئی اس کا اپنا دل چیر کے دیکھتا تو سہی کہ حنیف میاں کے لئے کتنا پیار پھٹا پڑ رہا ہے۔!

دنوں سے ہفتے، ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال بنتے اور گزرتے گئے اور اب حنیف میاں کی شادی کو اتنے اتنے بھی نہیں پندرہ

بلیس گذر گئے تھے۔

حنیف میاں کے اس عمر میں بھی کیا ٹھاٹھ تھے۔؟ بڑھاپے کا تو دور دور پتہ نہ چلتا۔ اوپر سے روز روز داڑھی مونڈی جاتی۔ مریم کے ہاتھ کے مرغن اور طاقت بخش کھانے تھے کہ یہ تو تین تین بیویاں برتنے کے بعد بھی تگڑے جوان بنے پھرتے تھے۔ اور مریم تھی کہ تیس برس کی عمر میں ہی بالوں کی پٹیاں سفید ہونے چلی تھیں۔

کوٹ پتلون پہنے، جوتے کھٹ کھٹاتے جب گھر میں داخل ہوتے تو مریم کو لمحے بھر کو بھی احساس نہ ہوتا تھا کہ شادی کو بیس برس سے اوپر گذر گئے ہیں۔ چال میں ابھی تک جوانوں کی سی دھمک اور دبدبہ تھا۔

ان کی دفتر سے واپسی کا وقت اور مریم کی عصر کی نماز کا وقت ساتھ ہی ساتھ پڑتا۔ ادھر یہ جق اٹھا کر زنانے میں داخل ہوتے تو مریم کو لمحہ بھر کو یہ احساس ہوتا کہ میاں آ گئے۔ مگر پھر وہ بڑی لگن سے اپنے معبود کی عبادت میں لگ جاتی۔ ان کا کمرے میں داخل ہونا اور اس کا رکوع میں جھکنا ساتھ ہی ہوتا۔ بس اتنا ہی کام تو وہ مرضی کے خلاف کرتی۔ نماز کو میاں منع نہ کرتے مگر ایسے موقع پر کہ وہ تو آئیں اور یہ نماز میں جھکی رہے "ان کی جھلاہٹ دونی ہو جاتی۔ گھڑی کو آنکھ کے سامنے کرتے اور تین منٹ کے بعد دہاڑتے ہوئے آتے۔ آتے ہی پڑتال سی شروع کر دیتے "یہ کیوں رہی۔ کلی باجی کے ہاں سے آیا تھا جو ایسے ترتراتے پراٹھے بھجوائی ہے؟"

کھانوں کی تعریف تو عمر بھر سے بھولے بسرے بھی نہ کی۔ یوں ہی سنایا کرتے۔ مریم برف جیسے ٹھنڈے لہجے میں بولتی۔ "کمانے والے آپ — اللہ آپ کی جان

سلامت رکھے ۔ آپ کھائیں گے تو جئیں گے ۔"

"چل چل بڑی آئی کھلانے والی ۔ اگر اب کے اتنی جلدی گھی ختم ہو گیا تو یاد رکھ ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہ دوں گا ۔ سمجھی کہ نہیں ۔"

وہ بڑے پیار سے بولتی ۔ "میں اپنے کنگن توڑ کے گھی منگواؤں گی ۔ آپ کی جان سے بڑھ کر زیور تھوڑی ہوا ۔"؟

حنیف میاں نے کبھی تو تیرے سے ہٹ کر بات نہ کی ۔ پہلی دو بیبیوں سے بھی بات کا یہی انداز تھا مگر اس میں پیار جھلکتا تھا ۔ اور اس میں غصہ جھلکتا تھا ۔ مریم بھی اس انداز کی عادی ہو گئی ۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سیدھے سپاٹ لہجے میں پکارتے "مریم ادھر آنا ذرا ۔" وہ حیران سی کھڑی رہ جاتی ۔ اُسے کام بھول جاتا ۔ پیار تو کبھی اس لہجے سے نہ ٹپکتا ۔ مگر وہ سن سی رہ جاتی کہ خلاف توقع آج کیا بات ہوئی جو پہلا سا انداز نہیں ۔ وہ جھلاہٹ نہیں ۔ !

عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ زنانے میں کھلنے والے دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتی کہ اب میاں اندر آئیں گے ۔ آج بھی بیٹھی تھی کہ میاں آئے آج کھانے دانے کی بجائے دوسری ہی بات چھیڑ دی ۔

"بازو والا کمرہ خالی ہے نا ۔"؟

"ہاں ہے تو ۔" وہ نرمی سے بولی ۔

"اس کی صفائی کروا دینا ۔ وہ چڑی مار آ رہا ہے ۔"

"چڑی مار ؟" مریم حیرت سے بولی ۔

حنیف میاں ہنسے ۔ مریم کو یہ ہنسی اتنی عجیب و غریب لگی ۔ شادی کے بعد اس نے دو تین بار ہی انھیں ہنستے دیکھا ہو گا مگر وہ بھی اس سے مخاطب ہوتے

تب تو ہنستے کسی اور سے بات کرنے میں۔ آج بھی یہ ہنسی مریم کے لئے نہ تھی۔
بلکہ اپنے دوست کے لئے تھی۔

"ہاں ہاں یہ ہنس کر بولے یہ میرا لنگوٹیا دوست ہے، میں چار سال کا تھا
تو وہ آٹھ کا تھا۔ ساتھ ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ بچپن میں ہم سب چھیڑ سے اُسے
چڑی مار کہتے تھے۔ بس وہی نام پڑ گیا۔"

"بڑے میاں کس سلسلے میں آ رہے ہیں۔" مریم نے سر ڈھانپتے ہوئے
پوچھا۔

حنیف میاں پھر بدل گئے۔ "کیوں تیرے باپ کا کھائے گا۔؟ الٹے
سیدھے سوال کیوں کر رہی ہے تو۔؟"

"توبہ توبہ۔ میں کبھی آپ کے کہے سے باہر گئی؟ یوں ہی پوچھ ڈالا۔ معاف کر دیجئے۔"

"معاف کر دیجئے کی بچی۔ یاد رکھ بڈھے کو اگر کھانے پینے کی کچھ تکلیف
ہوئی تو تیرا بھیجا کھول دوں گا۔"

"میں اس میں بھی خوش ہوں۔ اللہ آپ کو میرے لئے سلامت رکھے۔" وہ
پیار سے بولی۔

چھ بجتے بجتے چڑی مار گھر آ گیا۔ مریم نے پردے کے پیچھے سے جھانکا نام تو برکت علی
تھا۔ مگر چہرے سے سچ مچ ہی چڑی مار لگتا تھا کہ اس بڑھاپے میں سرخ رنگ کی مخملی ٹوپی اوڑھ رکھی۔
پیلا پیلا سا قمیض، سفید شیروانی اور سفید ہی پاجامہ۔ چھوٹا سا قد۔ دُبلے دُبلے ہاتھ
پیر، سوکھا مارا چہرہ، داڑھی ایسی جیسے بچے ناریل کی نار وٹیاں نوچتے ہیں اور
ایک دو کی پھر بھی لگی رہ جاتی ہیں۔ بس ہو بہو نچا ہوا ناریل لگ رہا تھا۔
ٹانگے میں بستر اور ایک چھوٹا سا بکس، اس کے اترتے ہی حنیف میاں نے

زنانے میں جاکر کہہ دیا۔

"وہ آگیا ہے، شام کو دو سالن بڑھوا لینا۔ اور ہاں روٹی نرم پکانا۔ اس کی دو داڑھیں گر گئی ہیں۔ سخت روٹی چبائی نہیں جائے گی۔"

"جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔" مریم سر جھکا کر بولی۔

"صبح ہوتے ہی چڑی مار سب سے پہلے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی مریم صبح کے وظیفے سے فارغ بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنے کمرے میں پڑے پڑے زور سے ہا ہا کرکے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ اور پھر انگلیاں چٹخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ صاف مطلب تھا چائے چاہیئے۔ مریم کو غصہ تو بڑا آیا۔ مگر میاں کا دوست تھا۔ ابھی پوری تسبیح بھی نہ پھیری تھی کہ ادھر سے خود ہی میاں نے آواز لگائی۔

"مریم دو کپ چائے تو بھیجو۔"

آج میاں بھی چڑی مار کے ساتھ سویرے اٹھ بیٹھے ورنہ روز تو یہ ہوتا تھا کہ دھوپیں چڑھ گئی ہیں گھر کے سارے کام کاج ختم ہو گئے ہیں۔ ناشتہ تک تیار ہو گیا ہے مگر میاں ہیں کہ اینڈتے پڑے ہیں۔ مریم نے نیچی آواز سے کہا۔

"جی ابھی بھجواتی ہوں۔"

اگر بڈھے کی بات ہوتی تو کبھی وظیفہ چھوڑ کر نہ اٹھتی۔ مگر میاں نے خود ہی چائے کی فرمائش کر دی۔ مریم سے ناممکن تھا کہ وہ میاں کی بات ٹال دے۔

"چائے بنا کر طشت میں کپ سجائے اور ہاتھ بڑھا کر طشت دروازے کی چوکھٹ میں رکھ، ذرا اندر کو دھکیل دیا۔"

"میاں نے پھٹکار لگائی۔ "طشت اندر کو ٹھوڑ دیا۔ اور کبھی کپ گر گرا کر پھوٹ جاتے تو؟ تیرے باپ کا بھلا کیا جاتا۔ مجھے کیوں نہ پکار لیا۔؟"

مریم نے کوئی جواب نہ دیا۔ چائے سے فارغ ہو کر ناشتہ پکانے میں لگ گئی۔ ابھی پیالے میں انڈے توڑ ہی رہی تھی کہ میاں پھر وارد ہو گئے۔

"دیکھو خاگینے میں ساری پیاز ہی پیاز نہ بھر دینا بلکہ سادے انڈے ہی تل دے تو اچھا ہے۔ اور سُن پراٹھے ابھی سے مت ڈالنے بیٹھ جانا۔ جب ہم ناشتے کو بیٹھیں تو توا چڑھانا۔ گرم گرم اچھے رہیں گے ورنہ اس کے دانت......

مریم کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھائے مگر اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس لئے حنیف میاں دیکھ نہ پائے۔

چمڑی مار کھڑاویں پہنتا تھا۔ حنیف میاں گھر میں تو ربر کی چپل پہنتے، باہر نکلتے تو بوٹ چڑھا لیتے۔ گھر میں چلتے تو ربر کی چپل سے ہلکی ہلکی دپ دپ سُنائی دیتی۔ اور یہ آواز اتنی ہلکی اور مریم کے کانوں کو اتنی میٹھی لگتی کہ وہ مزے سے سُنتی رہتی۔ جدھر جدھر میاں کے قدم اٹھتے اُدھر اُدھر اس کے کان بھی ساتھ جاتے۔ چمڑی مار نے صبح اٹھتے ہی سارے گھر میں کھڑ کھڑ مچا دی۔ پہلے تو کھٹ کھٹ کرتا ہوا اٹھا اور غسل خانے کو چل دیا۔ وہاں سے آیا تو بیٹھک میں بیٹھ گیا۔ مریم کے کان جیسے پک گئے۔ گلی میں سے اخبار والا گزرا تو چلا کر بولا۔

"ابے لونڈے ادھر آئیو ذرا۔"

لونڈے نے اخبار پکڑایا اور اس نے اخبار کے پتّے کھڑ کھڑانے شروع کر دیئے۔ مریم کے کان میں سب آوازیں پڑ رہی تھیں۔ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا۔ اپنی رائے سنائی۔ حنیف میاں کی رائے لی۔ پھر پتّا کھڑکھڑایا اور بولا۔ "ارے میاں یہ صفحہ پڑھتے ہو کبھی؟ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں اس میں آتی ہیں۔"

"میں مطلب نہیں سمجھا۔ کیسے بڑے لوگ کیسی بڑی باتیں؟"

" اچھا یہ سنو، جیسے کسی بڑے آدمی نے کہا ہے۔ تحفے تحائف دینے لینے سے محبت بڑھتی ہے۔"

" اچھا اچھا۔ حنیف میاں شرارت سے مسکرائے۔ سمجھ گیا، مطلب یہ کہ تمھیں تحفہ چاہیئے نا کوئی۔ ؟ اچھا چلو ایک اچکن کا کپڑا دلائے دیتے ہیں۔"

" بہت تیری کی۔ یہ مطلب تھا بے میرا۔ ؟ ابے اُلو کی دُم میں بتا رہا تھا کہ اس صفحے کو تو بس پڑھنا ہی چاہیئے معلومات بڑھتی ہیں۔ بڑی اچھی اور دل کو لگتی ہوئی سچی باتیں اس میں لکھی ہوتی ہیں۔"

" تو کوئی اور بات بھی سناؤ نا۔"

" ابے تو نے کبھی اخبار کی صورت دیکھی ہے ؟ بس ایک کونے میں دیکھ ادھر یہ جو دو سطروں کی جگہ ہے نا۔ بس اتنے میں ایک بات روز آتی ہے۔ اس کا عنوان ہے۔ بڑے لوگ۔ بڑی باتیں۔"

مریم کو یہ سب باتیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کو خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا۔ میاں کو کھلانا تو اس کو آتا تھا اور بھاتا بھی تھا۔ جو کمائے وہ نہ کھائے تو بھلا کیا کرے۔ اور میاں کو کھلا کے خوشی بھی ملتی تھی۔ مگر یہ جیڑی مار جانے کہاں سے آ ٹپکا تھا۔ اور انداز بتاتے تھے کہ ابھی مدتوں یہیں پڑا رہے گا۔ اور باتیں دیکھو کیسی سنا رہا ہے۔ "تحفے تحائف دینے لینے سے محبت بڑھتی ہے۔"

" دے گا تو کیا ہاں خود ہتھیا ضرور لے گا۔" اس نے جل کر سوچا۔ " اور یہ میاں ایسے ہیں کہ کہا ہے تو ضرور ہی اچکن بنا دیں گے۔" میاں کی حلال کی، بہتے پسینے کی کمائی کوئی تیسرا کھائے یہ اُسے نہ بھایا۔

ناشتہ ختم ہوا۔ میاں نے ایسی گڑبڑ مچا دی تھی کہ پیرا کھٹے الٹنے میں اس کے

ہاتھوں میں جلتے گھی سے آبلے پڑ پڑ گئے۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی میاں تو دفتر چلے گئے۔ اور چڑچڑی مار اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اونچے اونچے گانے لگا۔

اجمیر والے خواجہ بگڑی مری بنا دے۔

بار بار ایک ہی بول دہرائے جا رہے تھے۔ مریم اوب گئی۔ دل چاہا جا کر کہہ ہی دے۔ "بس ختم بھی کرو۔ بن گئی بگڑی" مگر میاں کا خوف غالب آ گیا۔

شام کو میاں لوٹے تو یہ نماز پڑھتی کھڑی تھی۔ دو گھڑی چڑچڑی مار سے باتیں کرتے رہے۔ پھر تن تنا کر اندر آئے۔

"کیوں ری۔ دوپہر کو کھانا بھجوایا تھا بڈھے کو؟"

"آپ نے کہا تھوڑی تھا"

"اری نکمی تو نے نہ کھلایا ہو گا جو اُسے بھو کا مار رکھا ہے"

"آپ کہتے تو بھجواتی۔ اگر اپنے دل سے بھجوا دیتی تو بھی آپ چڑتے ضرور"

"خود بیٹھی ٹھُنستی رہی۔ بوڑھا آدمی اس کا دم کیا کہتا ہو گا۔ صبح ایسا کتنا کھایا تھا؟"

"ایسا کتنا کھایا تھا" چنگیر بھر پراٹھے ہوا ہو گئے اور کتنا کھاتا" مریم کے لبوں تک یہ جملہ آیا۔ مگر پی گئی"

"چل اٹھ ہلکا سا ناشتہ بنا دے۔ کوئی عمر بھر ساتھ رہنے کو آیا ہے جو سوتیلا پن دکھا رہی ہے؟"

مریم کو غصہ آتا تھا تو چپ رہ جاتی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ کڑوی بات کہہ کر میاں سے بگاڑ کرے۔ دھیرے سے اٹھ کر باورچی خانے کو چلی گئی۔

دوسرے دن ابھی اندھیرا چھٹا بھی نہ تھا، مرغ بانگ دے ہی رہے تھے کہ پہلے دن کی طرح چڑی مار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مریم نے میاں کی خفگی سے بچنے کے لئے آپ ہی چولھے کے پاس جاکر پھونکیں مارنی شروع کر دیں۔ پھونکوں کی آواز سن کر چڑی مار کی جمائیاں رک گئیں اور پڑے پڑے گنگنانے لگا۔

"کالی کملی والے تجھ پہ لاکھوں سلام"

میاں آتے آتے چڑی مار کے لئے پچھلی شام اچکن کا کپڑا لے آئے تھے۔ وہ تو مریم کو پتہ بھی نہ چلتا مگر چڑی مار نے کپڑا دیکھ کر طوفان مچا دیا۔

"میں نہ لوں گا۔ قسم ہے مولا کی میں نے اس لئے تھوڑی پڑھ کر سنایا تھا ہاتھ تو نہ لگاؤں گا۔"

"ابے تو کون کہتا ہے کہ تیرا جی مانگنے کو چاہتا تھا؟ میرا دل رکھ لے بھائی۔ پرانی یاری تھی تو تیرا بھی ہوتی ہی تھی۔"

مریم جان گئی کہ ضرور وہ بڑے لوگ، بڑی باتیں والی بات سچ ہو گئی ہے دانت پیس کر رہ گئی۔

چائے ختم ہو گئی تو کھڑاویں کھڑکھڑاتے ہوئے پورے گھر میں پھر ٹہلا۔ اخبار والا گزرا تو پھر کل کی واردات دہرائی گئی۔ پتا کھڑکھڑا کر بولا۔

"سنو میاں آج لکھا ہے۔ انسان پہاڑ کی بلندی سے گر کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ مگر نگاہوں سے گرے تو پھر کبھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔"

"بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی ہے۔" میاں بولے ——

مگر مریم کے دل کو بات اس لئے لگ گئی کہ اس میں دینے دلانے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔

دن گذر گئے مگر چڑی مار نہ گیا۔ اب تو لگتا تھا کہ وہ حنیف میاں کے گھر عمر گذارنے ہی آنکلا تھا۔ جانے کہاں سے آیا تھا کہ ایک دن اپنا بچا کھچا سامان بھی منگوالیا۔ حنیف میاں تو دفتر میں رہتے خود پڑا پڑا کمرے میں گاتا رہا۔

میں تو جاؤں گا ضرور۔

چڑی مار کو نہ پوری قوالی یاد تھی۔ نہ پوری نعت۔ کبھی ایک بول سے کوئی گیت آگے نہ بڑھتا۔ پھر پھر کے اسی کو دہرائے جاتا۔ مریم کو اس کے وجود سے اکتاہٹ تو ہوتی ہی تھی، اس کے گانے سے بھی ہوگئی۔ اگر پورے بول ہوتے تو بات بھی تھی۔ گلا بے سُرا ہو گیا ہے اور وہ ہے کہ ایک ہی رٹ لگائے ہے۔

اور ۔ میں تو جاؤں گا ضرور

" جا اور ایسے جا کہ پھر آنا نصیب نہ ہو تجھے " مریم نے کوسنا چاہا مگر وہ پھر رک گئی۔ اتنے دن گذر گئے تھے مگر دونوں میاں بی بی میں اس کے متعلق ایک بات نہ ہوئی تھی۔ آج اتنا ضرور سوچ لیا" اب شام کو میاں سے کچھ نہ کچھ کہوں گی تو ضرور "

حنیف میاں شام میں آتے آتے باریک کٹوایا ہوا قیمہ لے آئے اور آتے ہی بولے " اس کے دم کے کباب بنادینا " کباب بنانے کو کیا کم دیر لگتی ہے؟ کوٹا بیسی میں ہی گھنٹہ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ چولھے کے پاس بیٹھی تو بیٹھی ہی رہ گئی۔ میاں سے بات بھی نہ کر سکی۔ کبابوں کے ساتھ روٹی پراٹھے تو پکنے ہی تھے۔ گرم گرم پراٹھے، کباب اور سالن۔ دستر خوان لگا اور دونوں جٹ گئے۔ کھاتے کھاتے چڑی مار بولا۔

" ابے تیری ماما سالن تو خوب پکاتی ہے۔ کباب تو کیا ہی مزے کے بنے ہیں؟"

مریم کا دل چاہا کہ جاکر ایک چانٹا لگا دے۔ "دیکھنا کہ ہو گئی تیری ہونے والی سوتی۔ کھائے تو کھائے اوپر سے گالی بھی بکے۔"

میاں کہہ رہے تھے ——— "اماں؟ — دماغ تو ٹھیک ہے، جب بھی تیرا کھانا غیر لیسی بی بی پکاتی ہے۔"

"ہائیں ——— اور تو یہ سدا جھڑ جھڑ کر مجھے سنایا کرتا ہے" اس کی آواز میں حیرت تھی

"اپنی بی بی کو اور کس کو ؟"

چیر مسیر منہ چلانے کی آواز رک گئی اور چڑ چڑی بار زور سے بولا۔

"ابے کوئی اپنی بی بی سے ایسے تیز لہجے میں بات کرتا ہے ؟"

"تو نے شادی کی ہوتی تو پتہ چلتا سالے۔ چل چل کھانا کھا زیادہ باتیں نہ بنا۔"

تیز دھوپ کا اندازہ کسی سایہ دار درخت کی ٹھنڈک میں بیٹھ جانے سے ہوتا ہے۔ مریم نے میاں کی اتنی گھرکیاں سنی تھیں کہ پیار کی تمنا ہی کبھی نہ ہوئی۔ احساس ہی نہ ہوا کہ میٹھا بول بھی دنیا میں کوئی چیز ہے۔ چڑ چڑی مار کے دو بول جا کر جی کو لگ گئے۔ مگر دھوپ کا مارا جی ایسی دو گھڑی کی ٹھنڈک کو لے کر کیا خوش ہوتا کہ ابھی آگے تو وہی کڑی دھوپ پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جی جل کر رہ گیا۔ اور چڑ چڑی مار کو من ہی من میں دو چار گالیاں بھی دے ڈالیں۔

"موا رہنے کا بسے گا اور جل دے گا۔ دو ریہان لڑائیاں رگا جائے گا۔"

اگلے دن اخبار میں سے اس نے سنایا: "جب تک دنیا میں ڈاکئے موجود ہیں خوشی محسوس ہوتی رہے گی" نوٹ بھی تو لکھے گا حالانکہ اپنے نام تو کوئی خط ہی نہیں آتا کیا خوشی محسوس ہو گی یہ؟

مریم نے نپاتے پکاتے چڑ کر سوچا "کس قدر باتونی ہے موا۔ چپکا تو رہا ہی نہیں جاتا اس سے۔"

اس سے اگلے دن بڑی دیر تک اخبار کھڑکھڑاتا رہا۔ پھر گمبھیر سی آواز میں بولا۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں کہ خط عورت کی طرف سے ہو!!"

اس دن مریم میاں سے پوچھ ہی بیٹھی۔

"کیوں جی آپ کا یہ دوست پہلے کہاں رہتا تھا۔؟"

میاں بھلے سبھاؤ میں بتے بولے۔ "اپنے بھائی کے پاس رہتا تھا۔ وہاں جھگڑا ہو گیا یہاں چلا آیا۔"

"جھگڑا کس بات پر۔؟"

"یہ کم بخت کھڑاویں پہنتا ہے نا۔ اور اس کے بھائی کی بی بی سر کے درد کی مستقل مریضہ ہے وہ کھٹ کھٹ سے تنگ آگئی۔ مگر اس نے کھٹ کھٹ نہ چھوڑی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ یہ سالا بڑا مزاجی ہے بھلا کیا ٹلتا۔؟"

"تو شادی کر کے اپنا گھر بار کیوں نہ بسا لیا۔"

"اس اُلو کے پٹھے کو بھلا کون بیٹی دیتا۔؟ مگر خود جناب کا یہ کہنا ہے کہ آج تک کوئی لڑکی ہی انھیں پسند نہ آئی۔"

حنیف میاں ہنس کر بولے۔ "بچے ہوئے ناریل کی سی تو صورت ہے اور اس پر غرہ یہ۔"

"گھر بار ہے نہیں۔ بھاوج سے جھگڑا کر بیٹھا مطلب یہ کہ یہ گوڑنا ساری عمر ہی ساتھ ہے۔" مریم نے دل ہی دل میں سوچا۔

مریم کی طبیعت کچھ بگڑ گئی اور گھر کا سارا انتظام چوپٹ ہو گیا۔ اب صبح ہی صبح

پھونکوں کی آواز کے ساتھ کپ چھن چھناتے تھے۔ نہ گرم گرم پراٹھے ملتے تھے۔ محلے کی کوئی عورت صبح ہی پراٹھے تھوپ کر تھپّی لگا دیتی اور دستر خوان پر بچھے بچھے ایسے موٹے موٹے پراٹھے پڑے رہتے۔ مکھیاں ان پر بھنکتی رہتیں۔ صبح کا کھانا شام تک چل جاتا۔ دستر خوان پر بیٹھے بیٹھے چڑی مار بولتا۔

"بھابی بیمار پڑی اور کھانے کا مزہ چلا گیا۔"

مریم کو رضائی کی موٹی سی تہہ کے باوجود بھی سب کچھ سنائی دے جاتا۔ میاں بولتے۔

"ایسا کیا منو بھر اثر تھا۔۔۔" ؟؟

"ابے سالے تیرے کلیجے پر تو سور کے بال ہیں۔ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔"

"تیرے کلیجے میں عورت کا دل ہے۔ بس ہے نا" وہ چڑ کر بولتے۔

"بھول گیا! کل سنایا تھا تجھے۔ عورت کا دل پھول ہوتا ہے۔ جو ذرا سی تپش سے کمھلا جاتا ہے! اور تو تو سالے آگ لئے لئے پھرتا ہے۔"

"ابے بہت دیکھے ایسے پھول ہیں"

مریم کو رہ رہ کر غصہ آتا۔ چڑی مار کے بیچ میں منہ مارنے سے جو میاں اور بہکے بہکے کھاتے۔ اس دن تو مریم کو بڑا غصہ آیا۔ "جہاں میاں بی بی میں جھگڑے نہ ہوں وہاں محبت نہیں ہوتی۔"

"جانے کم بخت کون سا اخبار پڑھا کرتا ہے۔ اُلّو کی دم ہے۔ ہمارا گھر دیکھو نا اتنے جھگڑے ہیں اور محبت ؟"

مریم نے طے کر لیا کہ چڑی مار کا قصہ ہی پاک کرنا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ مریم کو یقین ہو گیا کہ اب چڑی مار اس گھر سے جلدی ہی منہ کالا کر جائے گا۔

کیونکہ اب حنیف میاں کی اداس کی آئے دن چک چک چلا کرتی اور وہ موضوع خود مریم ہوتی۔ میاں لتاڑتے اور چڑی مار اس نیک بی بی کو گھر کی برکت کہتا مریم بیحد خوش تھی کہ اب پنڈ چھوٹے گا۔ مگر میاں نے ایک دن سنایا۔

"مہینے بھر کا سامان اس چڑی مار کے ہاتھ سے منگوا لے۔ اور اب سے وہی لایا کرے گا۔ آدمی معقول ہے۔ میں تو ایک کی جگہ دو پیسے پھینک آتا ہوں"

مریم نے بے دلی سے روپے تھام لئے" "وہی لایا کرے گا" ظاہر ہے یہیں رہے گا۔ تبھی تو سامان لائے گا بھی۔ زور سے تیز ہو کر بولی۔

"کیوں جی یہ"

میاں نے پلٹ کر گھورا۔ ایسے لال لال دیدے کہ وہ جھٹ وہ بات بدل گئی "آج دودھ کیوں نہ پیا؟"

"جی نہ چاہا میرا۔" اور وہ پاؤں پٹختے چلے گئے مریم کا دل چاہا اپنی زبان ہی کاٹ پھینکے جو وقت پر ایک بات بھی نہیں کہہ سکتی۔

حنیف میاں دو دن کی چھٹی پر بیٹھے۔ بخار وخار کو کچھ نہ تھا۔ بس ایسے ہی سر میں ہلکا ہلکا درد اور اعضا شکنی۔۔ مریم نے آرام کو گناہ سمجھ لیا۔ بس پٹی سے لگی ہے کبھی سر دبائے تو کبھی پاؤں سہلائے کبھی سر میں تیل جھلائے تو وہ کے بخار دیکھے۔ بچپن سے اچھا کھلانے پلانے ہوئے تھے۔ حنیف میاں کا جسم بھی خوب ٹھنسا ٹھنسا تھا۔ اور پھر بیوی ایسی کہ برسوں سے کبھی سوکھی روٹی نہ کھلائی۔ ناشتے میں انڈے پراٹھے کے سوا کچھ نہ دیا۔ سوتے وقت دودھ دینا کبھی نہ بھولی۔ ہلکے ناشتے میں میوے کبھی نہ چھوٹے۔ اب تو بڑھاپا دروازے پر جھولتا تھا۔ مگر دیکھتے میں ابھی بھی ایسے ہی جوان دکھائی دیتے

بھتے بسار اکس بل کھلائی پلائی کا تھا۔ چکنی ملائی اور بہتا گھی غذا میں رہے تو کاٹھی اور کیسے رہے گی؟"

چھپر کھٹ کے آئینے میں مریم کا سر جھول رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں دبلے تنے بیں زور زور سے جھونکے کھا رہی تھی۔ ان کے بازوؤں کی توانائی کا اندازہ اپنے سہمے کیا وہ خود ان سے کتنی چھوٹی تھی اور چاندی کے تار جیسے جھم جھار ہے تھے۔ بالوں میں جب سفیدی آتی ہے تب تک تو عورت کے سارے ارمان پورے ہو جاتے ہیں۔ بال بچے، میا محبت۔ شوہر کی ناز برداری۔ اور بہت ہی برف کھلنے لگے تو پھر پوتے نواسے۔

مریم کے گالوں پر آنسوؤں کی لمبی لمبی لکیریں بن گئی تھیں۔ بند آنکھوں کے سانولے پپوٹوں میں سے آنسو لیوں ٹپک رہے تھے جیسے بند سیپ سے موتی جھانکیں پاؤں دباتے دباتے مریم سو گئی۔ میاں نے اٹھ کر دیکھا کہ تھکی ماندی۔ آنسو بہاتی مریم قدموں میں لوٹ رہی تھی۔

مریم کو دیکھتے تو رئیسہ بیگم، زبیدہ بیگم یاد آ جاتی تھیں اور نزدیک آتا ہوا پیار پھر دور بھاگ جاتا۔ صبح اٹھے تو وہی کل کل۔ مریم موزے دھونا بھول گئی تھی۔ چلا کر بولے۔

" اری او۔ موزے کیوں نہ دھوئے؟"

" بھول گئی جی۔ آج دھو دوں گی "

" اور جو مرے چوہے جیسی بو پھیل رہی ہے تو کیا کروں " مریم سہم کر بولی " چپل ڈال لیجئے نا پیروں میں "

" ہاں ہاں اونی سوٹ پر ربڑ کی چپل تیرے باپ نے بھی پہنی تو کبھی نہ پہنی "

چھڑی مار اچانک بھڑ بھڑاتا ہوا بولا۔

"ابے ذرا ملائم لہجے میں بات کیا کر۔ تیری جورو ہے کوئی نوکرانی تو نہیں ہے۔"

"تو چپ بیٹھ بے۔ کام نہ دھام ٹرٹر کئے جاتا ہے فضول۔"

"ابے تو مجھ سے چھوٹا ہے کوئی بات سمجھاؤں تو سمجھ جایا کر ہاں۔" اور وہ گنگنانے لگا۔ اجمیر والے خواجہ۔

تیسرے دن چھڑی مار سارا سودے لے آیا۔ ہاتھ بڑھا بڑھا کر سارا سامان زنانے میں رکھتا گیا۔

"بھابی تیل کا بھاؤ گر گیا ہے اس لئے میں یہ دو مہینے کا لیتا آیا۔ اور سنو ادرک سیر بھر ہے نا۔ دھنیا تین پاؤ کافی ہوگا نا۔ پیاز البتہ میں کم لایا ہوں۔ مگر مہینہ بھر چل تو جائے گی نا؟"

مریم نے اس رات ترتراتے گھی کی بریانی قورمہ پکایا اور چھڑی مار چٹخارے مار مار کر کھاتا رہا۔ نوالے پیچھے تعریف کرتا رہا۔

"بھابی نے تو باورچیوں کو مات دے دی۔ قسم ہے مولا کی کیا مزہ ہے بھابی کے ہاتھ میں۔"

اس دن حنیف میاں درزی کے یہاں سے نئی پتلون لائے تھے۔ داڑھی مونڈی۔ غسل کیا۔ ناشتہ کیا۔ اور کپڑے پہن اکڑتے ہوئے نکلے۔

"کیوں یار کیسا کپڑا ہے؟"

چھڑی مار ہنس کر بولا۔ "اچھا ہی ہوگا تبھی تو خریدا ہی۔"

"سالے جل ککڑے تعریف کرنے کا یہ کوئی انداز ہے۔"

ہنستے ہوئے آنگن میں سے سائیکل نکال کر نکلے ہی تھے کہ باورچی خانے سے مریم نے پانی پھینکا۔ سفید سفید پتلون پر چھینٹے پڑ گئے۔ اور حنیف میاں برس پڑے۔ ایک منہ اور لاکھ بولیاں گالیاں......

مریم سہم کر بس جی جی کرتی رہی۔

"کوئی جیسی ہوتی تو تگنی کا ناچ نچا دیتی۔ بیچاری میٹھی آواز سے جی جی کئے جاتی ہے۔ اور تو ہے کہ شیر ہوا جاتا ہے؟"

"ابے بس بس تو چپ رہ۔ کبھی پتلون پہنی ہوتی تو سمجھتا۔ تو تو الّو کا پٹھا ہے۔"

"اور کوئی کیا جانے پتلون سوٹ۔ تو ایک ہی تو رہ گیا ہے انگریز کی اولاد۔ تجھے تو کوئی بھٹیارن ملتی تو اچھا تھا۔"

"ابھی بھی بھٹیارن ہی تو ہے۔"

"ابے چمار صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ میں ہوتا تو پاؤں دھو دھو کر پانی پیتا۔"

"میں ہوتا — میں ہوتا — میں ہوتا" یہ آواز پھوار بن کر اتری اور مریم کا سارا وجود ٹھنڈے ٹھنڈے قطروں سے نہا سا گیا۔

رات کیسے گذری مریم کو معلوم نہ تھا۔ صبح اٹھی تو چڑیاں مار اپنے کمرے میں جما بیٹھا تھا۔ اور انگلیاں چٹخانے کی آواز کانوں کے پاس ہی آرہی تھی۔ مریم نے جلدی جلدی نماز ادا کی اور چولھے کے پاس جا بیٹھی۔ وقت آج کچھ زیادہ ہو گیا تھا کیونکہ باہر اجالا پھیل رہا تھا اور گلی میں اخبار والا چلا رہا تھا۔

مریم نے جلدی جلدی چائے بنائی اور طشت میں رکھ کر چلنے لگی۔ اخبار کی کھڑکھڑ کے ساتھ آواز سنائی دی۔

"دراصل عورت کو محبت کرنے کا ڈھنگ اس وقت آتا ہے جب اس کی عمر تیس سے اوپر ہو جاتی ہے اور بالوں میں سفیدی چھانے لگتی ہے۔"

یہ آواز سیدھی مریم کے دل تک اتر گئی۔ سامنے ہی دیوار میں آئینہ لگا تھا مریم کو اپنا سر چھوٹا سا دکھائی دیا جس میں سفید بال لہرا رہے تھے۔

"سب بکواس ہے۔" حنیف میاں چڑ کر بولے۔ "احمقانہ باتیں ہیں ساری۔"

"ارے بیٹا۔ عورت کے دل کی بات تم کیا جانو۔ میں جانتا ہوں سچ جو پوچھو۔"

چھن چھن مریم کے ہاتھ سے طشت چھوٹ گیا اور پیالیاں کرچی کرچی ہو گئیں

حنیف میاں اچھل کر اندر آئے۔

"اتنا قیمتی سٹ تھا برباد کر دیا۔ باپ کا مال ہے دیکھ کر کام نہیں کرتی؟"

آج مریم ڈری نہیں سہمی نہیں۔ پوری طاقت سے چلّا کر بولی "میں نے آپ کا سٹ برباد کیا ہے اور آپ نے میری زندگی جو برباد کی ہے" وہ سسک رہی تھی۔

حنیف میاں کی زبان گنگ سی ہو گئی۔ ایک دم مریم ان کے پیروں پر جھک گئی۔ مجھے تو آپ سے محبت ہے جی۔ میں تو ۔۔۔۔ ایک دم تیزی سے بولی۔

"اس گھر میں یا تو میں رہوں گی یا وہ چڑی مار رہے گا۔" اچانک وہ چلائی!

"میں سچ کہتی ہوں مجھے اس سے ذرا بھی محبت نہیں۔"

حنیف میاں کی آنکھوں کے سامنے مریم کا سر کانپ رہا تھا جس میں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے ـــــ

زہر

عائشہ اپنا دبلا پتلا ہاتھ سامنے کر کے بولی۔ "مجھے یہ دھانی چوڑیاں پہنا دو خالہ ۔"

چوڑی والی نے اس کا ہاتھ تھاما اور جیسے سُن ہی رہ گئی ۔ ہاتھ تپ رہا تھا اور اس قدر سوکھا مارا ہو گیا تھا کہ پہلے جو چوڑی کلائی میں پھنس کر رہ جاتی اب وہ وہی چوڑی پہناتی تو یقیناً کہنیوں تک کھن کھناتی چلی جاتی ۔

ابھی خالہ کچھ پوچھنے کو تھی کہ اندر سے ساس کی تیز اور جھنجھلاتی آواز پہنچی ۔

"اے میں کہوں سنگار پٹار ختم ہوا کہ نہیں ۔؟"

جو سوال ابھی خالہ کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا، ساس کی کرخت آواز میں جواب بن کر اسے مل گیا۔ اس نے ایک بار پھر عائشہ کو دیکھا ۔ ہو نہ ہو یہ بات ہے! وہی تو میں کہوں کہ یوں بہو کو دبلاپے اور زردی نے آن گھیرا تو کیسے ۔؟"

عائشہ کا معصوم اور دکھیارا چہرہ زبان حال سے اپنی مظلومیت کا اعلان کر رہا تھا ۔

خالہ نے جلدی جلدی ہری ہری ہری چوڑیاں چُنیں اور سہمے سہمے عائشہ کے ہاتھوں میں چڑھانے لگی ۔

ابھی چوڑیاں پوری چڑھی بھی نہ تھیں کہ ساس کسی کام سے باہر نکلی

دیلیزمیں دونوں کو بیٹھا دیکھ کر وہیں چلی آئی۔ ایک منٹ تیز تیز نگاہوں سے جیسے کچھ ٹٹولا اور پھر گرج کر بولی "یہ اتنی مہنگی بانکی پہننے کی کون ضرورت تھی رانی ہے
عائشہ سے پہلے خالہ بول اٹھی۔ "جان جوان جی ہے پہنا۔ کیا ہوا اگر پہن بھی لیں تو۔" پھر ذرا دبی زبان سے بولی۔ "اللہ اس کے کمانے والے کو سلامت رکھے۔ آخران چوڑیوں کی کیا حقیقت ہے۔"

ساس بھی زمانہ دیکھے تھی یہ طعنہ آگ بن کر اسے جلا گیا۔ "ہاں ہاں، ایسی ہی بڑی کمائی ہے، جو گھر چلا کر بتادے یہ رانی تو جانوں۔"

عائشہ کچھ نہ بولی اس کا رنگ ایک دم نیلا پڑ گیا تھا۔ چوڑیاں پہن کر جب وہ جانے کو اٹھی اور جاتے جاتے خالہ کو سلام کیا تو ایک دم خالہ بھانپ گئی کہ اس کے پچھلے چار مہینوں کی غیر حاضری میں بہو نے اپنے قدموں تلے جنت تعمیر کرنے کی ٹھان لی ہے۔ وہ شرارت سے بولی۔ "سلیم میاں آئے تھے کیا؟"
عائشہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پر اس کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ دیکھ کر خود بھی شرما گئی۔

خالہ نے بڑے دکھ سے سوچا "بیچاری پہلن۔ اس پر ماں باپ سے دوری ساس کے یہ کچوکے۔ اللہ تو ہی خیر و خوبی سے اس کی گود بھرنے والا ہے رحم کیجیو رحم۔"

چوڑی والی کے جاتے ہی ساس نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر دہائیاں دینی شروع کر دیں

"ہاں جو کمایا ہوا اس کو ڈبو۔ مفتا مفت کھانے والوں کا کیا ہے۔ بدصرتی چاہا پیسہ اٹھا کر پھینک دیا۔ ابھی پانچ مہینے تو ہوئے ہیں بھیجو

شہر سے بانکیں لایا تھا۔ مگر یہاں تو بس فضول خرچی کی عادت سی پڑ گئی ہے"۔
ساس گھنٹہ بھر بک بک کرتی رہی۔ عائشہ چپکے چپکے سنتی رہی۔ پھر اٹھ کر باورچی خانے میں جا کر روٹیاں بیلنے میں مصروف ہو گئی۔

اب کے سلیم شہر سے لوٹا تو عائشہ کی حالت آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ماں کے سامنے تو کیا بولتا۔ جب کمرے میں گیا تو دھیرے سے عائشہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھایا اور بولا "کیوں رانی یہ چہرہ زرد چاند کیوں بنا ہوا ہے ...؟

عائشہ کا دل سینے سے اٹھ کر اس کی آنکھوں میں دھڑکنے لگا۔ ایک اماں بھی رانی کہتی تھیں ایک سلیم بھی کہتا ہے۔ دونوں کے کہنے میں کتنا فرق ہے۔!
اس کا دل بھر آیا۔

"کچھ بھی تو نہیں —" وہ صاف جھوٹ بول گئی

اچھا عاشی مجھ سے جھوٹ نہ کہنا۔ سچ سچ بتا دے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ خیال میں نرگسی نے نہ خود تیرے نے کوئی بات تھی مگر... وہ دکھ سے چپ ہو گیا۔

عاشی بھی چپ رہ گئی۔ بس دونوں کی سانسوں کی آواز تھی دلوں کے دھڑکنے کی صدا تھی جو اس وقت ایک ہو کر رہ گئی تھی یہ سانسیں یہ دھڑکنیں جو الگ ہو کر بھی ایک ہوتی ہیں جو دبے دبے سُر کے اپنے محبوب سے کہتی ہیں۔ ہم ایک ہیں ہم ایک ہیں —

عائشہ الماری تک جاتے ہوئے بولی۔ دیکھنا سلیم نے جو پیسے بھجوائے تھے نا میں نے کتنی پیاری ساڑی لی ہے۔ وہ ساڑی لے کر آ رہی تھی...

ایک قدم ...... دوسرا قدم .... تیسرا قدم۔ سلیم نے اسے دیکھا پھر دیکھا۔ غور سے دیکھا اور جیسے چیخ کر بولا۔

"عاشی ــ تم ــ تم مجھے باپ بنا رہی ہو نا ۔ ؟"

سرخ پھولوں والی ساڑھی عاشی کے ہاتھوں میں تھی ۔ اس نے شرما کر ساڑی چہرے پر ڈال لی سلیم بے تابی سے اٹھا اور اس کے قریب آکر پیار سے گرمجوشی سے اسے جھنجوڑ کر بولا ۔

"مجھے بتایا تک نہیں ۔ جھوٹوں لکھا تک نہیں ۔ کیوں ری ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے دھیرے دھیرے اس کا چہرہ اٹھایا اور اس کے قریب آتا گیا ۔ عائشہ بجلی کی سی تیزی سے الگ ہو گئی ۔

"چھی ــ بے شرم ۔"

سلیم نے آگے بڑھ کر پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اور پکڑے ہی رہ گیا ۔

"تمہاری ہتھیلی ۔ ۔ ۔ ۔"

پھر دوسرا ہاتھ بھی تھام کر اس کی ہتھیلیاں چومتا ہوا بولا ۔

"ارے تمہیں تو بخار ہے عاشی ڈیر ۔"

"عاشی پیار سے ہاتھ چھڑا کر بولی

" محبت کرنے والے کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں ۔ اچھی خاصی ہوں مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا ۔ ؟"

یہ آج کل کی بات تو تھی نہیں جب سے عائشہ اور سلیم کی شادی ہوئی تھی ۔ عائشہ اپنی ساس کے عیب ڈھانکتی آرہی تھی ۔ پڑھی لکھی لڑکی تھی برا بھلا سب سمجھتی تھی ۔ یہ بھی معلوم تھا کہ مرد نوکری کے سلسلے میں دور ہی رہتا ہے ۔ ساس سے نہ نبھائے گی تو دنیا کیا کہے گی ۔ مگر ساس بھی نبھائیں تب نا ۔ ؟ ان کو تو آجا کے یہ دکھ تھا کہ بیٹے نے اپنی پسند سے شادی کی ہے ان کے ارمانوں کا ذرا بھی خیال نہ کیا ۔

پہلے جو دکھ تھا اب غصہ سے بدل گیا تھا۔ سلیم تو نوکری کے سلسلے میں بمبئی رہتا ہے۔ کم بختوں نے تبادلہ بھی عین شادی کے دو ہفتوں بعد کر دیا، کرتا تو کیا کرتا۔ بمبئی میں ڈھونڈنے سے شاید خدا بھی مل جائے مگر مکان نہیں ملتا۔ ملتا بھی ہے تو ان کو جن کو ہزاروں سے آمدنی ہوتی ہے۔ یہاں تو لے دے کے وہی ساڑھے چار سو تھے ملازمت نئی نئی تھی۔ مکان ملنے کا ابھی کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔ دلہن حیدرآباد میں، دولہا بمبئی میں۔

کیسا کیسا جی چاہتا اس نوکری پر لات مار دے اور اپنے پہلو میں اپنی چاند سی دلہن کو لئے بیٹھا رہے۔ مگر یہ تو شاعری تھی۔ زندگی تو شاعری نہیں پیسہ مانگتی ہے۔ پیسہ۔ ورنہ ساری محنت اور عشق دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اماں بیگم کے غصے کو راہ مل گئی۔ طعنے اور جھڑپ ان کے دل کو تو سکون جب ملتا کہ جہاں سے یہ بلا آئی تھی وہیں پہنچ آتیں۔ اور اب وہ ان کے بیٹے کی اولاد کی ماں بھی بن رہی تھی۔

سلیم کے دل کا چین لٹ گیا۔

دوسرے ہی دن وہ عاشی کو لیکر زنانہ اسپتال گیا۔ بیٹھتے ہیں اس نے ذرا تلخی سے پوچھا "کتنے مہینے ہو گئے تمہیں؟"

"میں کیا جانوں۔" عاشی شرما کر بولی

"کبھی تم چیک اپ کے لئے نہیں گئیں۔؟"

"اوہوں۔" وہ سر ہلا کر شرما گئی۔

سلیم کو غصہ بھی آرہا تھا، پیار اس سے سوا تھا۔ یہ خوبصورت بلا۔" جیسے کسی بات کی سمجھ ہی نہ تھی۔ سارا غصہ اس کی طرف اک نظر دیکھ لینے سے

پیار بن کر رہ جاتا وہ جھلا کر بولا "اب دیکھوں گا تم کیسے بچتی ہو - حد ہے؟"
لیڈی ڈاکٹر نے عائشہ کے سامنے تو نہیں مگر سلیم سے اکیلے میں کہا "آپ کی وائف کو تو انیمیا ہو رہا ہے۔ خون کی سخت کمی ہے یہی حالت رہی تو ....." وہ رکی اور پھر جملہ پورا کر گئی۔ آگے خطرہ ہی بنا کا ہے۔"

سلیم نے پھر اور کچھ نہ سنا۔ وہ دنیا میں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور چلا گیا۔ اگر ایسا ہو گیا تو۔ اگر ایسا ہوا تو .....؟؟ عاشی صرف اس کی دلہن نہ تھی وہ اس کی زندگی کی سب سے اہم ضرورت تھی۔ شاید پانی کی طرح جو بظاہر بڑا غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔ مگر چند ایک دن نہ ملے تو جان پر بن جاتی ہے۔

نوکری کا معاملہ تھا سلیم کو جانا ہی پڑا۔ مگر وہ گیا کب تھا وہ تو یہیں تھا۔ اگر وہ چلا گیا تھا تو یہ عاشی کے سینے میں دل بن کر دھڑکتا تھا۔ عاشی کی آنکھوں میں آنسو بن کر کون مچلتا تھا۔ عاشی کے پھیکے اور بے رس ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کون بکھر جاتا تھا۔؟؟ محبت میں ایک وقت وہ بھی تو آتا ہے جب دوری ہی قربت بن جاتی ہے۔

روز کے خط ایکسپریس اور تار، سلیم کا دل اپنی سروس سے اُچاٹ، اُچاٹ سا تھا۔ ادھر عائشہ بھی ہر لمحہ زندگی سے دور ہو رہی تھی۔ اماں نے زندگی دوبھر کر دی تھی۔ عورت ہی دنیا کو جہنم بناتی ہے۔ قدرت نے اس کی فطرت میں آگ بھی رکھی ہے اور شبنم بھی۔ اب یہ اس کا اپنا ظرف ہے کہ آگ دے یا شبنم۔ اماں تو آگ ہی آگ تھیں۔!!

تار نہ خط، کوئی اطلاع نہ خبر، ایک دن بارہ بجے کی ٹرین سے اچانک سلیم آپہنچا۔ اماں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔ ارے بیٹے تم یہاں کیسے۔؟"

"جی - مجھے خواب دکھائی دیا کہ عاشی کی طبیعت بس جی نہ مانا - کیسی ہے وہ - ؟"

عاشی کی طبیعت سچ مچ بڑی خراب تھی - نواں ماہ پورا ہونے میں چار چھ دن رہ گئے تھے اور اس کی ساری طاقت ختم ہوتی نظر آ رہی تھی - سلیم منہ سے کچھ نہ بول سکا - بس آنکھوں میں آئے آنسوؤں نے اس کے دل کا سارا حال، عاشی پر کھول کر رکھ دیا۔

سلیم اور عاشی جب ڈاکٹر کے یہاں سے لوٹے اس کا برا حال تھا - ڈاکٹر نے عاشی کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو ماں سے الگ رکھنا پڑے گا. ماں کی صحت اس لائق نہیں کہ بچہ اس کے دودھ پہ پل سکے - ڈاکٹر نے اکیلے میں دبی زبان سے کہہ دیا تھا کہ ٹی بی کا پھیلاؤ جسم میں ہے -

اسپتال کے پچھواڑے جہاں سلیم بت بنا کھڑا تھا چیخوں کی آوازیں ابھریں - اور وہ عاشی کے کمرے کی طرف لپکا - ممتا کا نور ایک مقدس اجالا بن کر عاشی کے چہرے کو بھیجا گئے ہوئے تھا - "وہ ماں بن گئی ہے -" سلیم اپنے آپ میں بڑبڑایا - "مگر - کتنی دکھ دینے والی بات ہے پھول ڈالی سے الگ کر دیا جائے گا - ؟"

عاشی اپنے دکھ کا مداوا اپنے ہونے والے بچے کو سمجھا کرتی تھی - مگر اس کی بدنصیبی سے جو پھول ابھی اچھی طرح کھلا بھی نہ تھا۔ اس کی گود سے الگ کر دیا گیا۔ بے بسی سے لیٹے لیٹے وہ سامنے ہی پالنے میں پڑے ننھے کو دیکھے جاتی - جو قریب ہو کر بھی اس سے اتنا دور تھا - شادی کو ڈھائی سال گذر گئے تھے اور شروع گھڑی سے ہی اس پر دکھوں کے ایسے پہاڑ ٹوٹے تھے کہ زندگی مسکرانا بھول گئی تھی - ایسے گھور اندھیاروں میں ایک چمکتی کرن اس کا سہارا تھی

اور جب وہ کرن اس کے قریب آئی تو اس کا دل گھٹنے لگا۔ دل میں رہ رہ کر بے کلی سی ہونے لگی۔ بچہ اوپر کے دودھ پر پل رہا تھا اور اس کے اپنے سینے سے ممتا کی جو دھاریں پھوٹتی تھیں وہ یہاں ہی بیکار تھیں ۔۔ اف میرے خدا ۔۔!

ڈاکٹر معائنہ کو آیا تو پھر سلیم سے کہہ گیا "مریضہ کو دق ہے۔ بچے کو بالکل الگ رکھا جائے ۔۔! عائشہ کے کان، ان دنوں خیال تک بھی سن لیا کرتے تھے۔ یہ بات کہاں اس سے چھپی رہ سکتی تھی۔ !

سلیم نے نوکری کا خیال ہی چھوڑ دیا۔۔ جب ایسی چاند ایسی دلہن کی جان پر بنی ہو تو کیا نوکری اور کیا پیسہ۔ بھاڑ میں جائے ایسی نوکری ۔۔!

دوسرے کمرے میں اماں سو رہی تھیں مردانے میں سلیم۔

ایک دم بچہ پالنے میں رونے لگا، ممتا کی ماری بے کل ماں جس کا رواں رواں اپنے بچے کے لئے ترستا تھا تڑپ اٹھی، ایک خیال روکتا تھا۔ دوسرا خیال کچھ کر گذرنے پر آمادہ کرتا۔ ڈاکٹروں نے زندگی سے تو جواب دے ہی دیا تھا۔ ایک دفعہ اپنے بچے کو سینے سے لگا ہی کیوں نہ لے کر ماں بننے کی وہ ادھوری خوشی تو امر ہو جائے

عائشہ نے ایک بار جو بچے کو سینے سے لگایا تو پھر الگ نہ کر سکی

اب روزانہ یوں ہونے لگا کہ عائشہ رات کے انتظار میں رہنے لگی کہ رات چڑھے اور سب سوئیں اور وہ منے کو دودھ پلا سکے، وہ امرت جو ماں کے سینے میں زہر بن کر پل رہا تھا ۔۔!!

ڈیڑھ ماہ گذر گیا

ڈاکٹر معائنہ کے لئے آیا تو خوشی خوشی بولا، "مسٹر سلیم اب آپ کی بیگم پہلے سے کہیں اچھی ہیں ۔۔" پھر پالنے کی طرف جا کر بولا "اور بچہ بھی پہلے سے کہیں تندرست ہے

گاڈبلس ۔ اب کوئی فکر کی بات نہیں ۔"

اماں خوشی خوشی بولیں "ہاں ہاں میں منے کو حکیم صاحب کے پاس جو لے گئی تھی ۔"

منا اسی لمحہ زور زور سے چیخنے لگا ۔ ڈاکٹر بولا ۔ اب اسے آپ تھوڑی سی دیر کے لئے ماں کے پاس بھی دے سکتے ہیں مسٹر سلیم ۔"

منا ماں کی گود میں آکر مچلنے لگا ۔ اور ماں نے ......

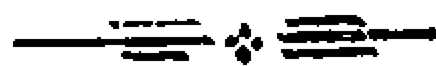
ایک دم ڈاکٹر چلایا ۔" مسز سلیم کیا کرتی ہیں آپ ۔ آپ کا دودھ تو پوائزن ہے ۔ زہر ہے بچے کے لئے ۔!"

عائشہ جو ایک ماں پہلے تھی دشمن بعد میں ۔ مسکرادی

"جی ڈیڑھ ماہ سے یہی زہر میں اسے پلا رہی ہوں ۔ اسی زہر نے مجھے جلایا اور اسے بھی ۔"

سب ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے ۔ ڈاکٹر نے ندامت سے سر جھکا لیا ۔

اوہ ! مسز سلیم ۔ معاف کیجئے گا ۔ میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں ۔ ماں نہیں ۔ ماں کی مامتا کے زور کے آگے ڈاکٹری بھی ہیچ ہو جاتی ہے ۔ یہ میں نے آج جانا آئی ایم سوری ۔!!"



جیسے دریا

واجدہ تبسم

اوورسیز بک سنٹر

پلاٹ نمبر ۴۵ ۱- نارتھ لنکن روڈ-جوہو

ولے پارلے اسکیم

بمبئی نمبر ۵۶